جولائی '۶۲

جولائی ۱۹۶۲

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

چند اچھی کتابیں

جگ بیتی:- باوجود اس کے کہ اُردو لٹریچر نے اپنی مختصر سی عمر میں کافی ترقی کر لی ہے۔ پھر بھی ابھی بہت سے موضوع ایسے ہیں، جن پر کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک دنیا کی تاریخ بھی ہے۔ مکتبہ جامعہ نے پنڈت جواہر لال کی مشہور کتاب (Glimpses of World History) کا ترجمہ شائع کر کے اس کمی کو بہت حد تک پورا کر دیا ہے۔

فی الحال محض پہلی جلد شائع ہوئی ہے، جس میں ایشیا، اور یورپ، قدیم ہندوستان کی دیہی جمہوریتیں، چین کی تاریخ کے ہزار برس، ایران، یونان، رُوم۔ گپتا دور میں ہندو سامراج اسلام کا ظہور قرطبہ و غرناطہ، صلیبی جنگ، رومی کلیسا کی جارحانہ سرگرمیاں، دورِ وسطیٰ کا خاتمہ وغیرہ عنوانات پر بسط و تفصیل سے تاریخی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ متعدد نقشوں نے کتاب کی افادی حیثیت کو بہت بڑھا دیا ہے حجم ۵۵۲ صفحات قیمت مجلّد مع گرد پوش تین روپے (سے)

زہرا و آسیب الفت:- سجاد حیدر یلدرم دنیائے ادب میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ موصوف نے ترکی زبان سے متعدد افسانوں اور ناولوں کے ترجمے کئے ہیں جنھیں ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ مکتبہ نے ابھی حال میں انھیں بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ قیمت ہر ایک کی بارہ آنے (۱۲ر)

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

جامعہ

زیرادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۷-۳- نمبر ۱ | بابتہ ماہ جولائی ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

اردو اکادمی

"جامعہ ملیہ دہلی کی "اردو اکادمی" نے علمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عام ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور علاوہ علمی کتابوں کے عام دلچسپی کی کتابیں اور بچوں کے کام کی کتابیں اچھی تعداد میں سلیقے سے شایع کی ہیں اور اس طرح اردو کے ادبی خزانے میں مفید اضافہ کیا ہے"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت "آل انڈیا اورینٹل کانفرنس" شعبۂ اردو ۱۹۴۱ء)

آپ بھی اس اکادمی کے ممبر ہو کر اس کی مطبوعات سے فایدہ اٹھائیے۔ قواعد و ضوابط کارڈ لکھ کر طلب کیجیے۔

ہمارے یہاں سے ہندوستان کے دیگر اداروں کی کتابیں بھی اپنی اصلی قیمت پر ملتی ہیں۔

سیاسی نظریے

خطۂ یونان

فلسفۂ سیاست کی ابتدا | فلسفۂ سیاست کا گہوارہ دراصل خطۂ یونان ہے جہاں اس نے پانچ صدی قبل مسیح ابتدائی مدارج طے کرنا شروع کیے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اس سے قبل سیاست تھی ہی نہیں یا سوائے یونان کے کسی اور جگہ اس کا دور دورہ ہی نہ تھا۔ غالب خیال یہ ہے (حالانکہ اس کا کوئی ثبوت ابھی تک ہمیں دستیاب نہیں ہوا ہے) کہ مصر، بابل، ایشیائی کوچک اور کریٹ وغیرہ میں بھی اس قسم کے تفکرات کہ بادشاہ کے حقوق اور رعایا کے فرائض کیا ہیں ضرور معرض بحث میں آچکے ہوں گے ہندوستان اور چین میں تو ایسے معاملات یقیناً پیش ہوئے اور ایسی سیاسی نکتہ آرائیاں ہوتی رہیں جن کے نتائج ہم کو مشرق کے بے شمار مقدس صحائف اور متفرق کاغذات میں جابجا منتشر ملتے ہیں لیکن وہ قصے کہانیوں کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ فلسفۂ سیاست بذات خود سب سے الگ تھلگ نہ کوئی مستقل حیثیت رکھتا تھا نہ مرتب و منظم تھا۔ صرف کہانیوں کی صورت میں نصائح اور تدابیر پیش کردی جاتی تھیں فرعون مصر خدا سمجھا جاتا تھا۔ بابل کا بادشاہ خدا کی نسل سے مانا جاتا تھا عبرانیوں کے بادشاہ بھی خدا کے خلیفہ سمجھے جاتے تھے جن کو حکومت واقتدار عرش سے تفویض ہوتا تھا اور جس میں وہ پادریوں کو بھی شریک کار بنا لیتے تھے بالفاظ دیگر حکومت اور مذہب ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی عمرانیات اور سماجیات پر دینیات ہی کا اثر تھا۔

یونانی قوم پہلی قوم ہے جس نے خود کو فضول اعتقادات و مذہبی خرافات کی زنجیروں سے رہا کیا علم کو لایعنی قیاسات سے نجات دلائی اور واقعات عالم کا حقیقت کی روشنی میں مطالعہ کرنا شروع کیا اس کا یہ ماحصل نہیں کہ انھوں نے اپنے دیوتاؤں پر ایمان رکھنا چھوڑ دیا۔ ان کے معابد اور دیوتا تو بے شمار

افلاطون کا واحد اور مستقل ارادہ یہ تھا کہ سقراط کے اصول تفکر کو قلمبند کر لیا جائے اور ان کی ترویج و اشاعت کی کوشش کی جائے۔ سقراط کے اصولی خیالات یہ تھے (۱) نیکی اور علم ہم معنی چیزیں ہیں (۲) انسانی وجود کا بہترین مصرف نیکی ہے (۳) عقل تمام انسانی عطایا میں بہترین عطیہ ہے اور اس لیے اسی کو ہمیشہ چراغ ہدایت بنانا چاہیے اور یہی عام اصول افلاطون نے سیاست میں برتے۔ اس کی تین مشہور کتابیں "ریاست" "مدبر" اور "نوامیس" انھیں خیالات کی علمبردار ہیں۔

ان تینوں کتابوں میں ریاست سب سے زیادہ مشہور اور اہم کتاب ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دنیا کی بہترین ادبیات میں سے ہے۔ اس کتاب کے لکھے جانے کے اصل میں دو مقصد تھے ایک سوفسطائیوں کے سیاسی خیالات کی تردید کرنا اور دوسرے یونان کی موجودہ گورنمنٹ کی تنقید و تعریض کرنا۔ اس میں افلاطون بتلاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کی خرابیاں محض مدنی خوبیوں کی کمی کے باعث سے پیدا ہوئی ہیں اور ان مدنی خوبیوں کا نہ ہونا بوجہ جہالت کے ہے اور جہالت اور خرابیاں دونوں سوفسطائیوں کی پیدا کی ہوئی ہیں پھر سوفسطائیوں کی تاریخ بیان کی جاتی ہے کہ اصل ابتدا ایک شخص تھریسی میکس نامی سے ہوئی جو بہت ہی مغرور، کمینہ طبیعت اور جاہل شخص تھا اور پھر کس طرح سقراط نے اس کی زبان بالکل بند کر دی وہ بھی اس بری طرح کہ وہ مرنے مارنے پر اتر آیا۔ اور پھر کس طرح سقراط نے لوگوں کو سمجھایا کہ قوم کی بقا فرد واحد کی بقا سے بڑھ کر اور اس کی اہمیت اس سے اہم تر ہے۔ جب قوم کی حالت اچھی ہو اسی وقت فرد ایک عمدہ اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس لیے فرد کا اصلی اور اولین فرض یہ ہے کہ قوم کا ایک مفید اور نیک رکن بنے۔ مکمل آدمی وہ ہے جو پہلے اپنی صحیح اور جائز جگہ سوسائٹی ملک یا شہر میں بنا لیتا ہے یعنی بعض شہری خدمات کے انجام دینے میں مدد دیتا ہے اور پبلک کے فوائد کو اپنے ذاتی آرام اور ذاتی فائدوں پر ترجیح دیتا ہے۔ "ریاست" میں عدل اور تنظیم و ترتیب کی تعریفات ہیں۔ اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا گیا ہے کہ فرایض کا نہایت تناسب اور خوبصورتی کے ساتھ انجام پایا جانا ہی نہایت نظم کی نشانی اور علامت ہے۔ بہترین منظم ملک وہ ہے جس میں یہ تین طبقے ہوں

یعنی (۱) نگراں یا مشیر کار (۲) سپاہی یا محافظ (۳) صناع یعنی پیشہ ور ہنر مند لوگ۔ ہر صحیح فرد اپنی جگہ ان تین طبقوں میں سے کسی ایک میں جگہ حاصل کرتا ہے اور سب تینوں طبقے مل کر ملک یا قوم کی بھلائی اور بہبودی میں کوشاں رہتے ہیں۔ مشیر کو نیز محافظین کو ملک کی طرف سے ان کی ذاتی ضروریات کی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں تاکہ وہ ان باتوں سے بے فکر رہ کر اپنا تمام وقت ملک کی بھلائی اور برتری کے لیے وقف کر دیں اور کسی قسم کی ذاتی پریشانی انھیں لاحق نہ ہو۔ شادی بیاہ تینوں طبقے آپس میں ایک دوسرے سے کر سکتے ہیں (یا جس طرح مشیر حکم دے)

چونکہ اس قسم کے ملک کا دار و مدار زیادہ تر ہے اور کی علم کے ماتحت ہے اس لیے تعلیم ایسے ملک کا جزو اعظم ہے اور کوئی فرد و بشر ایسا باقی نہ رہنا چاہیے کہ جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ ہنرمند اور پیشہ ور طبقہ کی تعلیم ان کے کام کے مطابق دی جاتی ہے سپاہی کو لڑائی اور ورزش کے کام تین برس تک سکھائے جاتے ہیں لیکن مشیر کاروں کی تعلیم مختلف علوم و فلسفہ میں پینتیس برس تک ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد پندرہ برس تک عملی انتظامات سپرد کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہر فرد اس قابل ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی و بہبودی کی فکر کر سکے۔

لیکن افلاطون کی ریاست کی یہ اشتمالی سوسائٹی سیاسی ہے اقتصادی نہیں اسی لیے باوجود مفید ہونے کے عمل پذیر نہ ہو سکی اس قسم کی اشتمالیت کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ افراد قوم نہایت غریب اور بے گھر رہیں لیکن ریاست کی خوبی اس کا تدبر نہیں بلکہ اس کا اعلیٰ اخلاقی نقطۂ نظر ہے۔ خاص کر یہ بات کہ فرائض ملک کی انجام دہی ذاتی فوائد پر فوقیت رکھتی۔ افلاطون نے خود تھوڑے عرصہ کے بعد محسوس کر لیا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے اس قدر بلند ہے کہ عمل پذیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب "مدبر" میں اپنے تخیلات میں ترمیم کر دی اور یہ بتایا کہ بہترین عملی گورنمنٹ وہ ہو سکتی ہے جس کا بادشاہ ایک فلاسفر ہو اور قانون کے مطابق نہایت پابندی سے قانونی حکومت کرے "قوانین" میں اس نے اعلیٰ ترین ناقابل عمل باتوں کا خیال چھوڑ دیا اور سمجھ لیا کہ موجودہ نامکمل دنیا میں نہ نگراں مشیران حکومت ہی ہمیشہ فراہم

ہو سکتے ہیں نہ فلاسفر بادشاہ اس لیے اس نے اب کی یہ بتایا کہ ایک خلط ملط دستورِ حکومت بنایا جائے جس میں مختلف قسم کی ذمہ داریاں مختلف لوگوں کے لیے وقف کر دی جائیں اور اسی طرح سے یہ مسئلہ عملی طور پر حل ہو سکتا ہے۔

افلاطون کے نظریات کا فلسفہ سیاست پر بے حد اثر رہا ہے اور نشاۃ الثانیہ سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک قائم رہا۔ سیسرو، سینٹ آگسٹین، سر طامس مور، روسو، کانٹ، فکتے، ہیگل اور ٹی ایچ گرین سب کی تصانیف میں اسی کے تخیلات کی روح موجود ہے خصوصاً اس کے یہ تخیلات نمایاں ہیں کہ حکومت ایک اخلاقی ادارہ ہے جس کی محض ایک قانونی معاہدہ کے ماسوا ایک دلچسپ منظم صورت ہے۔ مزید براں تمام اشخاص کی تعلیم کا انتظام اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فرد پر قوم و ملک کے فرائض افضلیت رکھتے ہیں اگر ہم سیاسی طور پر افلاطون کو موجودہ اجتماعیت کا جدامجد کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

لیکن افلاطون کے بعد ایک اور شخص کا بھی اثر کافی طور پر ازمنہ وسطیٰ سے لے کر اب تک باقی رہا ہے وہ افلاطون کا شاگرد ارسطو ہے۔ ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) مقام اسطیجرا کا رہنے والا تھا۔ باپ مقدونیہ کے بادشاہ کا طبیب خاص تھا اوائل عمر اسطیجرا میں گزارنے کے بعد سترہ برس کی عمر میں ایتھنز آیا اور افلاطون کی اکاڈیمی میں بطور طالب علم داخل ہو گیا۔ بیس برس تک (۳۶۷-۳۴۷) افلاطون کے زیر تعلیم علوم متداولہ اور فلسفہ سیکھتا رہا۔ اس کی دماغی اور تخیلی افضلیت نے شروع ہی سے تمام طلبا میں اس کو اولیت دیدی اور اسی وجہ سے بہت جلد افلاطون کا بہت چہیتا شاگرد ہو گیا اس کا دماغ نہایت اپچ اور تخلیقی قسم کا واقع ہوا تھا ہمیشہ نئی نئی باتیں سوچتا رہتا تھا اور ذہانت تو اس قدر تھی کہ افلاطون کی بات کو بھی بغیر کسی اعتراض یا سوال کے نہیں مانتا تھا چنانچہ عام خیال یہی تھا کہ افلاطون کے بعد اس کا جانشین ارسطو ہی ہوگا۔ لیکن جب افلاطون فوت ہو گیا تو اکاڈیمی کی افسری اس کے ایک غیر معروف بھتیجے کو سپرد کی گئی۔ اس پر ارسطو نے ایتھنز چھوڑ دیا اور بارہ برس تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرا (۳۴۷-۳۳۵ ق م) اسی سیر و سیاحت کے زمانے میں

وہ نوجوان سکندر کا معلم بھی مقرر ہو گیا تھا (۳۳۵ ق م) میں ایتھنز واپس ہوا اور درس فلسفہ کے لیے ایک نیا مدرسہ لیسیم پر قایم کیا اور تمام عمر وہیں سلسلہ تدریس جاری رکھا۔

ارسطو نے متعدد کتابیں لکھی ہیں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں جتنے علوم مثلاً منطق، سائنس فلسفہ، آرٹ، تاریخ، اخلاق، اقتصادیات، ادب اور سیاست وغیرہ تھے سب کے متعلق ہیں۔ لیکن اس کا طرز تحریر افلاطون سے جدا ہے۔ افلاطون کی تصانیف مکالمات کی صورت میں ہیں لیکن ارسطو کی مقالات کی صورت میں لیکچر ہیں نہ کہ بحثیں بس ساتھ ہی منظم اور مرتب حالت میں۔ ارسطو موجودہ سائنس کا پیشرو کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ واقعات دنیاوی کو برابر ساتھ لیے چلتا ہے افلاطون کی طرح محض خیالی نہیں ہو جاتا اس کے نزدیک دنیائے رنگ و بو بھی اتنی ہی اہم اور پُر حقیقت ہے جتنی کہ افلاطون کی تخیلی کائنات اس کے نزدیک جس قدر اہمیت عقبیٰ کو دی جا سکتی ہے اسی قدر دنیا کو بھی دی جا سکتی ہے ہمارے حواسوں کی مجازی دنیا اس کے نزدیک افلاطونی تخیلی حقیقت سے کسی طور کم نہیں اس کے علاوہ ارسطو نے وہ تمام فیثا غورسی اثرات جو افلاطون کے یہاں پائے جاتے تھے یک قلم مسترد کر دیے۔

ارسطو کی سیاسیات نامی کتاب میں وہ دلچسپیاں اور ادبی خوبیاں نہیں ہیں جو افلاطون کی ریاست میں پائی جاتی ہیں بلکہ ارسطو کی تصنیف کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک خشک سائنس کا مقالہ ہے جس میں نہایت بندھے ٹکے ٹھوس اور سنجیدہ مضامین درج ہیں یہ کتاب ارسطو نے بذات خود تحریر نہیں کرائی بلکہ اس کی وفات کے کئی سال بعد اس کے چند شاگردوں نے ترتیب دی ہے پھر بھی ارسطو کے یہ لیکچرس اس قدر پُر فکر، اعلیٰ اور ٹھوس خیالات سے پُر ہیں کہ سیاسیات کے طالب علم کی معلومات ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔

کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے افلاطون کی خیالی اشتراکیت کی زجر و توبیخ

نہایت شد و مد کے ساتھ کی گئی ہے اس کے بعد ارسطو یہ بتلاتا ہے کہ قوم یا حکومت کی بنیاد پہلے پہل ایک خاندان پر قایم ہوئی (افلاطون اس بات سے انکار کرتا ہے) اور پھر یہی صورت بڑھتے بڑھتے ایک گانؤ کی شکل ہو گئی اور پھر یہ صورت بڑھ کر ایک شہر کی شکل ہو گئی جو اپنی ضروریات اور اپنی دیکھ بھال خود کرتا ہے (اور جس کا بہترین نمونہ ایتھنز ہے) اس کے بعد اپنے شہر ایتھنز کی تعریف کرتا ہے اس کے زمانہ میں ایتھنز کی آبادی دس ہزار سے زیادہ نہ تھی اور چونکہ گھر کا کام کاج کرنے کے لیے غلام بکثرت تھے اس لیے وہاں کے باشندے زیادہ تر اپنا وقت شہری اور ملکی معاملات میں صرف کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شہر کی خدمت کرنا اپنے ذاتی فرایض سے بڑھ کر تھا اور انھیں یقین کامل تھا کہ جب تک امور ریاست اچھے نہ ہوں گے ان کی ذاتی زندگی کو چین و اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ انسان چونکہ قدرتی طور پر سیاسی تخلیق ہوا ہے اس لیے وہ مانتے تھے کہ ان کے شہر نے ایک ارتقائی حالت سے شروع کر کے نہایت اچھی سیاسی صورت اختیار کرلی ہے اور یہ کہ ان کا شہر ایک خارجی طور پر بنائی ہوئی تصویر نہیں بلکہ خود قدرت کی ایک پیداوار ہے

اس کے بعد ارسطو اچھی اور خراب حکومتوں کی تقسیم یوں کرتا ہے کہ اچھی حکومتیں وہ ہیں جن کا مقصد نیکی ہو اور بری وہ ہیں جو طاقت یا روپیہ کی حریص ہوں اچھی حکومتیں وہ جو تمام باشندوں کا بلا تخصیص بھلا چاہیں بری وہ جو کسی ایک خاص طبقہ کو بڑھادیں اور دوسرے طبقوں کی پرواہ نہ کریں

اس کے بعد حکومت کے مختلف شعبہ جات (قانون سازی تنظیم اور عدل) کے متعلق اور حکومت کے عام فرایض اور امن و تحفظ کے فرایض وغیرہ کے متعلق نہایت بسط و شرح سے بحث کی گئی ہے جو باوجود اس کے کہ بہت قیمتی ہیں لیکن اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں تحریر نہیں کیے جا سکتے افلاطون کی طرح ارسطو بھی عام تعلیم کو بہترین ذریعہ سمجھتا ہے جس کی بدولت نیکی پیدا کی جاسکتی ہے اور جس کی بدولت کسی قسم کی بدامنی یا غلط راہ روی پیدا ہونے کا احتمال تقریباً قطعی مفقود ہوجاتا ہے۔

خطۂ روما

یونان سے روم کی طرف سیاست کا منتقل ہوجانا دو بڑے اور چوٹی کے مفکرین میں اس قدر تفاوت بہت شاذ دیکھنے میں آتا ہو جتنا کہ افلاطون اور ارسطو کے نظریہ خیال میں پایا جاتا ہو۔ ایک کا نظریہ فلسفیانہ اور منطقی تھا تو دوسرے کا سائنٹفک اور تحلیلی۔ ایک کا ترکیبی تھا تو دوسرے کا تجزیاتی، ایک داخلی نگاہ رکھتا تھا تو دوسرا خارجی۔ ایک ذہنی بحث کرتا تھا تو دوسرا تجربی، ایک عقل کو واحد رہنمائے حیات مانتا تھا تو دوسرا جبلت انسانی کو، ایک سوسائٹی اور مملکت کے امور تک قابل ترمیم قرار دے سکتا تھا تو دوسرا رواج و عادات اور روایات کو دخل مانتا تھا لیکن ان تمام متضاد آرار کے باوجود دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ان کا یونانی شہر مملکت ایتھنز بہترین سیاسی شہر تھا اس کے علاوہ دونوں علم کی ترویج کو ذریعہ بہبودی و ترقی قوم کا سمجھتے تھے جس کے ذریعہ ان کا شہر دشمنوں کے دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہ سکتا تھا۔

لیکن اس خیال میں وہ دونوں غلطی پر تھے یونان کی شہری مملکت کا زمانہ گزر چکا تھا اور اب دنیا کے لیے وسیع الشان سلطنتوں کی ضرورت تھی چنانچہ خود ارسطو کا شاگرد سکندر اٹھا اور یونانیوں کی آزادی کو ختم کرکے مغرب میں سب سے پہلی سلطنت کی بنیاد ڈالی یونانیوں کے شہر تباہ ہوجانے کا باعث محض اس کی اندرونی ابتری اور اس کے باشندوں کی بے راہ روی تھی (جن کا ایرسطافینز نے اپنے ڈراموں میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے) اس کے علاوہ یونان کی شہری مملکت میں چند اصولی خامیاں بھی تھیں مثلاً یہ کہ ایتھنز رقبہ کا تھا اور سب سے الگ تھلگ۔ وہاں کے لوگ خود غرض ظالم غیر مستقل مزاج اور آپس میں لڑنے والے تھے ان میں غلاموں کا ہجوم بے حد و بے شمار ہوگیا تھا وغیرہ وغیرہ ایسا شہر بقائے دوام کیسے حاصل کرسکتا تھا۔

سکندر اعظم نے تیرہ برس کے عرصہ میں جتنی بڑی سلطنت قائم کرلی وہ ایک معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے اگر ایک طرف بحر اڈریاٹک کی لہریں تھیں تو دوسری طرف دریائے سندھ کی موجیں۔ جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے سکندر کے حملوں سے دو باتیں معرض ظہور میں آئیں اول تو یہ کہ یونان کی شہری مملکت کا خاتمہ

ہوگیا اور ایتھنز محض ایک معمولی میونسپلٹی کی صورت میں رہ گیا۔ دوسرے یہ کہ یونانی علم وتہذیب دنیا کے اس گوشے سے لے کر اُس گوشے تک پہنچ گئی۔ یونانی اور غیر یونانی کا فرق جاتا رہا۔ مشرق یونانی علم وتہذیب سے آشنا ہوگیا اور ہر جگہ یونان کا خطہ علم و دانش کا مخرج سمجھا جانے لگا۔

ایسی حالتوں میں یونانی سیاسی نظریہ مفقود ہوگیا اور اس شہر میں جس کو وہ بہترین کہا کرتے تھے کوئی خوبی باقی نہیں رہی۔ اہالیان شہر سیاست کو بھول گئے اور فرائض قومی اور فرائض ذاتی سب زیب طاق نسیاں ہوگئے۔ شہر کا معیار تو بے حد بڑھ گیا تھا لیکن فرد میں آزادی تخئیل بہت کم رہ گئی آزادی اور خودمختاری دونوں کا خاتمہ ہوگیا۔ سیاست جسے وہ زندگی کا دلچسپ مشغلہ کہا کرتے تھے اب ان میں سے اُٹھ گئی۔

لیکن ایسی حالت کا یونان نے کس طرح مقابلہ کیا؟ بعض مفکرین نے اس بات کو ماننے سے سرے سے انکار ہی کر دیا کہ ان کا شہر فتح کر لیا گیا ہے چنانچہ وہ لوگ اُسی طرح لکھتے اور بحث کرتے رہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں تھا افلاطونی اور ارسطوئی اپنے اپنے نظریے بڑھا بڑھا کر باہم دست وگریباں رہے۔ ان فلاسفہ کی ذہنیت قابل افسوس ہے کہ انھوں نے جو حقیقت تھی اُسے پس پشت ڈال دیا اور باہم سیاسی مناقشہ میں خواہ مخواہ اُلجھے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یونانیوں کے نزدیک سیاست ایک ایسا فلسفۂ زندگی تھا جو اخلاق۔ الٰہیات اور مابعدالطبیعات سے بڑھ کر تھا ان کے نزدیک مذہب بھی سیاست کی حدود سے باہر نہ تھا بلکہ اسی کے اندر۔ اور انھیں اسباب کی بنا پر سیاست کے مسئلوں پر نہایت جوش وخروش اور شد ومد کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوا کیا حالانکہ اب ان کا شہر ایتھنز بھی ان کا اپنا نہیں رہا تھا اور نہ پھر ان کی حکومت ہی باقی تھی لیکن بحثوں کی گرما گرمی اسی طور پر قایم تھی۔

لیکن ان کج بحث افلاطونی اور ارسطوئیوں کے علاوہ چند دانشمندوں کا گروہ ایسا بھی تھا جس نے واقعہ اور حقیقت کا مقابلہ کیا اپنی شکست کا سراسر اعتراف کیا اور پھر اپنے فلسفہ میں ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تغیر وتبدل کر دیا۔ یہ گروہ ایپیقوریس اور رواقیت پسند لوگوں کے تھے لیکن قبل اس کے کہ ہم ان لوگوں کا تذکرہ شروع کریں آشنا بنا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سکندر اعظم کی وہ عظیم الشان اور وسیع سلطنت اس کی وفات کے بعد بہت جلد پارہ پارہ ہوکر اس کے مختلف فوجی افسروں میں تقسیم ہوگئی۔

کو عرصہ تک اس کی سلطنت کے تین حصے یعنی مقدونیہ (جو سکندر کا وطن تھا) مصر اور شام اپنے وجود کو باقی رکھ سکے لیکن آخر کار یہ تینوں بھی نابود ہوگئیں مقدونیہ (۱۴۹ ق م) میں، شام (۶۴ ق م) میں اور مصر (۳۰ ق م) میں سلطنت روما کے تحت میں آگئے۔ اسی زمانہ میں یونان بھی سلطنت روما کے زیر نگیں آگیا تھا لیکن روما بھی دراصل یونانی تاثرات کے زیر اثر تھا۔ اس کی تہذیب اس کی زبان، اس کا ادب اور اس کے قوانین علوم و فنون، فنون لطیفہ سب ایتھنز والوں کے تھے جن کو سکندر تمام دنیا میں پھیلا چکا تھا۔

ابیقورس اور زینو ابیقوریی اور رواقی دونوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ یونانی شہری مملکت کے زمانے اب ختم ہوگئے سیاست اب لوگوں کی مرجع عام نہیں رہی اور ذات واحد اور حکومت کا باہمی رشتہ بری طرح سے شکست ہوگیا ہے اور اب لوگوں کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس بات کو تسلیم کرنے میں دونوں کو کوئی دقت یا افسوس بھی محسوس نہیں ہوا اس لیے کہ ان دونوں میں کوئی ایتھنز کا باشندہ نہیں تھا محض طلب علم میں یہ دونوں باہر کے شہروں سے وہاں آگئے تھے۔ ابیقورس سیامس کے جزیرہ میں پیدا ہوا تھا جب اٹھارہ برس کا ہوا تو ایتھنز آکر (افلاطون کی وفات کے کوئی پچیس برس بعد) افلاطون کی اکاڈمی میں داخل ہوگیا تھا۔ زینو جزیرہ قبرص کا رہنے والا تھا اس لیے مشرقی تخیلات سے اثر پذیر

ابیقورس نے افلاطون اور ارسطو کے کارناموں کا عرصہ تک مطالعہ کیا اور ان مفکرین کے تخیلات کے بالکل برعکس اس نتیجہ پر پہنچا کہ ذات فرد قومی و ملکی تخیلات سے برتر چیز ہے اس نے کہا کہ اپنی ذات کو پہچاننا اور اس کی خواہشات کو پورا کرنا سب سے اولین فرض ہے اور ذات فرد اولین اور واحد حقیقت ہے حکومت محض ایک ذریعہ ہے اس فرض کو پورا کرنے کا حکومت محض ایک عارضی اور مصنوعی تخلیق ہے اور محض آپس کا معاہدہ۔ برخلاف اس کے ذات فرد ایک ناقابل انکار حقیقت ہے قوانین حکومت کا ماننے سے اور کوئی فائدہ نہیں بجز اس کے کہ ان سے ذاتی فائدہ ہوتا ہے عدل درحقیقت کوئی چیز خارجاً موجود نہیں ہے اور مذہب ایک تکلیف دہ شاخسانہ ہے ان باتوں میں الجھنا ایک فضول سی بات ہے کہ کس طرح کی حکومت ہونا چاہیے بس اتنا کافی ہے کہ حکومت اتنی طاقتور ہو کہ ملک میں امن و امان قایم رکھ سکے تاکہ اس کے افراد نہایت اطمینان سے عشرت میں بسر کرسکیں دراصل عشرت ہی زندگی کا مقصد ہے چنانچہ ابیقوریی فرقہ نے پبلک فرائض سے

بالکل بے اعتنائی برتنا شروع کی اور عیش کوشی میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ ان کا نقطۂ نظر اخلاقی نقطۂ نظر سے برا نہیں تھا خود کو پہچاننا اور خودی جس امر کی متلاشی ہو اس کی تکمیل کرنا بذات خود بے راہ روی نہیں کہی جا سکتی لیکن اس کے پیرو اعمال کے اعتبار سے نہایت بے راہ روی اور فحاشی کی زندگی پر اتر آئے یہاں تک کہ انھوں نے سماجی فرائض سرے سے بالکل ہی بھلا دیے اور محض فحش زندگی بسر کرنے لگے یہی وجہ تھی کہ رومن باشندوں کو اس قسم کا فلسفہ پسند نہیں آیا۔ ان کے رگ و پے میں سماجی فرائض کی انجام دہی اور ان کی تحریم پہلے سے سرایت کر چکی تھی۔

چنانچہ رواقیت اس کے بالکل برخلاف روما میں نہایت تیزی سے پھیلی بلکہ یونان سے زیادہ روم میں اس کا رواج ہوا۔ رواقیوں کے نزدیک عیش و عشرت نہیں بلکہ اپنے فرائض کا پورا کرنا اولین شرط زندگی تھا ان کے نزدیک زندگی کا مقصد، تمناؤں اور آرزوؤں کا بڑھانا نہیں تھا بلکہ ان کا گھٹانا یہاں تک کہ وہ بالکل کم ہو جائیں اور محض دو چار ضروری رہ جائیں ان کے نزدیک روحانی اور دلی طمانیت اسی میں تھی کہ وہ نفس کو مارے رہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد فنا تھا ان کے نزدیک ظاہر کی کوئی وقعت نہ تھی اگر کوئی بادشاہ ہے تو کیا اور اگر غلام ہے تو کیا تمام نوع انسان متفق متحد اور ایک ہیں فرد واحد محض کسی شہر کا ایک باشندہ نہیں بلکہ انسانی گروہ کا ایک فرد ہے۔ تمام انسان آپس میں برابر ہیں حکومت ان کے نزدیک ایک قدرتی پیداوار تھی بشرطیکہ وہ اتنی وسیع ہوتی کہ دنیا (اور یہ بات حوصلہ مند رومن لوگ دل سے چاہتے تھے) اگر یہ محدود اور فرقہ وارانہ ہو تو مصنوعی محض ظاہری ہے بیکار اور فضول قدرتی قوانین کو بہترین اور غیر فانی سمجھتے اور انھیں کے احکامات کے آگے انسان کو سر جھکانا لازم قرار دیتے وہ عدل کو انھیں قوانین کا جزو اعظم سمجھتے اور اس لیے اس کو ایک خارجی اور لافانی فطرتی حکم تصور کرتے اور اسے ہر جگہ حاضر و ناظر جانتے۔ ان کے نزدیک مذہب کے معنی تھے اس حاضر و ناظر عقل کو تسلیم کرنا جو تمام فطرت اور قوانین فطرت کے پس پردہ جاری و ساری ہے اور ان تمام فرائض کو انجام دینا جس کی ضمیر ہدایت کرے۔ ان کے نزدیک خداؤں کی ہستی یا نیستی کوئی لائق اعتنا بات نہ تھی اگر ان کے خدا نہیں تھے تو وہ بغیر ان کے اپنا کام چلا سکتے تھے اگر وہ موجود تھے تو جو کچھ وہ کہیں گے مانا جائے گا اور سر تسلیم خم کر دیا جائے گا وہ کہتے تھے بہر حال صراط مستقیم ہمارا راستہ ہے اگر خدا ہے تو ہم کو اسی راستہ پر مل جائیگا

اور پھر وہ چاروں رہبری کرے گا اگر نہیں ہے تو کوئی پروا نہیں ہم صراط مستقیم پر جا رہے ہیں یہ مذہب چونکہ اعلیٰ اور بلند پایہ، صاف اور سادہ تھا اس لیے رومن سلطنت کے تمام بلند مرتبہ لوگوں میں جاری ہو گیا۔ سینیکا اور مارکس آریلیس اس مذہب کے دو مشہور پیروکار گزرے ہیں یہ ایسا مذہب تھا جو عیسائیت سے بہت کچھ مشابہ تھا اور جس کی وجہ سے بعد میں عیسائی مبلغین کو عیسائیت کی ترویج میں بہت مدد ملی۔

رومی رواقیوں میں سینیکا (۶۵-۳ ق م) نہایت اعلیٰ مفکر گزرا ہے اسی نے سیاسی تفکر میں سب سے نمایاں حصہ لیا لیکن قبل اس کے ہم اس کا تذکرہ کریں ہمیں چند اُن رواقی رومن قانون دانوں کا ذکر کرنا ضروری جو اس سے قبل گزرے ہیں مثلاً پالی بیاس (۱۲۲-۲۰۴ ق م) اور تیجیرو (یا سیسرو) (۴۳-۱۰۶ ق م)

رومن سیاسی مفکرین | رومی سیاسی مفکرین میں سب سے پہلا دانشمند پالی بیاس تھا جو دراصل یونانی الاصل تھا۔ روم میں سولہ سال رہنے کے بعد (۱۵۱-۱۶۷ ق م) وہاں کی سیاست کا اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ اس نے اس امر کی تحقیقات شروع کر دی کہ رومن سیاست میں آخر ایسی کون سی بات ہے کہ جس کی بدولت حکومت روما اس قدر ترقی پر ہے۔ اور کیا خرابیاں تھیں جن کی وجہ سے یونان تباہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے رومیوں کی تاریخ کا مطالعہ بالتفصیل کیا اور پھر ایک معرکۃ الآرا تصنیف خود لکھی جس میں اس نے پتہ چلایا ہے کہ کب سے اور کیوں رومن لوگ ترقی کرنے لگے اور کیوں اب بھی ترقی پذیر اور بے عدیل ہیں ارسطو نے جو شخصی جمہوری اور امرا شمرانی حکومت کی قسمیں کی تھیں ان کو وہ کہتا ہے کہ ان میں تفاوت محض صوری اور ظاہری ہے ورنہ اندرونی کوئی فرق نہیں اور ہر ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر فرق ہے تو وہ معاصرانہ ہے نہ کہ مخالفانہ اس کے علاوہ ان میں سے کسی ایک کا وجود محض ممکن نہیں کیونکہ دوسرے دو طبقات مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے چنانچہ وہ ہر ایک کی مثال دیکر بتلاتا ہے کہ کیونکر ایک بغیر دوسرے کے وجود کے استقامت پذیر نہیں ہو سکتی۔ یونان کے زوال کی وجہ یہ بتلاتا ہے کہ وہاں یہ اقسام یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتی رہیں برخلاف اس کے روما میں مطلق العنانیت، اشرافیت، عددیہ یا جمہوریت سب ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مدد کرتی ہوئی موجود ہیں۔ پالی بیاس کا یہ نظریہ سیاست میں پہلا نظریہ ہے کہ کونسی باتیں ایک آئین یا دستور کو مدد پہنچاتی ہیں اور کونسی باتیں مخالف ٹھہرتی ہیں وہ حکومت کو ایک ترقی پذیر عضویہ

کے طور پر نہیں سمجھتا بلکہ ایک مشین جس میں مختلف المزاج اور موافق المزاج قوتیں جمع کر دی گئی ہیں۔
لیکن ابھی پالی بیاس نے دائمی اجل کو لبیک نہیں کہا تھا کہ روما میں وہ عناصر پیدا ہو گئے جنھوں نے اس کی تخریب کرنا شروع کر دی گراچی (۱۳۳ ق م) کی شورشوں سے لے کر ایک سو سال تک متواترامار اور جمہوریت میں مناقشہ ہوتا رہا اور جس کا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ جمہوریہ ختم ہو کر خصوصیہ (Principale) قایم ہو گئی چیچرو تقریباً پالی بیاس کے ایک سو سال بعد ہوا اور اپنی تصنیفات اس وقت شروع کیں جبکہ جولیس سیزر اپنی نوج ظفر موج کے ذریعہ روما میں اپنی ڈکٹیٹر شپ قایم کر رہا تھا چیچرو چونکہ جمہوری خیالات کا حامی تھا اس لیے وہ سیزر سے بے انتہا نفرت کرتا تھا اور ہمہ وقت اس سے خائف رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح پھر سینیات اور مجسٹریٹی قایم ہو جائے۔ اپنی کتاب "جمہور" اور "قانون" میں اس نے ان تمام اسباب پر تنقیدی نظر ڈالی ہو جن کی وجہ سے رومی دولت عامہ پالی بیاس کے زمانے سے زوال پذیر ہو تی گئی۔ چنانچہ پالی بیاس کے نظریہ کے مطابق اس نے اب یہ دیکھنا شروع کیا کہ کون سے مخالف اجزا ترقی پا گئے ہیں جن کی بدولت رومی سلطنت کی یہ نوبت پہنچی ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جمہوری فرقہ کو بہت زیادہ اہمیت اور طاقت سپرد کر دی گئی ہو جس کا بہت برا استعمال سیزرا اور میریاس کر رہے ہیں اس کے بعد پھر اپنی تصانیف میں رومی لوگوں کی خوبیاں اور ان کے آئین حکومت کی تعریفیں بیان کرتا ہو اور کہتا ہو کہ رومی آئین حکومت مثالی ہو اور رواقی یا قدرتی آئین کے بے انتہا مشابہ ہو رومی قوانین عدل و انصاف کو رواقی یا قدرتی قوانین کے بالکل مطابق سمجھتا ہے اور چیچرو کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہو کیونکہ یہ پہلا شخص ہو جو یہ کہتا ہو کہ یہ قوانین آسمانی قوانین ہیں جو دنیا اور دنیا کے لوگوں کے درمیان نافذ کیے گیے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود چونکہ ایک ادبی آدمی طاقتور آدمی نہیں ہوتا سیزر کی مخالفت نے چیچرو کو تباہ کر ڈالا اور وہ قتل کر دیا گیا۔ رومن جمہوریہ ڈکٹیٹر شپ اور مطلق العنانیت میں تبدیل ہو گئی جس کا سب سے بدترین شہنشاہ نیرو تھا۔ تقریباً آٹھ برس تک سینیکا (۶۲-۴ ہ ق م) جو نیرو کا استاد بھی تھا اس کا وزیر اعظم رہا۔ لیکن نیرو کے ماتحت وزیر اعظم رہ کر سینیکا کے تمام رواقی اصول کا شدید ترین امتحان لیا گیا خیالی اور واقعی اصولوں کی کش مکش کا ایک مصالحت پذیر مقام پر آنا نہایت ہی دقت آمیز کام تھا ایک

طرف تو رواقیت تھی جس کے اصول یہ تھے کہ حکومت ایک فطری قانون ہو جس کے ماتحت تمام بنی نوع انسان باوجود جاہل اور غیر مہذب ہونے کے معصوم اور خوش رہ سکتے ہیں اور جس کے ماتحت ہر شخص کا ضمیر اس کا سچا اور کافی رہنما ہو جہاں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں جہاں نہ کوئی غلام ہو نہ کوئی حاکم۔ جہاں آزادی تمام ہو اخوت تمام اور ہر ایک میں بھائی چارہ۔ دوسری کی طرف روما کی سلطنت تھی جس کا ناظم نیرو تھا جس میں اعتدال سے زیادہ فسق وفجور ہوتا تھا۔ نہایت ہولناک جرائم، قابل ترس فلاکت بے انتہا شدید مظالم اور جس کا ظالم کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کیا کیا ہو۔ یہی تنازعے غلاموں کی لاتعداد کثرت تاہم یہ صورت بہتر تھی اُس حالت سے کہ کوئی صورت ہی نہ ہوتی اگر نیرو تباہ کر دیا جاتا تو اور بھی قابل افسوس حالت پیدا ہو جاتی یہی وجہ تھی کہ سینیکا اور اس کے ہم خیال لوگوں نے ایسی سلطنت کو قایم اور برقرار رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی انھوں نے دیکھا کہ بس چارہ کار یہی ہو کہ ہم دو خرابیوں میں سے کم تر خراب چیز کا انتخاب کرلیں۔ ایک طرف جبرو استبداد ظلم اور بیداد تھی دوسری طرف ہرج مرج فساد و بربادی چنانچہ لوگوں نے پہلی لعنت کا انتخاب کیا اس خیال سے کہ شاید یہ اصلاح پذیر ہو جائے لیکن زمانہ مخالف تھا اور کوئی صورت بہتری اور اصلاح کی دکھائی نہ دی چنانچہ اُس رواقی نے محض اپنی روح کے قلعہ میں اپنی حفاظت دیکھی اور موت ہی محض طریقہ رہائی جانا۔

سینیکا کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بلکہ قسطنطین (۲۰۶ - ۳۳۷ عیسوی) تک کئی قابل مقنن جو سب اسی رواقی فلسفہ کے گرویدہ تھے رومی قوانین پر رواقی طریقہ کار کو سراہتے رہے خصوصاً معاملات دیوانی میں وہ لوگ عدل فطری (یعنی اعلیٰ ضمیر اور نہایت روشن دماغی سے نکلا ہوا فیصلہ) پر بہت زیادہ عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ان قانون دانوں کی بدولت آتنا ہو گیا کہ وہ مظالم جو غلاموں پر توڑے جاتے تھے بہت کم بلکہ تقریباً مفقود ہو گئے۔ جنگ کی ہولناکیاں ختم ہو گئیں گھریلو زندگی کا دور دورہ ہوا ملکیت اور جائداد نہایت مناسب طریقہ پر تقسیم ہونے لگی۔ اُس عہد کے قوانین آج تک بلند پایہ خیال کیے جاتے ہیں۔

عیسائیت کا دور دورہ

قسطنطین | شہنشاہ قسطنطین نے سنہ ۳۱۳ء میں تمام رومن سلطنت کا مذہب عیسائیت قرار دیا۔ ان تین صدیوں میں جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ سے اِس مدت تک گزریں عیسائیت مختلف حالات و کیفیات کے دوروں سے گزر چکی تھی جس کو ہم چار حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں یعنی دور یروشلم سنہ ۵۰ء تک (۲) دور انطاکیہ سنہ ۵۰-۱۵۰ء تک (۳) دور اسکندریہ سنہ ۱۵۰-۲۵۰ء تک (۴) دور روما سنہ ۲۵۰-۳۱۳ء تک۔

ابتدائی دور میں یعنی مسیح اور ان کے بارہ حوارئین کے زمانہ تک سیاست انتہائی بددلی اور نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی سیاست ہی کیا بلکہ تمام دنیاوی چیزیں حقیر سمجھی جاتی تھیں اُن حضرات کی تلقین ان چیزوں کے متعلق نہیں تھی جو دیکھی جاتی ہیں اور فانی ہیں بلکہ ان کا مقصد اُن چیزوں کا تذکرہ تھا جو پوشیدہ ہیں اور غیر فانی وہ چونکہ اس بات میں عقیدہ رکھتے تھے کہ دنیا چند روزہ ہے اور فانی اور قیامت بالکل قریب ہے اس لیے دنیاوی چیزوں اور دنیاوی باتوں کی طرف متوجہ ہونا ایک بالکل فضول سی بات جانتے تھے اسی لیے روحانیت ہی کو وسیلۂ نجات سمجھتے اور روح کی نگہداشت ہی اپنا فرض اولین جانتے تھے محض عرصۂ قیامت کی فکر رہتی جہاں نہ کوئی غریب ہوگا نہ کوئی امیر اور نہ کسی کی یہ پہچان ہوگی کہ کون بادشاہ ہے کون گدا، کون جمہوریت پسند ہے کون امارت پسند تاہم یہ چھوٹا سا گروہ باوجود ایک درویشی گروہ ہونے کے ایک الگ مملکت تصور کرتا جس کے شہنشاہ حضرت مسیح علیہ السلام تھے اور تمام قوانین ان ہی کی زبان کے نکلے ہوئے مانے اور برتے جاتے اس تبلیغ کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو یہودیوں کو یہ خیال ہوگیا کہ یہ ایک قسم کی پارٹی ہے جس کی وساطت سے بے رحم رومیوں کی سلطنت تہ و بالا کی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف اس نے رومن گورنمنٹ کے کان کھڑے کر دیے چنانچہ اُن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا تاکہ کہیں یہودیوں کے بادشاہ نہ بن بیٹھیں حالانکہ حضرت عیسیٰؑ نے قبل ہی سے یہ بات سب کو اچھی طرح سنا دی تھی کہ ان کو سیاسی معاملات میں قطعی دلچسپی نہیں ہے نہ ان کا مقصد کسی سلطنت کو قائم کرنا ہے نہ سیزر کی مخالفت کرنا حضرت عیسیٰؑ کے دو جملے

عیسائیت کے خاص طور پر شاہد ہیں یہ بتلایا کہ "میری حکومت اس دنیا کی نہیں ہے" (جان ۱۸-۳۶) دوسرا
یہ کہ قیصر کے سپرد وہ چیزیں کر دو جو سیزر کی ہیں اور خدا کے سپرد وہ جو خدا کی ہیں" (میتھو ۲۲-۲۱ مارک ۱۲-۱۷)
یہ دو باتیں یقینی طور پر سیاست کو مذہب سے جدا کرتے ہیں گویا دونوں کی الگ الگ حدیں مقرر کردی
گئی ہیں۔ اسی لیے یہ پابندی کہ مذہبی امور یا عبادت شہری انتظام کے ماتحت رہیں جیسا کہ یونانی و
رومن شہریت میں قاعدہ تھا ختم ہوگئی لیکن سیاست سے اس قدر بے اعتنائی جو حضرت عیسیٰ اور ان کے
حواریین کا مسلک تھا اس کے بعد قایم نہ رہ سکی کیونکہ ایک طرف قیامت نہیں آئی اور دنیا کا خاتمہ نہیں ہوا
جیسا ان لوگوں کا خیال تھا اور جس کی خاطر یروشلم (جس نے اپنا سب کچھ ان لوگوں کے لیے قربان
کر دیا تھا) نہایت غریب ہوگیا تھا دوسری طرف انجیل مقدس کی تبلیغ فلسطین کے باہر ملکوں میں پہنچ
گئی مختلف مشرقی اعتقادات سے میل ہوا اور ایک نئی قسم کی الٰہیات ظہور میں آگئی جس کا تعلق اصلی
عیسائیت سے بہت کم تھا تاہم عیسائیت نہایت تیزی سے پھیلی اور ایشیاے کوچک سے ہوتی ہوئی
یونان پہنچی اور یونان سے روم۔ ہر جگہ لوگوں نے اس کا خیر مقدم نہایت خوشی سے کیا۔ اس پر یہودیوں کا
بغض و عناد ہر جگہ بڑھتا گیا سینٹ پال باوجودیکہ ایک رومن تھے لیکن ان کے دل و دماغ پر جس تعلیم
نے اپنا سکہ جما لیا تھا اس کی ترویج میں انھوں نے کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور برابر عیسائیت
کی اشاعت میں ہمہ تن مشغول رہے بارہا ایسا ہوا کہ حکام کی مدد سے اپنے چھوٹے چھوٹے گرجاؤں کو مٹنے
سے بچا لیا یعنی سینٹ (درویش) پال باوجودیکہ عیسائی مذہب رکھتے تھے لیکن اپنی حکومت کی اطاعت
اپنا فرض سمجھتے تھے ان کے نزدیک رومن حکومت بھی وہی کام کر رہی تھی جو عیسائیت کا مقصد تھا (یعنی
نظم و نسق امن و امان عام) وہ کم درجہ پر خود رومن حکومت کو عیسائیت کے لیے بالکل تیار دیکھ رہے
تھے چنانچہ آپ نے تمام شہری اور حکومت کے اختیار کی بنیاد آسمانی سمجھی اور لوگوں سے کہا کہ جب تم
دعا مانگا کرو تو پہلے بادشاہوں اور بادشاہت کے لیے بھی دعا مانگا کرو کیونکہ اختیار خدا ہی کی طرف
سے عنایت ہوتا ہے پھر بھی آپ مذہب اور حکومت کی حدود الگ سمجھتے رہے اور پیشتر کے حواریین
کی طرح دنیاوی حکومت چند روزہ اور خدا کی حکومت کو ابدی مانتے رہے۔ آپ فرماتے تھے کہ جب تم

لوگوں میں کوئی جھگڑا پڑے تو بہتر ہو کسی درویش کو اپنا منصف مقرر کر لو بجائے اس کے کہ تم ایک نامنصف حاکم کے پاس جاؤ۔

ایک اور دلچسپ بات کا درویش پال کی تصنیفوں سے انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ کی تعلیمات رواقی نظریہ کے بہت مطابق تھیں مثلاً آپ کہتے تھے کہ قدرت کا ایک قانون ہے جو ہر شخص کے دل و ضمیر پر ثبت ہے بلا کسی اختلاف ملت و مذہب اور حالات کے ہر شخص آپس میں برابر ہے۔

زمانہ مصائب | لیکن عیسائیت اور رومن سلطنت کا یہ خوشگوار اتحاد عرصہ تک قائم نہ رہ سکا رومن سلطنت میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ ہر فرد رعایا بلا تفریق مذہب چند اقسام کی عبادات و قربانیاں کرے یہ امر عیسائی اصولوں کے قطعی خلاف تھا دوسرے یہ کہ عیسائی مذہب والے لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا مذہب ایک معمولی مذہب سمجھا جائے بلکہ وہ اسے تمام دنیا کا مذہب بنا دینا چاہتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس سے بڑھ کر کسی کا مذہب نہیں جب انھوں نے دیکھا کہ رومن لوگ اپنے دیوتاؤں کو پوجے جاتے ہیں اور حقیقت کی طرف نہیں آتے تو انھوں نے رومن دیوتاؤں کو شیطانی گروہ کہنا شروع کیا یہ باتیں لوگوں کو سخت ناگوار ہوئیں اور خصوصاً وہ پر زبہت لوگ جو وہاں کے مذہب کے پادری سمجھے جاتے تھے بہت حزیز ہوئے اور ان سب سے بڑھ کر وہاں کا شہنشاہ برہم ہوا اس طرح عیسائیت اور رومن سلطنت کے مابین ایک زبردست اختلاف پیدا ہو گیا عیسائی لوگ بنی نوع انسان کے دشمن سمجھے اور رکھے جانے لگے اور یہ بھی کہا جاتا کہ وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں بلکہ پوشیدہ جونک کی صورت میں انسانوں کو تباہ کر رہے ہیں اس پرخاش کے عملی نتائج ظاہر ہونے لگے اور اکثر و بیشتر عیسائیوں سے چپقلش ہو جاتی اور بہتیرے اربھی ڈالے جاتے عیسائی جنت کی خواہش اور شوق شہادت میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے اور اپنے مذہب میں سخت سرگرمی دکھلاتے چونکہ ان کو اس کی غرض نہ تھی کہ کسی صورت سے کچھ مصالحت ہو جائے نفاق بڑھتا گیا اور یہاں تک کہ اسکندریہ میں ان دیوتا پرستوں اور حقیقت پرستوں کے درمیان نہایت سخت معرکہ آرائی ہو گئی یہ اس قدر ایک دوسرے سے نفرت ہو گئی کہ رومن سلطنت عیسائیت کی جانی دشمن ہو گئی اکثر اوقات ان لوگوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ برتاؤ کیے جانے لگے تاکہ یہ اپنے کام سے باز آجائیں عیسائیت نے

بھی اس کے جواب میں رومن سلطنت کو شیطانوں کی سلطنت کہنا شروع کیا وہ بات جاتی رہی جو درویشیوں کے زمانہ میں تھی کہ رومن سلطنت کا باشندہ ہونا ہی عیسائیت کی طرف ایک قدم بڑھانا ہے۔ اب رومن سلطنت درحقیقت کُش ظالم اور ایک ایسا شیطانی گروہ کہا جانے لگا جس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا تھا۔ شہر روم کو ایک ایسی فاحشہ عورت سے تشبیہ دیتے جس کے بچے تمام بدمعاش، بدچلن، آوارہ اور بیہودہ تھے اور جس کی خوراک درویشوں اور شہیدوں کا خون تھا۔

لیکن رومن سلطنت کی مخالفت کے باوجود عیسائیوں کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہونے لگا اور ساتھ ہی ساتھ ان میں ایک منظم صورت پیدا ہو گئی جس میں مختلف قسم کے کام مختلف لوگوں کے سپرد کیے گئے پادری، بڑے پادری اور بطریق اعظم وغیرہ کے درجے اسی وقت ترتیب دیے گئے رفتہ رفتہ ان لوگوں کی پارٹی مثل رومن سلطنت کے منظم ہو گئی یہاں تک کہ تیسری صدی کے وسط میں شہنشاہ ڈیسیاس نے کہا کہ میں روم کے پادری سے زیادہ ڈرتا ہوں بہ نسبت اس شخص کے جو میرا مخالف ہو۔ اس نے عیسائیوں پر بے حد مظالم کرنا شروع کیے اور ان کا علانیہ قتل عام شروع ہو گیا بلکہ رومن حکومت نے اپنا سارا زور خرچ کر ڈالا کہ کسی صورت سے ان لوگوں کا قطعی قلع قمع کر دیا جائے اور ایک عیسائی بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہے یہ قتل عام سنہ ۲۵۱ء سے سنہ ۳۱۱ء تک یعنی ساٹھ برس تک قائم رہا بیچارے عیسائیوں کی یہ حالت ہو گئی کہ شہر میں علانیہ طور پر اپنے آپ کو عیسائی نہ کہتے تہہ خانوں میں رہتے اور اندھیری راتوں کو آبادی سے دور کھنڈروں میں جا کر آپس میں ملتے جلتے۔ رومن حکومت نے کوئی کوشش بیخ کنی کی اٹھا نہیں رکھی لیکن اس کو شکست ہوئی اور اس نے اپنی شکست کا اعتراف بھی کر لیا یعنی سنہ ۳۱۳ء میں شہنشاہ قسطنطین نے دو سال بعد تمام احکامات واپس لے لیے۔ اور عیسائیت کو ملکی و قومی مذہب قرار دیا اور اسی تاریخ سے عیسائی مذہب کی باقاعدہ بنیاد پڑ گئی کچھ عرصہ تک تو دیوتا پرست لوگ بھی قائم رہے لیکن ان کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی برخلاف اس کے عیسائی روز بروز بڑھتے گئے یہاں تک اسی برس بعد شہنشاہ تھیوڈوسیاس نے تمام مندر بند کروا دیے اور تمام رومن سلطنت میں سوائے عیسائی مذہب کے اور کوئی مذہب باقی نہیں رہا۔

قسطنطین سے قسطنطین تک | قسطنطین کا عیسائی ہوجانا ایک بڑا واقعہ ہوا اور حقیقت یہ ہو کہ عیسائیت کی اسی دن سے دنیا بدل گئی مظالم کا دور ختم ہو کر چین کا زمانہ آگیا لیکن قسطنطین کے عیسائی ہوجانے میں بھی سیاسی مصلحت پیش نظر تھی۔ ڈیوکلیشیائی نے اس سے پیشتر یہ سوچا تھا کہ رومن سلطنت میں جو فسادات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ محض عیسائیوں کی بدولت ہیں ان لوگوں کی اگر جڑ بنیاد مٹا دی جائے تو سلطنت میں امن اماں قایم ہوجائے گا۔ چنانچہ اسی نظریے کے پیش نظر مظالم اور قتل شروع ہوا تھا لیکن عیسائی تباہ نہ کیے جاسکے اور امن کی صورت نہ نکلی تب قسطنطین نے یہ سوچا کہ رومن سلطنت میں امن و امان اسی طرح قایم ہوسکتا ہو کہ عیسائی مذہب عام کردیا جائے ان کو مٹا دینے کی اسکیم امن و امان پیدا نہ کرسکی چنانچہ سب سے پہلے اس نے خود عیسائی مذہب اختیار کیا اور چند ہی دنوں میں "پادریوں کا پادری" کہلایا جانے لگا۔

لیکن اس تبدیلی کے معنی یہ ہوئے کہ پہلی صدی عیسوی کا وہ خیال کہ سیاست الگ رہے اور مذہب الگ' اب باطل ہوگیا۔ انجیل مقدس کی یہ آیت کہ "سیزر کے سپرد وہ چیزیں کردو جو سیزر کی ہیں اور خدا کے اوپر وہ چھوڑ دو جو خدا کی ہیں" اب بے معنی ہوگئی۔ بادشاہ وقت "پادریوں کا پادری" ہوگیا۔ بڑے بڑے پادری گورنمنٹ افسر بنائے گئے بادشاہ وقت ظل اللہ بلکہ خلیفۃ اللہ سمجھا گیا جس کی اطاعت کرنا مذہبی فرض گردانا گیا۔ مختصر یہ کہ عیسائیت میں اب شان ریاست آگئی مذہب بادشاہ کے تحت میں آگیا اور اس طرح وہی حالت ہوگئی جو عیسائیت سے پہلے اصنام پرستی اور بت پرستی کے زمانہ میں تھی یعنی مذہب حکومت کے تحت میں ہوتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی اس بے دینی کی طرف رجعت کی وجہ سے متنفر ہوگئے اور اکثر دنیا چھوڑ کر راہب بن گئے اور بعضوں نے بغاوت پھیلانے کی کوشش کی اور مختلف قسم کے فرقے بنا لیے لیکن ان معمولی اختلافات کے باوجود کسی کی ہمت باقاعدہ نہ پڑ سکی کہ اس خلافت کو روک سکے اگر کسی نے (مثلاً سینٹ کرائی سٹم) اس بدعت کی مخالفت کرنا چاہی تو اُسے نہایت سختی سے دبا دیا گیا۔ الغرض پادری حضرات بھی نرم پڑ گئے اور سب کو ماننا پڑا کہ بادشاہ کے اوپر سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہو اور یہ کہ شہنشاہ

خدا کا خلیفہ ہو لیکن یہ عقاید زیادہ تر سلطنت کے مشرقی حصہ میں قایم رہے قسطنطنیہ اس رومی سلطنت کا پایہ تخت تھا لیکن اسی سلطنت کے مغربی حصہ یعنی اطالیہ۔ افریقیہ۔ اسپین اور فرانس میں قسطنطین کی وفات کے بعد وہاں کے پادریوں نے بادشاہ وقت کو پوپ سے بڑھ کر یا برابر ماننے کا طریقہ ذرا ہی چھوڑ دیا یہاں تک کہ چوتھی صدی کے آخر میں ملان کے سینٹ امبروز نے شہنشاہ ویلنٹائن سوئم کو کسی بات کے جواب میں لکھ بھیجا کہ مذہب کے معاملہ میں شہنشاہوں پر پادری حکم لگاتے ہیں نہ کہ شہنشاہ پادری پر۔ ایک صدی بعد ۴۹۴ء میں پوپ گیلیسیاس نے شہنشاہ اناسطیاس کو صاف صاف قسطنطنیہ لکھ بھیجا کہ دنیا میں دو قوتیں ہیں ایک تو آپ کی جو تمام روئے زمین پر حکومت کرتی ہے دوسری جناب باری کی جس کے احکام پادری سناتے اور بتاتے ہیں۔ رموز عرش کے معاملات میں آپ کو مذہبی احکام کا محکوم ہونا پڑے گا نہ کہ حاکم غرضیکہ یہی جھگڑا تھا جس کے باعث آخر کار مغربی اور مشرقی عیسائیت میں اختلاف عظیم پیدا ہو گیا مشرق قیصروں کے ماتحت اور مغرب پادریوں کے زیر نگیں مصروف مباحثہ رہا۔ دراصل یہ مناقشہ سینٹ اگسٹائن (۴۳۰-۳۵۴ء) کی تصنیفات سے شروع ہوتا ہے حالانکہ سینٹ کو بذات خود اس معاملہ سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور اس کا اصل مقصد ملتوں کا مٹانا تھا جو پیدا ہو گئیں تھیں لیکن اس کی تصنیف خدا کا شہر میں اس موضوع پر بحث آ گئی ہے وہ مانتا ہے کہ شہنشاہ کو عظمت آسمان سے ملی ہے اور ہر شخص کو اس کے احکام کی اطاعت کرنا چاہیے۔ مذہب کو بچانا اور بے دینی سے لوگوں کو امان میں رکھنا شہنشاہ کا فرض اولین ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مذہب کے معاملات میں شہنشاہ کو دخل دینے کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ وہ خدا کے شہر اور ارضی شہر میں نہایت بین فرق قایم رکھتا ہے اور صاف صاف بتاتا ہے کہ خدا کی باتوں کو شہنشاہ کی باتوں سے بالکل الگ رکھو حقیقت یہ ہے کہ سینٹ اگسٹائن بھی معاملات کی دو رنگی سے بہت پریشان رہا۔ سینیکا اور رواقیوں کی طرح اس کو بھی دقت پڑی کہ نیک و بد خیال اور حقیقت عقبیٰ اور دنیا ذات و قوم اہرمن و یزداں کے سوالات کو کس طرح حل کیا جائے۔

ازمنۂ وسطیٰ

لیکن چند ہی دنوں کے بعد وہ پر خطر اور جان لیوا زمانہ شروع ہوتا ہے جس نے سلطنت روما کی بنیادیں ہلا دیں اور تمام حکومت کو تہہ و بالا کر دیا۔ ۴۱۰ء ہی میں وسی گا تھ کی وحشی قوم نے جو شمالی ملکوں کی رہنے والی تھی، شہر روم کو تباہ کر ڈالا یہ شروعات تھی تھوڑے ہی عرصہ میں انھیں وحشی اور نیم مہذب قوموں نے تمام مغرب پر قبضہ کر لیا۔ انگلیس اور سیکسن قوم نے برطانیہ کو جا دبوچا ادھر فرانک اور برگنڈی والوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا وسی گا تھ اور سووی قوم نے اسپین کو ہضم کر لیا اور ونڈال قوم نے افریقہ پر تسلط جمالیا غرضکہ اس طرح حکومت روما ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور تمام مغرب ان سامی قوموں کے تحت میں چلا گیا لیکن اس کے باوجود کہ روم ہاتھ سے نکل گیا لیکن روم کی طاقت بڑھ گئی اس لیے کہ پوپ نے اپنے سفرا وغیرہ بھیج کر ان وحشی قوموں کو عیسائیت کے دائرہ میں داخل کر لیا حکومت روما بالکل ختم نہیں کی گئی تھی شہنشاہ اب بھی قسطنطنیہ میں محفوظ مشرق کی سلطنتوں کا مالک تھا لیکن برطانیہ، فرانس، اسپین اور افریقہ اب اس کے قبضہ سے نکل گئے تھے حالانکہ یہ ممالک قیصر روم کو اپنا شہنشاہ مانتے تھے لیکن صرف نام کو

ظاہرا اب بھی پاپائے روم سیزر کو اپنا دنیاوی حاکم گردانتے تھے اور شہنشاہ بھی پوپ کو اپنا ایک تحت تصور کرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں کے درمیان تعلقات عرصہ سے خراب ہو گئے تھے ایک اپنی طاقت کے بل پر معاملات مذہب میں دخل دیتا تھا دوسرا شہنشاہ کی وقعت اپنے سامنے کچھ نہ مان کر اس کی برتری کو قطعی نہ مانتا تھا۔ یہ جھگڑا آخر کار بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گیا کہ پوپ لیو سوئم نے قطعی ارادہ کر لیا کہ ان ہستیوں کا بالکل خاتمہ ہی کر دیا جائے۔ اس نے ملکہ آئرین پر جو اس وقت مشرقی سلطنت روم کی حاکم تھی یہ حکم لگایا کہ وہ اپنے شدید مظالم اور گناہ کبیرہ کی وجہ سے اس قابل نہیں ہے کہ تخت حکومت پر بیٹھے اس لیے میں شہنشاہیت ایک دوسرے شخص کو سپرد کرتا ہوں جو واقعی اس منصب کے لیے موزوں و مستحق ہے چنانچہ فرانس کا چارلس اعظم اس مرتبہ جلیل کے لیے منتخب کیا گیا اور بڑے دن کے روز ۸۰۰ء میں پوپ نے اپنے کلیسا واقع روم میں اس کی تاجپوشی کر دی۔

ہنری سوم (۱۰۳۹ء تا ۱۰۵۶ء) ایک نہایت طاقتور حکمراں تھا جو فرانس، جرمنی، اسپین اور اٹلی پر حکومت کرتا تھا اور حضرت سیزر ہی سے کم تھا۔ کیتھولک مذہب کا پابند بلکہ اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت ہی پابند تھا۔ اشاعت تعلیم و تہذیب میں نہایت سرگرمی سے کام لیتا تھا اور مدبر و منتظم اتنا کہ اس کی تمام قلمرو میں امن و امان کا دور دورہ تھا اور بالکل پرانے قیصروں کی طرح امن عامہ کی حالت تھی اس میں شک نہیں کہ وہ خود حکومت روما کا شہنشاہ بننے کی آرزو رکھتا تھا بلکہ اس بارے میں کچھ کوشش بھی کی تھی لیکن اس کے منصوبے پوپ لیو سوم کے منصوبوں سے جداگانہ تھے پہلی بات تو یہ کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مشرقی روما کا مالک بن بیٹھے وہ صرف مغربی حصہ کا مالک بننا چاہتا تھا دوسرا امر یہ کہ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتا تھا کہ اس کو حکومت پوپ سے تفویض ہو اس کا ارادہ تھا کہ ملکہ آئرین سے کچھ سمجھوتہ کر لیا جائے بلکہ ایک دفعہ تو اس نے اس سے شادی کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا لیکن وہ پوپ سے بے انتہا ناراض ہو گیا جب قبل اس کے کہ قسطنطنیہ سے کچھ سمجھوتہ مکمل ہو سکے پوپ نے اسے شہنشاہ بنا دیا حقیقت یہ ہے کہ پوپ کے اس طرز نے چارلس اور اس کی نسلوں کے لیے ایک دشواری و لاینحل گتھی ڈال دی اور کئی ناقابل حل سوالات پیدا ہو گئے۔ حکومت چارلس کو انعام میں ملی یا محض قسطنطین کی طاقت اس کی طرف منتقل کر دی گئی؟ اس نے حکومت کس سے پائی لوگوں سے کہ خدا سے؟ اگر خدا سے تو کیا پوپ کے ذریعہ؟ پوپ اور حکومت کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ شہنشاہ پوپ کا غلام تھا کہ پوپ شہنشاہ کا یا دونوں برابر تھے؟ یا ہر ایک اپنے حلقہ میں بڑا؟ ان دونوں کا کام کیا تھا؟ کیا یہ کہ وہ دونوں مل کر تمام دنیا کو فتح کر لیں یا محض مذہب کی رکھوالی اور اس کی اشاعت کی کوشش کی جائے؟ غرضکہ فوراً ہی اس قسم کے خیالات اس زمانہ کے مفکرین کے دماغ میں پیدا ہو گئے اور جن کا بہت عرصہ تک زور شور رہا۔

دو طاقتیں | اب اس صورت سے دو طاقتیں ہو گئیں شہنشاہ کی اور پوپ کی چنانچہ کیفیت یہ ہوتی تھی کہ جب کبھی کوئی طاقتور شہنشاہ سریر آرائے حکومت ہوتا مثلاً چارلس اعظم یا آٹو اول یا ہنری ہشتم تو شہنشاہیت پاپائیت پر فتح پا جاتی اور تمام نظام حکومت پر فرماں روائے عصر کا بہت زیادہ زور اور اقتدار غالب ہو جاتا اور ان لوگوں پر بھی جو چاہے پوپ ہی کے ماتحت کیوں نہ ہوں۔ مذہب سیاست کا ایک شعبہ

سمجھا جاتا اور تمام پادری حکومت کے ملازم سمجھے جاتے اور ان کا تقرر و تنزل حکومت کے ماتحت رہتا اسی طرح اگر پوپ طاقتور ہوتا مثلاً نکلس اول یا معصوم سوم تو پھر پوپ کا پایہ بلند رہتا اور حکومت ان کے زیر نگیں رہتی۔ بادشاہ و شہنشاہ تک مورد عتاب بنائے جاتے یا تخت سے اتار دیے جاتے تھے۔ پوپ اپنے عملہ کے ذریعہ سے حکومتوں کے معمولی سے معمولی شعبوں کی خبر اور نگرانی رکھتا۔

خیر یہاں تک تو غنیمت تھا کہ جو طاقتور ہوتا اس کا سکہ جمتا لیکن وقت اس وقت آن پڑتی کہ جب دونوں طاقتور ہوتے اور دونوں اپنی اپنی باتوں کے دھنی۔ ایسے مواقع زمانہ وسطیٰ میں چار پڑے (۱) شہنشاہ ہنری چہارم اور پوپ گریگری ہفتم (۲) شہنشاہ فریڈرک اول و پوپ ہادریان چہارم و اسکندر سوم (۳) شہنشاہ فریڈرک دوم و پوپ گریگری نہم و معصوم چہارم (۴) شہنشاہ لوئی چہارم و پوپ جان بست و دہم۔ ایسے مواقع پر آپس میں خوب خوب چپقلشیں چلتیں اور ہر دو جانب سے نہایت ہی پُر زور تحریری و تقریری لڑائیاں ہوتیں۔ بہتر تو یہ تھا کہ یہاں پر ان کی بحثوں کا کچھ حال لکھا جاتا تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ہر دو نے کیا کیا پہلو اختیار کیے تھے اور اپنی بحثوں کا انحصار کن اصول پر رکھتے تھے لیکن بخوف طوالت یہ بحث نظر انداز کی جاتی ہے لیکن عموماً مندرجہ ذیل تین نظریے مانے اور برتے جاتے تھے۔

بعض تو وہ لوگ تھے (اور جن کی تعداد اس وقت تک بہت زیادہ نہیں تھی) جو پرانی حالت اور پرانے طرز کو صحیح مانتے اور سراہتے کہ بادشاہ وقت (پرانے قیصروں کی طرح) کل باتوں کا حاکم ہے خواہ وہ امور سیاسی ہوں یا امور مذہبی اور یہی حالت تھی جو قسطنطین، چارلس اعظم اور فریڈرک ثانی نے اختیار کی تھی اور جس کو بہت سے اس زمانے کے فضلا نے سراہا بھی چنانچہ ڈانتے نے اپنی کتاب بادشاہت نامی (سنہ ۱۳۱۱ء) میں اس نظریہ کو تسلیم کیا ہے لیکن سب سے بڑھ کر موافقت شہر پدوا کے فاضل مفکر مارسی جیلیو نے سنہ ۱۳۲۴ء میں اپنی تصنیف "تحفظ امن" (Defence of Peace) نامی میں کی اس نظریہ کا اصول یہ تھا کہ اس نے مذہب اور سیاست کو ہم معنی گردانا اور اسی لیے شعبہ جات مذہبیہ کو شعبہ جات حکومت بنا دیا اور اس طرح اس قسم کی عیسائیت نہ اخلاقی رہی نہ روحانی۔

دوسرے قسم کے وہ لوگ تھے جو اعتدال پسند کہے جا سکتے ہیں ان کے نزدیک بادشاہ وقت

اور پوپ عصر کا درجہ بالکل برابر کا تھا۔ نہ یہ اس سے بڑھ کر نہ وہ اس سے بڑھ کر اور ہر ایک کا میدان عمل جدا گانہ تھا اس لیے ایک کو دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی مجاز نہیں اس قسم کا نظریہ عموماً ان کمزور بادشاہوں کا ہوتا جو پوپ کی سختی سے گھبرا کر آخر اتنا ہی ماننے پر اتر آتے تھے اسی طرح کمزور قسم کے پوپ بھی اس قسم کے اعتدال کو پیش نظر رکھتے جب وہ دیکھتے کہ ان کی دال کچھ گلتی نہیں نظر آتی ہو چنانچہ اگر فریڈرک اول نے سنہ ۱۱۵۲ء میں ایک وقت پوپ وقت کو لکھا "خدا نے روئے زمین پر دو قوتیں پیدا کی ہیں حکومت اور پاپائیت" تو اسی طرح پوپ ادریان چہارم نے دوسرے وقت بادشاہ وقت کو لکھا ہے "پیٹر لکھتا ہے خدا سے ڈرو اور بادشاہ کی عزت کرو اس لیے جو شخص یہ کہے کہ حکومت پوپ کے ماتحت ہے وہ پیٹر کی مخالفت کرتا ہے اور جو مخالفت پیٹر کی کرتا ہے وہ گنہگار ہے"

لیکن اعتدال بھی زمانہ وسطیٰ میں کچھ زیادہ نہ مانا گیا بلکہ زیادہ تر مقبول وہی نظریہ سنہ ۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک رہا کہ پوپ شہنشاہ سے علی الافضل اور برتر ہے اور یہ کہ حکومت شہنشاہ کو پوپ ہی سے تفویض ہوتی ہے۔ اس نظریہ والوں کے نزدیک خدائے تعالیٰ نے آسمان میں دو روشنیاں پیدا کی ہیں ایک تو سورج ایک چاند۔ ایک دن کو روشنی دیتا ہے ایک رات کو۔ اسی طرح اس نے دنیا پر دو قوتیں لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے بھیجیں ایک تو بڑی قوت پوپ جو روح پر حکومت کرتی ہے دوسری کمتر قوت بادشاہ جو جسم پر حکومت کرتا ہے اور جس طرح کہ ماہتاب اپنی روشنی آفتاب سے حاصل کرتا ہے اور اس سے کم درجہ پر ہے اسی طرح بادشاہ بھی اپنی بادشاہت پوپ سے حاصل کرتا ہے اور اس سے کم درجہ پر ہے۔

غرضکہ تمام زمانہ وسطیٰ میں یہی منطق جاری اور ساری رہی اور لا تعداد دلائل انجیل سے الٹے سیدھے نکال کر پیش کیے جاتے آفتاب اور ماہتاب کی تشبیہیں چلتیں۔ روح کی جسم پر فوقیت والا مضمون لاکھوں دفعہ دہرایا جاتا اس طرح ایک طومار مچا رہتا تھا جس کی کوئی حد نہیں تھی موجودہ زمانہ میں اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ جب ہندوستان میں کسی دو مذہبوں یا دو فرقوں کے درمیان مناظرہ زبانی یا تحریری ہو جاتا ہے اور ان گنت بے محل حوالہ جات کتابوں سے دیے جاتے ہیں بغیر کسی مطلب یا فائدہ کے بالکل اسی طرح ان لوگوں کی بھی حالت تھی۔

زمانہ وسطیٰ کے مفکرین | اس زمانہ میں بھی بحث عام تھا لوگوں نے اسی مسئلے کی طرف زیادہ توجہ کی اس کے علاوہ دیگر مسئلے بھی تھے مگر زیادہ تر تمام مسئلے مندرجہ بالا بحث ہی سے پیدا ہو گئے تھے پوپ کی برتری کو ماننے اور منوانے والے چار مشہور شخص گزرے ہیں۔ (۱) سینٹ برنارڈ (سنہ ۱۱۵۳ء سے ۱۰۹۱ء) کلرواکا رہنے والا تھا روح کی برتری جسم پر دکھاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک بات یہ بھی کہتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ پوپ حضرات محض روح کی نگہداشت اور رکھوالی کریں جسم اور نظام جسم یعنی امور حکومت سے قطعی غرض وغایت نہ رکھیں (۲) جاآن باشندہ سالسبری (سنہ ۱۱۱۰ء سے ۱۱۸۰ء) یہ نہایت قابل شخص تھا علم سیاست پر ایک نہایت فاضلانہ مقالہ لکھا اور ایک مکمل نظریہ حکومت کے متعلق قایم کیا جس میں اس کو جسم انسانی سے بالتشریح مناسبت اور مطابقت دکھلائی ہے۔ رواقیت کا بھی بہت کچھ رنگ ہے اس کے ساتھ اس کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر بادشاہ مذہبی لوگوں پر ظلم کرتا ہے یا پریشان کرتا ہے یا نہایت بے ادبی سے قوانین مذہبی کو رد کرتا ہے اور قطعی ان پر عمل درآمد نہیں کرتا تو ایسا بادشاہ لایق گردن زدنی ہے (۳) طامس اکیونس زمانہ وسطیٰ کا مشہور ترین اور لایق ترین فلاسفر ہے۔ اس نے جاآن کی اس رائے کی تو سختی سے مخالفت کی کہ بادشاہ کو مار ڈالنا چاہیے لیکن اور باتوں کو مان لیا قوانین کی اس نے چار قسمیں کیں اول تو وہ جو کائناتی ہیں یعنی جس کے اصول پر کائنات عالم کا نظام چل رہا ہے دوم مذہبی۔ سوم قدرتی۔ چہارم انسانی۔ قدرتی قانون کو تو رواقیوں کی طرح خدا کا قانون مانتا ہے لیکن سب سے بڑھ کر بات اس نے یہ کی کہ ارسطو کی سیاسیات کو پھر از سر نو زندہ کیا اور اس کے مسلوں کو عیسائیت کے پہلو میں لاکر اس طرح بیان کیا گویا ارسطو اور سینٹ آگسٹین کے نظریے بالکل ملاکر رکھدیے ہوں اکیونس کی تصنیفات زمنہ وسطیٰ میں واقعی سب سے زیادہ اہم اور لایق غور ہیں (۴) ردمیناس (سنہ ۱۲۴۷ء سے ۱۳۱۶ء) اکیونس کا ایک شاگرد تھا حالانکہ اس نے اپنے استاد کی تعلیمات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا لیکن اتنا ضرور کیا کہ کوزے میں دریا بند کر دیا یعنی جو کچھ اکیونس نے بتلایا تھا اس کو ایک مختصر لیکن جامع تصنیف میں جمع کر دیا۔

نشاۃ الثانیہ اور اصلاح مذہب

مارسی جیلیو اور ویکلف | چودھویں صدی کے آغاز سے ملکوں اور بادشاہوں کے نقطۂ نظر میں ایک نئی تبدیلی ہوئی پوپ اور بادشاہ والی جنگ تو جیسی تھی قائم رہی لیکن اب قومیت کا سوال ہر ملک کے فرماں رواؤں میں پیدا ہونے لگا پوپ کی حیثیت اب تک بین الاقوامی رہی تھی وہ جو حکم دیتا تھا وہ تمام یورپ اور تمام عیسائیوں کو ماننا ناگزیر تھا لیکن اس ملکی اور قومی سوال پیدا ہو جانے سے ہر ملک کا بادشاہ اپنے ملک میں اپنی حکومت کا دعویٰ کرنے لگا اور مثل قیصر کے ہر فرمانروا یہ چاہنے لگا کہ پوپ کی کسی قسم کی شارکت کے بغیر اس کا ہی حکم اس کی قلمرو میں مانا جائے اس دست کو سراہنے والے بہت سے ارباب رائے پیدا ہو گئے۔ ان میں جان (۱۳۲۷ء) باشندۂ فرانس پیئر دوبوائس (۱۲۵۵ء تا ۱۳۱۲ء) اور جان ویکلف (۱۳۲۰ء تا ۱۲۹۶ء) باشندۂ انگلستان خاص کر قابل ذکر ہیں خصوصاً سب سے بڑھ کر پڈوا کا مفکر مارسی جیلیو (۱۲۷۸ء تا ۱۳۴۳ء) تھا جو ایک وقت سیاسی مفکر، طبیب، قانون داں، سپاہی اور شہر میلان کا پادری تھا جس کو اپنی تصانیف اور عقائد کی وجہ سے پادری کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا تھا ایک مرتبہ شہنشاہ لوئی چہارم نے اس کو سینے ۔ ۔ ملانہ میونچ میں بلایا کہ وہ اس کو پوپ جان بست و دوم کے خلاف بحثوں میں مدد دے لیکن اس نے بجائے مدد دینے کے ایک اور بحث کا پہلو نکالا وہ یہ کہ شاہان زمین ظل اللہ یا خلیفۃ اللہ ہرگز نہیں ہیں پاپائیت کی حکومت تو خیر کوئی چیز ہی نہیں لیکن بادشاہ کو بھی حکومت خدا سے تفویض نہیں ہوتی اس کے بندے ہی اس کو دیتے ہیں حکومت بادشاہ کو قوم سے ملتی ہے نہ کہ خدا سے۔ دراصل یہ نظریہ عہد روما کا تھا جو اس وقت چودھویں صدی کے زمانہ میں اس قدر نیا معلوم ہوا کہ پاپائیت نے فوراً اس خیال کو قابل لعنت قرار دیدیا اور حکومت نے پرانا کھکھڑ نکالدیا لیکن یہ نظریہ لوگوں کے کانوں میں گونجتا رہا یہاں تک کہ نشاۃ الثانیہ کے لوگوں نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔

مارسی جیلیو کی تصنیف . (۱۳۲۴ء) تین خاص باتوں پر مشتمل ہے (۱) مملکت (۲) مذہب
(۳) ان دونوں باتوں کا تعلق۔ اس کے نزدیک حکومت کا مقصد امن و امان قایم رکھنا ہے اور امن
امان کے لیے بادشاہت بہتر ہے بہ نسبت جمہوریت کے لیکن بادشاہوں کو اس سے یہ نہ سمجھ لینا
چاہیئے کہ ان میں کوئی مافوق الفطرت قوت ودیعت کر دی گئی ہے انھیں حکومت تو رعایا ہی سے
ملی ہے اور اسے وہ اسی وقت تک استعمال کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ مقبول خلایق ہیں اس کے
قوانین لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں جنھوں نے اسے منتخب کیا ہے۔ (۲) رہا مذہبیت کا سوال تو
یہ پادری لوگوں کی تنہا ملکیت نہیں ہے اس میں تمام عیسائی مرد و عورت شامل ہیں اسی لیے اس
کی ذمہ داری صرف چند پادریوں یا محض ایک پوپ پر عاید نہیں ہوتی اس کی ذمہ دار ایک
ایسی عام کونسل ہو جس میں پادری حضرات اور عوام الناس سب ہی شامل ہوں اور جس میں وہی
باتیں پاس ہوں جو حق پر ہوں (جس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی اس کی طرفدار ہو)
پادری حضرات کا کام یہ ہے کہ وہ محض روحانی باتوں کی دیکھ بھال کریں امور مملکت سے کوئی
تعلق نہ رکھیں اور اپنے قبضہ میں جائدادیں بھی نہ رکھیں کیونکہ اس طرح وہ دنیا کے کتے ہو جاتے
ہیں اور روحانی احکامات کے برلانے میں خلل پڑتا ہے پوپ محض اس کونسل کا ایک طرح کا ایجنٹ
ہے جس کے کوئی خصوصی اختیارات نہیں نہ کسی عیسائی فرد پر اس کو کسی طرح کی فوقیت ہے (۳) مملکت
اور مذہب کے تعلقات کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ دونوں میں لوگ تو وہی ہوتے ہیں البتہ ان کی
تقسیم دو طرح سے ہوتی ہے روحانی طاقت بلاشبہ عقبیٰ میں ضرور جسمانی طاقت پر فوقیت
رکھے گی لیکن اس دنیا میں جسم فوقیت رکھتا ہے اس لیے اس دنیا میں حکومت کی طاقت
روحانیت یا مذہبیت پر فوقیت رکھتی ہے مارسی جیلیو دراصل ایک انقلابی مفکر تھا جسے فطرت
نے وقت سے دو سو سال پہلے پیدا کر دیا۔

میکاولی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) اور مارسیجلیو کے درمیان کا زمانہ نشاۃ الثانیہ کہلاتا ہے اس
دوران میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو گئیں۔ حکومت اور پاپائیت دونوں کا اقتدار قریب قریب

بالکل کالعدم ہوگیا اور اس کے بجائے موجودہ قومی مملکت کا تخیّل کار فرما ہوگیا۔ اسپین فرانس اور انگلینڈ میں نہایت طاقتور بادشاہتیں قایم ہوگئیں جن کے پیش نظر محض اپنے ملک کا مفاد تھا۔ اطالیہ اور جرمنی کی حکومتیں کئی چھوٹے چھوٹے صوبوں میں تقسیم ہوگئیں اور ان دونوں ملکوں کی حالتیں نہایت ابتر ہوگئیں۔ فنون جنگ میں ایک نئے قسم کی ایجاد ہوئی یعنی بارود جس نے طرز جنگ کا بالکل نقشہ ہی بدل دیا۔ پریس کی ایجاد ہوئی، امریکہ کا انکشاف ہوا۔ نظام کوپرنیکی دریافت ہوا جس کی تحقیق ہو کہ نظام کائنات لامحدود ہے اور بطلیموسی خیال کی بنا پر محدود نہیں علم تکوین کائنات (قسمو غرافیہ) زمانہ وسطیٰ والا بالکل باطل ثابت کر دیا گیا اور انھیں ایجادات و اختراعات کی نئی روشنیوں میں زمانہ وسطیٰ کا اندھیرا رفتہ رفتہ بالکل غائب ہوگیا اور صبح درخشاں کا وہ مطلع سپید افق زمانہ پر آشکارا ہوا جسے ہم نشاۃ الثانیہ (یا دور جدید) کہتے ہیں۔

میکاولی ایک چھوٹی لیکن نہایت ہی اعلیٰ جمہوریہ فلارنس (اطالیہ) کا رہنے والا تھا شروع ہی سے اس کے دل و دماغ پر اطالیہ کی ابتری اور بدحالی کے گہرے نقوش جمنے لگے اٹلی کی حالت اس وقت اس قدر ناگفتہ بہ تھی کہ فرانس یا اسپین جس وقت چاہتا اس پر نہایت آسانی سے قبضہ کر لیتا یا دونوں کی آویزش میں یہ بالکل خاک میں ہی مل جاتا۔ ان تمام خطرات کو میکاولی نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور نہایت ہی دل و جان سے اس نے سوچنا شروع کیا کہ ایسی کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جن کی بدولت اطالیہ متفق ہو جائے، اور اس قدر مضبوط ہو جائے کہ کوئی دشمن اس پر حملہ کرے تو کم از کم یہ اپنی مدافعت کر سکے ساتھ ہی اس کے کون ایسی صورتیں اختیار کی جائیں جس سے تمام اطالیہ میں امن و امان قایم ہو سکے اور اٹلی تہذیب و تمدن، ادب و فنون لطیفہ میں پیش پیش ہو جائے۔ ان تمام منصوبوں کو ذہن میں رکھ کر اس نے تین کتابیں تصنیف کیں (۱) فن جنگ (۲) مقالات (۳) حکمراں۔ میکاولی ایک عملی سیاست داں تھا نہ کہ محض تخیلی چنانچہ اس کی تصانیف فن حکومت پر ہیں نہ کہ نظریہ مملکت پر۔ پہلے وہ خود سوال کرتا ہے کہ اطالیہ کی تباہی کے کیا اسباب ہیں اور جن کا وہ خود ہی جواب دیتا ہے کہ چار ہیں (۱) نااتفاقی

(۲) بدامنی (۳) بے چارگی (۴) فرانسیسی، ہسپینی جرمن اور سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کا برابر حملہ کرتے رہنا اس کے بعد پھر ان حالات کا علاج سوچتا ہے اس کے نزدیک پہلی بات سب سے ضروری یہ ہے کہ ایک مضبوط قومی فوج ہو اور دوسری بات یہ کہ اطالیہ ایک مضبوط قومی مملکت بنادی جائے لیکن موجودہ حالتوں میں یہ کس طرح پیدا کیا جا سکتا تھا اس کے نزدیک اس کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ ایک نہایت ہی خود مختار، بے رحم اور بغیر کسی کی رو رعایت کرنے والا حکمراں ہونا چاہیے اگرچہ خود میکاؤلی ایک جمہوریت پسند شخص تھا اور اس کو قطعی امید تھی کہ جب اطالیہ پرامن اور متحد ہو جائے گا تو جمہوریت کا دور دورہ ہو جائے گا لیکن جمہوریت اسی وقت کارآمد اور ممکن ہو سکتی ہے جب قوم اس قابل ہو اور اس کی خواہش بھی ہو کہ اپنے ملک کی حالت درست کرے اور اپنے ملک کا انتظام خود کرے میکاؤلی کے وقت کی قوم (یعنی سولھویں صدی کی) نہایت ہی ذلیل اور ابتر حالت میں تھی ایسی صورت میں میکاؤلی کے خیال میں اطالیہ کو فی الحال ایک نہایت جابر بادشاہ کی ضرورت تھی وہ جس قدر ظالم ہو اسی قدر اچھا ہے ایک ظالم بادشاہ کے بغیر اس وقت کی حالت سدھر نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس حکمراں کا مقصد اولیں یہی ہونا چاہیے کہ اطالیہ کو متحد کر دے اس کی حفاظت کے لیے ایک قومی فوج تیار کرے غیر ملکیوں کا قطعی اخراج کر دے اور تمام اطالیہ میں خوش حالی، فارغ البالی پیدا کر دے محض قوم کی خاطر یہ منفعت اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس بات کے خیال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ کس طرح وہ فوائد پیدا کیے جا رہے ہیں۔ یہ مقاصد اُن طریقوں سے حاصل ہو سکتے ہوں جو عام طور پر اور اخلاقی نقطہ نظر سے اچھے سمجھے جاتے ہیں تو کیا کہنا، فبہا۔ اگر یہ مقاصد ان طریقوں سے نہ حاصل ہو سکیں تو ان طریقوں کو استعمال کرنے میں کوئی ضمیری ملامت قبول نہیں کرنی چاہیے جو عام طور پر اخلاقی نقطہ نظر سے برے اور خراب کیے جاتے ہیں۔ اصل چیز مقصد ہے ہم نے کس طرح اسے حاصل کیا یہ قابل لحاظ نہیں۔ میکاولی پہلا شخص تھا جس نے سیاست اور اخلاق کو الگ الگ کر دیا۔

اصلاح مذہبیہ | لیکن میکاولی نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ وہی خود غرضی والے اصول اپنی ذات اور اپنے ارادوں کے حصول کے لیے بھی استعمال کیے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلاوطن کر دیا گیا اور نہایت حسرت اور ذلت کی حالت میں مرگیا۔ اسی دوران میں صلاح مذہبیہ کا چرچا شروع ہوگیا جس نے پاپائیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا حالانکہ اس اصلاح کا خاص کر سب سے اہم پہلو مذہبی تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اہم سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں بھی بہت کافی ہوگئیں یہ تاخسانہ اصل میں قومی مملکت کے تخیل کی پیداوار کہا جا سکتا ہے جس نے خارجی دباؤ (پاپائیت) کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یا عوام الناس کا کلیائی جائداد پر حملہ یا مظلوموں کی ظالموں کے خلاف بغاوت یا عامی کی انکار نقل و اثبات عقل وغیرہ کے ہنگامے برپا کردیے اس اصلاح کے ضمن میں کئی اہم سیاسی مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے ایک تو زمانہ وسطی والا حکومت و پاپائیت کے سوال و جواب نئے ڈھنگ پر اٹھے دوسرا مسئلہ مذہبی آزادی کا تھا۔

مذہبی آزادی کا سوال یوں پیدا ہوا کہ پوپ تھیودوسیس اول کے زمانے سے الحاد و بغاوت کے جرایم ہم معنی قرار دیے گئے تھے اور دونوں کے لیے سزا ایک ہی تھی اب جب پاپائیت کا شیرازہ ہی بکھر گیا اور الحاد تو خیر الحاد نئے نئے فرقے قایم ہوگئے تو حکمراں کے لیے یہ بڑا ٹیڑھا سوال آپڑا کہ رعایا کے لیے کون سے مذہبی اعتقادات جائز اور مناسب قرار دیے جائیں۔

مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء تا ۱۵۴۶ء) جو اس نئی اصلاح کا علمبردار تھا نہایت بادشاہت پسند تھا وہ اس امر پر خاص زور دیتا تھا کہ رعایا اپنے بادشاہ کی اطاعت اور تابعداری کیا کرے اس کے نزدیک مملکت کا حق مذہب سے بالا تھا اس لیے مذہبی امور کا انتظام حکومت کے سپرد ہونا چاہیے یہ اسی حالت میں درست ہے جب بادشاہ وقت نہایت عادل منصف مزاج اور رعایا پرور ہو اگر بادشاہ ظالم ہے اور نالایق تو رعایا کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ ایسے بادشاہ کی اطاعت کرنے سے قطعی انکار کردے اور

علم بغاوت اس کے خلاف بلند کر دے ایسی صورت میں معاملات مذہب میں بادشاہ وقت کو کوئی اختیار نہ رہے گا اور یہ بالکل الگ ہی شعبہ ہو جائے گا بادشاہ کی دسترس سے بالکل باہر۔ اصلاح مذہبیہ میں حق بغاوت خاص بات ہے اس کے علاوہ مذہب اور حکومت کی علیحدگی بالکل ویسی ہی ہوگی کہ "خدا کے سپرد وہ کام چھوڑ دو جو خدا کے ہیں اور سیزر کے سپرد دہ جو سیزر کے ہیں"

جان کالوین (۱۵۰۹ء تا ۱۵۶۴ء) بھی لوتھر کی طرح امن و امان عامہ کا نہایت دلدادہ تھا لیکن اس کے خیالات لوتھر سے جداگانہ تھے۔ اس کے نزدیک روحانیت یا مذہب حکومت سے زیادہ اہم تھا۔ بادشاہ شہزادگان وصوبہ داران وغیرہ محض خدا کے ہاتھ کہے جا سکتے ہیں اس کے نزدیک بادشاہت کے بجائے جمہوری گورنمنٹ زیادہ مناسب گورنمنٹ ہے کیونکہ عام طور پر بادشاہ پرلے سرے کے بیوقوف ہوتے ہیں یا اول نمبر کے اوباش۔ اگر بجائے لوگوں کی جمہوریت قایم ہو جائے گی تو ملک کے درد کا احساس رکھیں گے اور اچھی طرح مناسب طرز کی حکومت کریں گے مخالفت اس قسم کی گورنمنٹ کی کم ہو سکے گی کیونکہ خود لوگ (جمہور) ہی تو حکومت کریں گے تو مخالفت کون کرے گا لیکن غلطی کا امکان ایسی جمہوریہ سے بھی ہے ایسی گورنمنٹ بھی اگر غلطیاں اور بے جا مظالم کرے تو دوسرے لوگوں کو بغاوت کرنے کا حق قطعی حاصل ہے۔ اس حق بغاوت کو کالوین کے پیروؤں نے نہایت ہی بڑھایا خصوصاً فلپ مارنے (فرانسیسی)، اور جارج کینان (اسکاٹ لینڈ) وغیرہ کا تو یہی نظریہ ہو گیا کہ بغاوت ایسی حالت میں ضرور کی جائے وہ لوگ اس بات کے لیے ایک حد تک مجبور تھے وہ برابر آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے کہ انگلستان میں ملکہ میری (ٹیوڈر)، اسکاٹ لینڈ میں ملکہ میری (گائز) اسپین میں فلپ ثانی اور فرانس میں چارلس نہم برابر کالونیوں پر (یعنی بادشاہت کے مخالفین) ناگفتہ بہ مظالم کر رہے تھے۔ خصوصاً ۱۵۷۲ء والے قتل عام نے تو بے انتہا بادشاہت کے خلاف مواد پیدا کر دیا۔

صرف کالوینی لوگ ہی اس ستم و مظالم بے جا کا شکار نہیں ہو رہے تھے بلکہ وہ فرقہ یعقوبی بھی مظلوم تھا جو پروٹسٹنٹ ممالک میں کیتھولک مذہب کی موافقت میں پروپیگنڈا کر رہا تھا وہاں کے پروٹسٹنٹ بادشاہوں نے اس فرقہ کو اور کیتھولک والوں کو نہایت بری طرح تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ اس طرح فرقہ یعقوبی بادشاہت کے خلاف ہوگیا (کیتھولک رویہ کے خلاف) اور اس نے یہ نظریہ بھی قایم کرلیا کہ حکومت بادشاہ کو خدا کی طرف سے نہیں بلکہ رعایا ہی کی طرف سے تفویض ہوتی ہے اس لیے رعایا ہی اس سے حساب لینے کی ذمہ دار ہے۔

بادشاہت پسند طبقہ | بادشاہت کے خلاف کالوینی اور یعقوبی فرقوں نے جو قیامت اٹھا رکھی تھی اس کے ماسوا بادشاہوں کے خفیہ قتل نے ہر شاہی فرد کے دل میں جان کا خوف پیدا کردیا چنانچہ اس وقت یورپ کا کوئی بادشاہ اپنی جگہ مطمئن نہ تھا۔ ولیم آف آرینج پانچ دفعہ بچ بچ جانے کے بعد آخر کار ایک سازشی جرآرڈ نامی کے ہاتھوں مار ڈالا گیا انگلستان کی ملکہ الزبیتھ نے ایک دفعہ ایک فرانسیسی سفیر سے کہا کہ اس نے پندرہ ایسے اشخاص کو گرفتار کیا ہے جو اسپین کی طرف سے اسے قتل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ فرانس کا ہنری چہارم اُنیس باقاعدہ حملوں سے بچ چکا تھا لیکن بیسویں دفعہ سنہ ۱۶۱۰ء میں ریولاک کے خنجر سے مقتول ہوگیا غرضکہ ان کامیاب حملوں نے پوپ و کیتھولک خصوصاً یعقوبی جماعت کو بے انتہا مسرور کردیا یہاں تک کہ جب فرانس میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا قتل عام ہوا تو پوپ نے مارے خوشی کے شکرانہ کی نمازیں پڑھوائیں اور بادشاہ فرانس نے اس کو مبارکباد لکھ بھیجی۔

ایسی ابتری کی حالت میں جبکہ طرح طرح کے مظالم بنی نوع انسان پر زیادہ تر مذہبی ارکان کے اشاروں پر ہو رہے تھے اور صدہا بے گناہ انسانوں کا خون طرح طرح کے بہانوں کی آڑ میں بہایا جا رہا تھا سیاست ایک جمود کی حالت میں رہ گئی آخر کار چند ایسے گروہ قایم ہوئے جنھوں نے ایک طرف تو مذہبی ابتری اور بے راہ روی کی حالت کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا اور دوسری طرف چند ایسے سیاسی اصول قایم کیے جو اُس زمانے کی

ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے بے حد ضروری تھے جین باڈن (۱۵۳۰ء۔۱۵۹۶ء) ان اصول و
اعتقادات کا بانی مبانی تھا۔ یہ ایک فرانسیسی پروٹسٹنٹ تھا جو اتفاق کہیے یا خوش قسمتی
فرانسیسی قتل عام سے کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلا اور اس لیے بچ گیا۔ مذہب میں اس قدر تعصب
سے کام لینے کے وہ سخت خلاف تھا اپنی ایک تصنیف میں محض اپنے زمانہ کا رنگ
دیکھتے ہوئے اور امور سیاست میں عملی آسانی کے لیے اس نے یہ تجویز کیا کہ ہر شخص کو
مذہبی آزادی دے دی جائے اور حکومت اس میں کسی قسم کا تعرض نہ کرے۔ اس نے
۱۵۷۶ء میں ایک دوسری کتاب لکھی جو اس قدر جامع و مانع تھی کہ ارسطو کی سیاسیات
کے بعد کوئی اور دوسری تصنیف اب تک اس قدر جامع و مانع نہیں نکلی تھی۔ اس میں اس
نے قومی مملکت کے بنیادی اصول بتائے اور حق مداخلت اور حق بغاوت کو بالکل مسترد
کر دیا۔ قوانین کو اعلیٰ ٹھہرایا اور معاملات مذہبی کو یکسر حکومت کے ماتحت ٹھہرایا۔ مارسی جلیو
کے ۲۰۰ سو پچاس برس کے بعد اب یہ دوسرا شخص تھا جس نے امور مذہبی کی امور سیاسی
کے سامنے کوئی حقیقت نہیں سمجھی۔ اس تصنیف کا اس کے زمانے پر اور اس کے مابعد
زمانے پر بے انتہا اثر پڑا۔ اس نے سیاسی تفکرات کا رخ بدل دیا لیکن باڈن ایک
آزاد خیال آدمی تھا اور بے حد عقلمند چنانچہ اس زمانہ میں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوا متوسط
طبقہ نے بھی جو اس کے موافق تھا اس قدر آزادیٔ خیال اور حد سے زیادہ عقلی نظائر کو پسند
نہیں کیا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس نے مملکت کے متعلق تو بہت کچھ لکھا لیکن بادشاہ
کے متعلق بہت کم۔ اسی طرح بغاوت کے نقصانات تو بہت دکھائے لیکن بادشاہ کشی کے
گناہ عظیم پر کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ سیاست کے متعلق بہت زیادہ لکھا لیکن مذہب کے
متعلق بہت کم حالانکہ زمانہ کا تقاضا یہ تھا کہ ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیا جاتا جو اس وقت کے
حالات کے زیادہ متقاضی تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرا مفکرین کا گروہ پیدا ہو گیا جس نے بادشاہ
کے حق خداداد پر زور دینا شروع کیا۔ دراصل یہ نظریہ تو ازمنۂ وسطیٰ میں پوپ اور بادشاہوں

کی مخالفت میں پیدا ہو گیا تھا۔ ڈانتے نے بھی اس نظریہ کو سراہا تھا کہ سیزر کو حکومت خدا کی طرف سے ملی تھی لیکن اب قومی بادشاہوں نے خود اور ان کے معاونین نے اسی نظریہ کو ایک ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں سراہنا شروع کیا کہ (۱) بادشاہت ایک ایسا طریقۂ حکومت ہے جو مجوزۂ خدائے تعالیٰ ہے (۲) اس کی ابتدا نظام پدریت سے ہوئی جیسا کہ پرانی انجیل میں مذکور ہے (۳) یہ نسلاً بعد نسل چلتی ہے (۴) یہ عہدہ بادشاہوں کو خدا کی طرف سے ملتا ہے اس لیے وہ اپنی حکومت کے لیے جواب دہ صرف خدا کے سامنے ہو سکتے ہیں (۵)۔ رعایا کا فرض یہ ہے کہ نہایت خاموشی سے اور بلا عذر اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ ان تخیلات کے علمبرداروں میں سے ایک ولیم بارکلے اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا جس نے فرانس میں اقامت اختیار کر لی تھی دوسرا جیمس اوّل (باشندۂ اسکاٹ لینڈ) بادشاہ انگلستان جو نہایت قابل اور پڑھا لکھا بادشاہ تھا اُس نے کئی کتابیں بادشاہت کی موافقت میں لکھیں مسمیٰ "آزاد بادشاہت کا سچا قانون" یا "حقوق سلطان کی حمایت" اس کے علاوہ کئی اور تصانیف اور تقاریر میں اس نے نہایت جوش و خروش سے بادشاہت کی موافقت کی ہے۔ اس کے بعد سترہویں صدی میں ذرا اور نرم لہجہ میں سر رابرٹ فلمر نے ۱۶۴۲ء میں "پدریت" نامی ایک تصنیف طبع کرائی اگرچہ یہ بہت معمولی کتاب تھی لیکن کچھ دنوں بعد جان لاک نے اس کی مخالفت کر کے اسے مشہور کرا دیا۔

باوجود اس کے خدا داد بادشاہت کے اس نئے نظریہ کو کافی تعداد میں لوگ قبول نہ کر سکے یہ مان لینا کہ ہر صحیح النسل بادشاہ ابراہیم کی اولاد ہی سے ہو گا اور یہ کہ دنیا میں ہر طرح کی حکومت پدریت یا کنبہ ہی سے پیدا ہوتی ہے ذرا مشکل کام تھا بہت سے لوگ اس نظریہ کے خلاف ہو گئے ان میں خاص طور پر قابل الذکر ٹامس ہابس ۱۵۸۸ء ۱۶۷۹ء تھا اور اس امر کا متمنی ہونے کے باوجود کہ ملک میں امن و امان قایم ہو جائے حق بغاوت کا وہ بھی جیمس اول کی طرح خلاف تھا۔ چونکہ انگلستان میں اب خانہ جنگیاں

شروع ہوگئیں تھیں اس لیے یہ بھاگ کر فرانس چلا آیا اور ۱۶۵۱ء میں "لیوتھین" نامی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے بادین کے قومی ملکیت کے نظریہ کی بڑی موافقت کی اور لکھا کہ معاہدۂ ساجی کی برقراری کے لیے ایسی ہی گورنمنٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے بادین کے تصور قانون کی بھی بڑی موافقت کی اور نہایت جوش وخروش سے اس بات کو سراہا کہ حکومت کے تحت میں ہر شے ہے خواہ مذہب ہو یا اور کچھ۔

(باقی)

سویٹ روس کی خارجی پالیسی

(گزشتہ سے پیوستہ)

روس جرمن جنگ تک | روس فنلینڈ صلح کی شرایط سے دنیا کی تمام اقوام پر سویٹ کے خلوص اور غیر ملوکی پالیسی کا سکہ بیٹھ گیا۔ سویٹ نے دکھلا دیا کہ سویٹ نظام میں ملوکیت کو کوئی دخل نہیں خود فنلینڈ میں پرانی حکومت سے لوگ علیحدہ ہونے لگے اور ایک "سویٹ کے ہمدردوں کی لیگ" قایم ہوئی جس میں ملک کے نوجوان شامل ہوئے۔

فنلینڈ سے صلح کے بعد سویٹ کی خارجی پالیسی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے ابھی تک سویٹ اپنے تحفظ کے لیے ہی کوششیں کر رہا تھا لیکن سنہ ۱۹۴۰ء اور خاص کر شروع سنہ ۱۹۴۱ء میں وہ دوعملی پالیسی پر عامل تھا۔ ایک تو اپنے تحفظ کے لیے بلقان اور مشرقی یورپ میں اپنا اثر قایم کرنا اور دوسرے نیم فاشی ممالک مثلاً رومانیہ، ہنگری وغیرہ میں جرمنی کا اثر کم کرنا اور جرمنی کو دوسری طرف مشغول رکھنا تاکہ اس کا اثر مشرقی یورپ میں نہ بڑھے یہ پالیسی ہرگز ملوکی نہ تھی سویٹ روس مشرقی یورپ میں اپنا اقتدار محض اس لیے قایم کرنا چاہتا تھا تاکہ جرمن پانچویں کالم کے لوگ ان ممالک کو اپنے کودنے کا اڈہ نہ بنالیں جہاں سے سویٹ پر حملہ نہ کردیں سویٹ کو اس کا موقع بھی مل گیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء کا موسم گرما یورپ کے لیے بہت سخت تھا جرمنی نے ہالینڈ، ڈنمارک اور بلجیم ختم کردیے ناروے پہلے ہی ختم ہوچکا تھا وہاں پانچویں کالم کے لوگوں نے غداری کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے۔ انگریزی فوجیں واپس ہوچکی تھیں اب فرانس کی باری تھی فرانس کا شمار دنیا کی بڑی طاقتوں میں تھا فوجی اور مالی حیثیت سے بھی فرانس بہت بڑھا ہوا تھا۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی سرمایہ پرستی نے دنیا کی لوٹ کھسوٹ میں بہت بڑا حصہ لیا تھا لیکن اگر کسی چیز کی کمی تھی تو عوام میں ایک نئے جذبہ کی فرانس میں فاشی پروپگینڈہ نازیوں نے نہیں بلکہ خود فرانس کے سرمایہ پرست طبقے نے کیا۔

لاوال کے گزشتہ کارنامے سب پر عیاں ہیں. فرانس کا سرمایہ پرست جرمن فاشزم کے آگے سرجھکانے میں عار نہ سمجھتا تھا ہاں فرانسیسی عوام کو طاقت دینا اس کے مفاد کے خلاف تھا۔یہی فاشزم کی جڑ ہے فرانس کو شکست ہو گئی لیکن وہ دوسو خاندان جو وہاں حکومت کرتے تھے اب بھی محفوظ ہیں ہٹلر نے اپنے اقتدار میں آنے سے قبل اپنی مجلس شوریٰ کی ایک میٹنگ میں کہا تھا" دیکھو روشننگ (نازی پارٹی کا ایک زبردست کارکن جو بعد میں اپنی جان بچا کر جرمنی سے بھاگ آیا) سرمایہ پرست طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا جس وقت ہماری فوجیں فرانس پر حملہ کریں گی تو پیرس سے فرانسیسی فوجیں ہماری وردیاں پہنے ہوئے نکلیں گی اور ہمارا ساتھ دیں گی۔ فرانس میں ہوا بھی یہی۔ سرمایہ پرست طبقہ جنگ کو وسیع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ جرمنی کا حملہ ہوتے ہی تمام کمیونسٹ اور دیگر مزدوروں کے لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔ جرمنی کے خلاف فرانس کی جنگ محض ایک دکھلاوا تھی جبکہ ملکی آزادی کے سامنے ہر خیال پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ فرانس کی حکومت نے پیرس کو غیر محفوظ قرار دے کر تمام شہر خالی کرا دیا تاکہ اس کی خوبصورتی جرمن بمباروں کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ اس کی عمارتیں اور فیکٹریاں سب یوں ہی رہیں یہاں تک کہ جرمنی نے ان سب پر قبضہ کر لیا پیرس کی خوبصورتی اب بھی باقی ہے ہاں فرانسیسیوں کی زندگی تلخ ہو گئی اگر فرانس میں فاشزم کے خلاف جنگ کو عوام کی جنگ میں تبدیل کر دیا جاتا تو وہاں کے دوسو حکومتی خاندان ختم ہو جاتے اور عوام کی حکومت انقلابی نظریہ لے کر اٹھ کھڑی ہوتی اور فاشزم کے خلاف زبردست فوجی محاذ قایم کر دیتی ممکن ہو کہ فرانس کا کچھ حصہ جرمنوں کے ہاتھ آجاتا لیکن فاشی دشمنی کا جذبہ ہر ہر فرد کے سینہ میں بھڑک اٹھتا۔ فرانس بھی دوسرا چین بن سکتا تھا فرانس کی شکست کے بعد مسٹر بیون وزیر لیبر نے ایک بیان میں کہا "فرانس میں ایک بھی مزدور پانچویں کالم میں نہ تھا وہاں سرمایہ پرست طبقہ نے جرمنی کا ساتھ دیا"

سویٹ نے اپنے سامنے ڈنمارک اور فرانس کو فاشی ہوتے دیکھا۔ پانچویں کالم، نیم فاشیوں اور سرمایہ پرستوں کی غداریاں دنیا پر عیاں ہو گئیں سویٹ کو خوف تھا کہ کہیں جنوبی مشرقی یورپ میں بھی فاشی نظام مسلط نہ ہو جائے ہٹلر اور مسولینی کے ایجنٹ اور فوجی سفیر شہریوں کے سادہ لباس میں

لہ ہٹلر اسپیکس مرتبہ روشننگ

سیاحوں کی حیثیت سے رومانیہ، بلغاریہ، یونان، یوگوسلادیہ اور ترکی میں آ بسے تھے اور وہاں کے حکومتی حلقوں سے برابر گفت وشنید کررہے تھے۔ وہاں کی خبریں برابر لاسلکی اور ترسیل کے ذریعہ جرمنی پہنچائی جارہی تھیں مشرقی یورپ کے اخبارات کے ذریعہ نازی پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا سویٹ روس ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی سرحد پر دشمن سازشیں جاری رکھے اور مشرقی ممالک کو اپنے کودنے کا اڈہ بنالے خاص ایسے وقت میں جبکہ ہنگری اور رومانیہ میں نیم فاشی حکومتیں قایم ہوچکی تھیں پھر بھی سویٹ روس جرمنی سے قبل از وقت لڑائی مول لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ شروع اگست میں وزیر خارجہ مسٹر مولوٹاف نے ایک تقریر براڈکاسٹ کی جس میں انھوں نے کہا کہ جرمنی اور روس معاہدہ کے بموجب روس حقیقتاً غیرجانبدارانہ پالیسی قایم رکھنا چاہتا ہے۔

مولوٹاف کے اس براڈکاسٹ پر دنیا کے تمام جمہوریوں میں سنسنی پھیل گئی بعض حضرات اور خاص کر ہندوستان کے گمراہ کمیونسٹ خیال کرنے لگے کہ روس جرمن معاہدہ ایک پائیدار شے ہے اور روس چاہتا ہے کہ جرمنی مغربی جمہوری حکومتوں کو ختم کردے۔ چنانچہ اپنی سامراج دشمنی کے ولولے میں انگریزی اور ہندوستانی کمیونسٹ خیال کرنے لگے کہ فاشیت کی فتح ملوکیت کا خاتمہ ہے یہی غلطی جرمنی کے کمیونسٹوں نے ہٹلر کے عروج میں آنے کے وقت کی تھی۔ بعض امریکی اور انگریزی اخبارات اور سیاسی حلقوں میں سویٹ روس کی خارجی پالیسی پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور اکثر نے روس کو جرمنی کا ساجھے دار قرار دیا۔

مولوٹاف کی تقریر سے جمہوریت پسندوں اور آزادی کے سورماؤں کو ذرا بھی نہ گھبرانا چاہیے تھا اس براڈکاسٹ نے انگریزی حکومت کو سوچنے کے لیے مواد دے دیا جب تک کہ انگریزی حکومت کا رویہ اس قدر مبہم تھا سویٹ روس کس طرح جرمنی سے لڑ پڑتا اور دنیا کے تمام سرمایہ پرستوں کے غم وغصہ کا نشانہ بن جاتا۔ بلقان کی طرف سے اسے خطرہ تھا ہی۔ ہٹلر کا انگلستان پر حملہ نہ کرنا اور صلح جوئی کی کوشش کرنا اس کا بین ثبوت تھا کہ جنوبی مشرقی یورپ میں جنگ کی چنگاری بھڑکنے والی تھی، اگر مغربی محاذ پر جنگ ختم ہوجاتی اور ہٹلر روس پر حملہ کردیتا تو کوئی بھی اس کی امداد کو نہ کھڑا ہوتا۔

جب تک روس کو یہ ضمانت نہیں مل جاتی اور برطانیہ اپنے اعمال سے اس کا ثبوت نہیں دیدیتی کہ ہٹلر کے روس پر حملہ کرتے ہی تمام جمہوری ریاستیں اس کو اپنی جنگ سمجھ لیں گی، روس کا غیر جانبدار رہنا حق بجانب تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے اختتام تک سویٹ روس کی خارجی پالیسی کا اگر تجزیہ کرنا ہو تو مولوٹاف کی تقریر سے قبل کے واقعات کو دیکھنا چاہیے۔ یہ واقعات جنوبی مشرقی یورپ میں رونما ہو رہے تھے۔ یہ علاقہ سویٹ روس اور فاشی یورپ کے مابین تھا۔ بالٹک سے جرمنی کا اثر زائل کر چکنے اور بالٹک کی ریاستوں کو فاشی چنگل سے بچانے کے بعد روس بلقان میں بھی اسی پالیسی پر عمل کرنا چاہتا تھا جرمنی روس کے ارادوں سے بخوبی واقف تھا اور چاہتا تھا کہ بلقان میں روسی اثر اور انقلابی ذہنیت آنے سے قبل ہی اس پر قبضہ کرے جنگی تیاریوں اور جنگی مصلحتوں کی بنا پر پولینڈ سے لے کر باسفورس تک کا علاقہ جرمنوں کے لیے بہت ضروری تھا کیونکہ جنگ کی فیصلہ کن لڑائیاں اسی میدان میں ہونے والی تھیں اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو پورے سال (سنہ ۱۹۴۰ء) جرمنی اور روس میں سیاسی جنگ ہوتی رہی شطرنج کی بساط بچھی تھی شہ دینے کے لیے چالیں چلی جا رہی تھیں حالانکہ حقیقتاً کشت و خون کا بازار گرم نہ تھا۔

مولوٹاف کے اس فقرہ پر کہ سویٹ روس کی غیر جانبداری "حقیقی" ہے اور جرمنی سے سمجھوتہ "کامل" ہے۔ اخبار اسٹیٹس مین مورخہ ۴ اگست سنہ ۱۹۴۰ء نے اپنے اڈیٹوریل میں لکھا، "مولوٹاف عقلمند ہے کیونکہ یہ کہکر وہ ہٹلر کے صبر کا پیالہ چھلکانا چاہتا ہے ڈینوب جیسے اہم دریا پر سویٹ کا قبضہ جرمنی اور اٹلی سے دوستی ہی کی بدولت ہے۔ جرمنی اور اٹلی اس معاملہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ وہ بالکل مجبور ہیں" گزشتہ جنگ عظیم میں قیصر نے جرمنی کو دو محاذوں پر لڑا دیا تھا۔ ہٹلر ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب تک مغربی محاذ کی توپیں خاموش نہیں ہو جاتیں وہ مشرق کی طرف قدم بھی نہیں بڑھا سکتا تھا اٹلی اپنی گوناگوں کمزوریوں کے باعث اس قابل نہ تھا کہ مشرق میں روس سے الجھ پڑتا۔

ساتھ ہی ساتھ مولوٹاف نے اپنی تقریر میں اس چیز کو واضح کر دیا تھا کہ وہ ہر اس دشمن کے خلاف جنگ کرے گا جو اس کی آزادی سلب کرنا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ جرمنی کے خلاف استعمال کیا گیا

تھا۔ علاوہ ازیں اس نے کنایتہً یہ بھی کہا کہ اگر سوویٹ کو اس کی ضمانت مل جائے کہ اس پر حملے کے وقت جرمنی مغربی محاذ کی طرف سے مطمئن نہیں ہو جائے گا تو وہ اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی ترک کر سکتا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ رائسٹر کے بموجب سر اسٹیفورڈ کرپس روس بھیجے گئے تاکہ اس ضمانت کے لیے گفت وشنید شروع ہو۔ چنانچہ مولوٹاف کی تقریر پر بجائے آزاد پسندوں کو ملول ہونے کے خوشی کا اظہار کرنا چاہیے تھا کیونکہ اس نے برطانیہ کی خارجی پالیسی میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی۔

سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۱ء کے نصف تک سوویٹ یونین کی خارجی پالیسی حسب ذیل اصولوں پر مبنی تھی۔ اول جرمنی چاہتا تھا کہ جنوبی مشرقی یورپ کے تیل، پٹرول اور دیگر خام اشیا کا وہ مالک ہو دوم اس کی ملکیت کے لیے وہ ان ممالک پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اگر ہٹلر اس میں کامیاب ہو جائے تو اس کی بہت سی جنگی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں اور وہ بے حد طاقتور ہو سکتا تھا طاقتور فاشزم سوویٹ کے لیے زبردست خطرہ تھا۔ کہا جاتا ہو کہ مسولینی، چیانو، ہٹلر اور ربن ٹراپ کی ملاقات میں یہی مسئلہ زیر بحث تھا۔ مولوٹاف کی تقریر اسی سیاسی پس منظر کا آئینہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سوویٹ یونین مشرق میں جنگ کو روک سکے تاکہ جمہوری ریاستیں جلد سے جلد اپنی خارجی پالیسی تبدیل کر دیں اور اس سے ایک پکا معاہدہ کر لیں۔

سوائے اُن لوگوں کے جو جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں یا اپنی سامراج دشمنی کی ولولہ انگیزی میں عقل پر جذبات کو ترجیح دیتے ہیں تمام سیاست داں جانتے تھے کہ روس جرمن معاہدہ ایک وقتی چال تھی "ٹائمز کے سیاسی نمائندے نے مولوٹاف کی تقریر کے متعلق لکھا تھا " روس ابھی تک دنیا کے سامنے یہی ظاہر کر رہا ہو کہ جنگجو ملکوں کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔ شاید جرمنی بھی کچھ دن اچھے تعلقات رکھنا چاہتا ہو عموماً یہ خیال کیا جاتا ہو کہ جرمنی اور روس کے تعلقات کے متعلق مولوٹاف کا اشارہ اس کی دلیل ہو کہ یا تو دونوں مل کر نئے ملک کی تقسیم کر لیں گے یا دونوں لڑ پڑیں گے۔" سنہ ۱۹۴۰ء ہی میں ان کشیدہ تعلقات کی ابتدا ہو چکی تھی اور جرمنی نقصان میں تھا۔ رومانیہ میں جرمنی کا مکمل اثر تھا لیکن اس کے باوجود سوویٹ کے بل بوتے پر بلغاریہ سے

رومانیہ سے ڈوبروجا کا علاقہ لے لیا۔

سویٹ کی خارجی پالیسی پر مولوٹاف کی تقریر کا اثر ترکی پر بہت اچھا پڑا حالانکہ مولوٹاف نے ترکی کو متنبہ بھی کیا تھا کہ وہ جرمنوں کے ساتھ مراعات کر رہا ہے۔ رائٹر کا نامہ نگار لکھتا ہے۔ ترک مولوٹاف کی تقریر کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ روس وقت کے انتظار میں ہے اور جرمنی سے دوستی کی آڑ میں حفاظتی تیاریاں کر رہا ہے ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس تقریر میں روس اور برطانیہ کے مابین معاہدہ کے لیے کافی زور دیا گیا ہے دو باتیں بالکل صاف ہو گئی ہیں اول مولوٹاف نے جرمن روس معاہدہ کی زبانی تعریف کر دی لیکن جرمنی کو بھی متنبہ کر دیا کہ وہ مشرق کی طرف نگاہیں نہ اٹھائے دوم اٹلی کی تعریف کر کے مولوٹاف نے پہلی بار اس کے دل میں جوش پیدا کیا تاکہ بلقان پر جرمن حملہ کے وقت اٹلی جرمنی کا ساتھ نہ دے۔"

مولوٹاف کی تقریر سے کئی روز قبل رائیٹر کے نامہ نگار نے بخارسٹ سے یہ تار بھیجا۔

"یہاں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ روس جرمن اتحاد کی پالیسی بسارابیہ پر قبضہ کرنے کے بعد ختم ہو گئی اس کے بعد سے روس کی پالیسی خالص ابن الوقتی پر مبنی رہے گی اور وہ دیکھتا رہے گا کہ انگلستان پر جرمنی کیونکر حملہ کرے گا اور اس کے کیا کیا نتائج نکلیں گے روس روتھینین سرحد پر بڑی مضبوطی سے قابض ہو چکا ہے اور بعض حلقوں میں یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ کیا انگلستان پر حملہ ہوتے ہی روس اپنی فوجیں ہنگری اور یوگوسلاویہ میں ڈال دے گا؟" ساتھ ہی ساتھ رائٹر کے نامہ نگار نے یہ بھی لکھا "بلغاریہ میں روسی اور جرمن ایک دوسرے کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ دن دور نہیں کہ روس بلغاریہ کی حمایت میں رومانیہ پر زور ڈالے کہ وہ ڈوبروجا کا علاقہ بلغاریہ کو واپس کر دے۔"

ڈوبروجا کا علاقہ جو وارسائی کی صلح میں رومانیہ کو دے دیا گیا تھا بلغاریہ کو واپس مل گیا یوگوسلاویہ کو بھی یقین ہو گیا کہ جرمنی اور اٹلی کے جارحانہ منصوبوں سے صرف روس ہی اسے بچا سکتا ہے چنانچہ بلغاریہ اور یوگوسلاویہ میں فاشی ہمدردی کم ہو گئی اور روس کا اثر بڑھنے لگا خود رومانیہ میں سویٹ کے ہمدردوں کی تعداد بڑھنے لگی اور نیم فاشی حکومت کے خلاف مسٹر مانیو کی

سرگرمی میں۔ قومی کسان پارٹی نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ بغاوت اس قدر مقبول ہوئی کہ بالآخر جرمنی کو اپنی فوجیں وہاں بھیجنا پڑیں۔

جرمنی روس کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھا وہ ابھی تک مشرق میں جنگ شروع کرتے ڈر رہا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ روس کے بڑھتے ہوئے اثر کو روک نہ سکا حالانکہ جولائی ہی میں برلن کے اخبارات نے لکھا تھا: "جنوبی مشرقی یورپ میں ایک مضبوط محاذ قایم کرنے کی ضرورت ہے۔" بخارسٹ کے ایک اخبار نے بھی لکھا تھا: "برلن میں اس پر غور کیا جا رہا ہے کہ روس کے ساتھ اب ذرا بھی رعایت نہ کی جائے۔" روم کا کیتھولک فاشی اخبار اوسے نا ٹرکتا ہے: "محوری طاقتیں روم اور برلن میں اب اس پر غور کر رہی ہیں کہ بلقان میں ایک نیا توازن قایم کیا جائے کیونکہ بالٹک اور ڈینوب کی بیرونی چوکی یعنی بسارابیہ اور بوکووینہ سوویٹ میں شامل ہو گئے ہیں۔"

ترکی میں جرمنی اور برطانیہ کے اثر کے باوجود سوویٹ سے ہمدردی پیدا ہو رہی تھی مولوٹاف کی تقریر کے بہت بعد نیوز کرانیکل کے استنبول کے نامہ نگار نے لکھا۔ "روس کی طرف ترکی کا موجودہ رویہ اس سے ظاہر ہے کہ جب ترکی کے وزیر اعظم نے پارلیمان میں یہ اعلان کیا کہ ان کا ملک تمام ہمسایہ حلقوں سے غیر جانبدارانہ برتاؤ رکھے گا تو بعض ڈپٹی کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا، کیا وجہ ہے کہ کمال اتاترک اور لینن کے زمانہ کا سا میل جول عصمت انونو اور اسٹالن کے زمانہ میں نہ رہے؟"

روز افزوں سوویٹ اثر ہٹلر کی برداشت سے باہر ہو گیا اور ایک ایک کر کے تمام مشرقی ممالک پر اس نے حملہ شروع کر دیا۔ بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ سب ہی ختم ہو گئے۔ انگریزی فوجیں جو یونان اور یوگوسلاویہ کو بچانے گئی تھیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ہاں یوگوسلاویہ میں جرمنوں کو کچھ دن الجھائے رکھنے سے یونان بچا رہا اور یونان میں جرمنوں کا مقابلہ کرنے سے جرمنی کا مشرق میں دباؤ فی الحال ملتوی ہو گیا کریٹ کی جنگ بھی ایک تاریخی جنگ تھی بلقان فتح ہونے کے بعد ہٹلر نے ترکی، ایران، عراق اور شام میں اپنے ایجنٹ بھیجنا شروع کر دیے بجائے راستد علی اور مفتی اعظم یا ایران کے تاریخی واقعات پر بحث کرنے کے (جو سب پر عیاں ہیں) ہم صرف چند اخبارات کے

اقتباسات پیش کرتے ہیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ایران، ترکی، عراق اور شام میں جرمنوں کا قبضہ ہو جانے پر روس کا کیا حال ہو سکتا تھا۔

مسٹر برنارڈ پائرس مانچسٹر گارجین میں یوں رقم طراز ہیں: "عراق کی سیاسی تبدیلیوں اور ترکی کی طرف سے روس روگردانی نہیں کر سکتا۔ ہاں موقع و محل دیکھتے ہوئے ممکن ہے کہ وہ خاموشی اختیار کر لے۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ روس کی پالیسی ہرگز سامراج پرست نہیں ہے اور نہ وہ اصولاً سامراج کو پسند کرتا ہے لیکن عراق پر جرمن قبضہ کے بجائے وہ انگریزی قبضہ برداشت کر سکتا ہے چنانچہ اس کی موجودہ پالیسی شاید اسی حقیقت فناسی کا آئینہ ہے۔ عراق پر جرمن قبضہ روس کے لیے بہت خطرناک ہو گا عراق کے بعد باکو کا نمبر آئے گا اور روس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہ جائے گا کہ وہ بھی اٹلی کی طرح جرمنی کا ایک کمزور ساتھی بن جائے جو دراصل شکست کے مرادف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ماسکو کا وزیر خارجہ عراق میں جرمنوں کا قبضہ برداشت نہیں کر سکتا۔" یہ خیالات ایک برٹش نائٹ کے ہیں جو مانچسٹر گارجین جیسے رجعت پسند اخبار کا نمائندہ ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ روس اصولاً سامراج شاہی کے خلاف ہے لیکن جرمنوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو اپنی سرحد پر برداشت کر سکتا ہے۔ چنانچہ بعض حقیقت ناآشناؤں کا یہ کہنا کہ جرمن اور روس کا معاہدہ ایک دوامی دوستانہ ہے سراسر غلط ہے۔

عراق اور ایران کے ساتھ ساتھ شام میں بھی فاشی سازشیں ہو رہی تھیں یہ صحیح ہے کہ وہاں فرانس کا قبضہ تھا اور فرانس کا سلوک وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ اچھا نہیں رہا لیکن فرانس کی شکست کے بعد وشی حکومت پر زور دیا جا رہا تھا کہ وہ شام میں جرمنوں کا اقتدار بڑھنے دے انگریزی جہازوں کو ہٹا دے اور فرانسیسی جنگی بیڑے کو جرمنی کے حوالے کر دے۔ وشی حکومت کے پس و پیش کرنے پر ہٹلر کا ارادہ تھا کہ شام پر حملہ کیا جائے اور ہزار دستوں کا ایک حصہ لیبیا اور مصر ہوتا ہوا بڑھے اور دوسرا ترکی کی طرف سے شام میں داخل ہو۔ جرمنی نے ترکی پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور کہا کہ آزاد فرانسیسیوں یعنی جنرل ڈی گال کے ساتھیوں اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے جرمنوں کو شام میں جانے کا راستہ ملنا چاہیے۔ ترکی کا مشہور اخبار ینی صباح لکھتا ہے

اگر جرمنی نے جبریہ شام پر حملہ کیا تو ترکی کو مداخلت کرنا پڑے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں کے جارحانہ حملوں کے خلاف ترکی میں زبردست نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ڈیلی میل کے استنبول کے نامہ نگار نے تار کے ذریعہ یہ خبر بھیجی: "ترکی آہستہ آہستہ سمجھتا جا رہا ہے کہ جرمنی اس کو چاروں طرف سے گھیر رہا ہے ترکی کے قریب یونان کے جزائر پر جرمنی کا قبضہ اور اس کی سرحد جرمنی اور بلغاریہ کی فوج کا اکٹھا ہونا مشرق کے لیے ایک زبردست خطرہ تھا۔ رومانیہ کے بندرگاہ کانسٹانزا پر جرمنی اور جرمن دوست جہازوں کی جلد جلد آمد و رفت اس کا ثبوت ہے کہ اگر جرمنی کو ضرورت ہوئی تو وہ شمالی ترکی پر حملہ کر دے گا۔ اگر شام اور عراق بھی جرمن دائرہ میں آ گئے تو ترکی چاروں طرف سے گھر جائے گا۔"

ترکی پر دباؤ بھی ڈالا جا رہا تھا اور اس کو سبز باغ بھی دکھائے جا رہے تھے فان پاپن اسے سمجھا رہا تھا کہ جرمنی سے دوستی ہی میں اس کا فائدہ ہے۔ دوسری طرف جرمن ایجنٹ حلب اور دمشق میں اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھے جرمنی کے ہوائی جہاز شام پہنچ رہے تھے۔ ۲ر جون سنہ۱۹۴۱ء کو ۱۵۰ ہوائی جہاز رانیک پہنچ گئے۔ روس کے لیے ترکی کا غیر جانبدار رہنا بہت ضروری تھا روس اور ترکی ہمسایہ تھے۔ علاوہ ازیں روس کی کل مشرقی تجارت آبنائے دانیال اور باسفورس سے تھی چنانچہ اگر ترکی فاشی ہو جاتا تو روس کی نہ صرف کل تجارت بند ہو سکتی تھی۔ بلکہ ترکی اور ایران کے ذریعہ اس پر بڑی آسانی سے حملہ ہو سکتا تھا ترکی کے ہوائی اڈوں سے روسی تیل کے چشمے قریب ہیں۔ باکو اور کاکیشیا کا تیل اور صنعت جرمنی کے ہاتھ بڑی آسانی سے آ سکتی تھی۔

سوویٹ وقت کے انتظار میں تھا۔ روس جرمن معاہدہ سے اسے اتنا موقعہ مل گیا کہ وہ فوجی اور جنگی تیاریاں کر سکے۔ روسی کمیونسٹ یوتھ لیگ کا اخبار کوم سومولسی کایا سنہ۱۹۴۱ء میں لکھتا ہے "بین الاقوامی فضا ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم روز جنگ کے لیے تیاری کریں امن پسندوں کی ذہنیت کے خلاف جنگ کرنا چاہیے۔ ہمارے لیے اس دوسری بین الاقوامی جنگ کا عظیم ترین اصول

یہ ہو کہ سرخ فوج دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے۔"

جون سنہ ۱۹۴۱ء میں جرمنی اور روس کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی خاص کر ہٹلر روس سے جنگ کرنے کے لیے تلا بیٹھا تھا۔ گزشتہ ۲ ماہ سے وہ برابر اپنی فوجیں روس کی سرحد پر روانہ کر رہا تھا یوگوسلاویہ اور یونان سے فراغت پانے کے بعد جرمنی کی مسلح فوجیں آسٹریا اور بوہیمیا واپس گئیں اور چند ہی ہفتوں کے آرام کے بعد پولینڈ کی سرحد پر بھیج دی گئیں فرانس سے پیادہ فوجیں ہٹا کر مشرقی پروشیا اور وسط پولینڈ میں رکھی گئی۔ رومانیہ میں شروع جون میں تین مسلح دستے بسارابیہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ بالٹک سے بحیرۂ اسود تک جرمنوں کے سو مضبوط دستے روس کے خلاف جمع ہو چکے تھے، ہر دستہ بیس ہزار سپاہیوں کئی ہزار ٹینک، ہوائی جہازوں اور مسلح لاریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بقول لندن ٹائمز کے "یہ ایسی حالت ہے جس میں بندوقیں خود بخود چھوٹ جاتی ہیں۔"

۲۲ جون کی صبح کو ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا اور روس جرمن معاہدہ پاش پاش ہو گیا۔ حملہ کرتے وقت ہٹلر نے ایک تقریر کی اور اب حقیقت ناشناس لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ جرمنی بہت پہلے ہی سے روس کے خلاف سازشیں کر رہا تھا اور روس بھی جرمنی کو مضبوط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس حملے کے بعد سے روس کی نام نہاد غیر جانبدارانہ پالیسی کا دور ختم ہو گیا۔

علی امام ایم اے

دولت وفرد

دولت اور اس سے افراد کا رشتہ، ایک نہایت ہی معرکہ آرا مسئلہ ہے۔ یہ شروع سے مفکرین سیاست و اجتماع کی خیال آرائیوں کا مرکز رہا ہے اور عصرِ حاضر میں بھی جبکہ دنیا نے نئی کروٹ بدلی تو یہ بحث جدید بنیادوں کے ساتھ فلاسفہ کے پیش نظر آئی اور پھر نئے نظریات نے وجود پایا۔ فاشستیوں اور نازیوں کے نزدیک تو یہ مسئلہ کسی مناقشہ و بحث کا محتاج نہیں۔ ان کے یہاں دولت کی مطلق العنانی اور اس کا پابندیوں سے مستغنی ہونا ایک مسلم امر ہے جس میں گفتگو کی قطعی مجال نہیں شاید انھیں لوگوں کے اس غلو نے اس بحث کو ہر ایک کی عنایت کا مرکز بنا دیا ہے کہ یہ آج اصحاب سیاست اور عالمین قانون کے دائرہ سے نکل کر ایک عام مسئلہ ہو گیا ہے۔

دولت کی مطلق حکمرانی کے نظریہ کو دراصل یونانی فلسفہ کے دو مصادر سے ماخوذ ماننا چاہیے دولت کے بارے میں یونانی فلسفہ کا رجحان اس طرف ہے کہ حکومت خود ایک کلیہ قائمہ ہے جو بنفسہا کامل اور بذاتہا قایم ہے افلاطون نے اس نظریہ کو اختیار کیا اور ارسطو بھی اپنی سیاسی بحثوں میں یہی ظاہر کرتا ہے کہ بنفسہا اکتفا، و قیام دولت کی طبیعت ہے۔ نیز ان کے نزدیک خود ایک دولت کا دوسری دولتوں کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ بھی محض عداوت، رشک و مناقشت اور کراہت و بغض کا رشتہ ہے۔ یونان کی حکومتوں کے باہمی رشتے بھی خود انھیں بنیادوں پر قایم تھے۔ ایک جگہ تو فیلسوف ...لس نے بھی یہ کہہ دیا ہے کہ "حکومتیں باہم بالطبیعت دشمن ہیں"۔

...سی سلسلے میں یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہو گا کہ مفکرین کے اس نظریے کے لیے کہ دولت کے ساتھ دو طرح کے رشتے وابستہ ہیں۔ ایک دولت کا افراد سے علاقہ اور دوسرے عام بنی نوع انسان سے۔ اس طریقۂ فکر میں کوئی جگہ نہیں ہو گی کیونکہ اس میں خود حکومت کے حقوق سب پر ...ا ری ہیں اور اس کا درجہ تمام درجوں پر فایق ہے۔

انسانی طبیعت کے متعلق یونان کے فلاسفہ کی رائے بھی بہت توجہ طلب ہو کیونکہ یہی اس نظریہ کا دوسرا مصدر ہے۔ اکثر سیاسی نظریات نے تو اس بنیاد کو تسلیم کیا ہو کہ فرد کی حقیقت خود ایک منفرد شخصیت کی سی ہو جسے ہم اس حالت کو فرض کر کے سمجھ سکتے ہیں جبکہ ایک فرد انسانی برادری اور مجتمع (سوسائٹی) سے ایک دم علیحدہ ہو اور اس پر کوئی قانون اور کوئی بوجھ نہ ہو اس لحاظ سے ان کے نزدیک مجتمع (سوسائٹی) اور برادری ایک مصنوعی تعمیر ہے جسے انسان اس لیے قایم کرتا ہو تاکہ اپنی اس طبعی حالت پر ایک قید لگائے اور اسے قوانین میں جکڑ دے جس میں رہ کر وہ ایک آزاد اور خوش زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نظریہ کو جو علتِ آغاز مجتمع سے بحث کرتا ہے نظریۂ بندش اجتماعی کہتے ہیں۔

مگر ارسطو اور افلاطون کی رائیں بالکل اس سے علیحدہ ہیں ان کا خیال ہو کہ انسان ایک "اجتماعی جانور" ہو جب تک وہ مدنی الطبع ہے اس وقت تک اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک برادری بنا کر زندگی بسر کرے۔ افراد کی عزلت کی زندگی غیر طبعی زندگی ہو۔ انسانی طبیعت ہو کہ اس کا نشو و نما اور اقدام و ترقی سب کچھ مجتمع کی گود میں ہو تاکہ وہ دوستوں اور ساتھیوں میں اپنی طاقت کو آزما سکے اور اپنے ہمعصروں میں اس کی شخصیت اور اس کی نطری قوتوں کو نکھرنے اور نمایاں ہونے کا موقع ملے نیز یہ سب کچھ اس امن و اطمینان کے علاوہ ہو جو ایک فرد مجتمع کے سایہ میں رہ کر محسوس کرتا ہو۔

اسی بنیاد پر کہ مجتمع ہر قسم کی بدنظمی کے خطروں سے نجات دیتا ہو اور شخصیت کی پرورش کرتا ہو مشہور جرمن فیلسوف ہیگل نے ایک پوری عمارت کھڑی کر ڈالی ہو ہیگل کا خیال ہو کہ مجتمع میں رہ کر افراد ایک بہتر اور صحیح آزادی سے متمتع ہوتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک غیر منظم زندگی کے تابع ہوں حقیقی حریت وہی ہے جو ایک انسان مجتمع کے حدود میں رہ کر حاصل کرتا ہے جس کا خارجی مظہر وضع کردہ قوانین ہیں اور داخلی مظہر وہ آداب و رسوم ہیں جن کا وہ غیر اختیاری طور پر پابند ہوتا ہے مختصر یہ کہ مجتمع افراد کو آزادی بخشتا ہے اور ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اس کے

اس خود ایک ذاتی شخصیت اور مستقل ارادہ ہو اگر اس کا عمل اپنے اعضا اور افراد کے حسب رغبت ہو تو اسے ایک عام ارادہ حاصل ہو جاتا ہے جو تمام ارادوں سے برتر ہے اور جس میں ضم ہو جانے سے خود فرد کے ارادہ میں تقویت آجاتی ہو لہذا دولت سے جو اس ارادہ عامہ کا نتیجہ ہے جو بھی عمل صادر ہوتا ہو وہ سب صواب اور عیوب وخطا سے بری ہو کیونکہ دولت تمام بہتر ارادوں کی ایک تمثیل ہو۔

اس کے خیال میں خود دولت کے پاس ایک شخصیت ہو اور اس شخصیت کے ذاتی حقوق بھی ہیں جو افراد کے مزعومہ حقوق پر فائق ہیں ——— میں مزعومہ حقوق اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس نظریہ کے بموجب افراد کے کچھ حقوق ہی نہیں ہوتے جو دولت کے حقوق سے متعارض ہو سکیں۔ کیونکہ جب انسان نے مجتمع میں قدم رکھا تو اس وقت اس کے ذاتی حقوق جو اس مفروضہ طبعی حالت کو ماننے کی شکل میں حاصل ہوتے تھے بالکلیہ ختم ہو جاتے ہیں اور اب اس کے اوپر وہ اعمال واجب ہو جاتے ہیں جس کی دولت اپنی غایت تک پہنچنے کے لیے محتاج ہو گویا طبعی طور پر انسان اپنے طبعی حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے اس لیے طبیعت ہی اسے مجتمع میں داخل کرتی ہو اور وہ جب تک مجتمع اور دولت سے متعلق ہو اس وقت تک اس کے ذاتی حقوق ایک دم جدا نہیں ہو سکتے جو دولت کے حقوق سے متعارض ہوں۔

ان تمام لحاظ سے اور جو کچھ نکتہ اس نظریۂ ارادہ عامہ اور شخصیت دولت، سے مستنبط ہو سکتا تھا ہیگل نے دولت کو ایک مالنفس حساس مادہ قرار دیا ہے اور اس کا خیال ہو کہ فرد کا علاقہ جو اسے دولت سے متعلق کرتا ہو خود دولت کی شخصیت کا ایک جزو ہے لہذا انسان کوئی کام دولت سے جدا ہو کر نہیں کر سکتا گو یا اس کا ہر ارادہ اور ہر عمل دولت کے ارادہ اور دولت کے عمل کا حصہ ہو چنانچہ بوزانکیہ نے تو یہ کہدیا ہو کہ انقلاب وبغاوت کے زمانہ میں بھی فرد دولت پر حملہ خود دولت کے ارادہ سے کرتا ہو اور دولت بغاوت کے زمانہ میں خود ہی پارہ پارہ ہوتی ہو۔

دولت کی قوت جو افراد کی قوت پر فائق ہے اور ان سے ایک پیہم جد وجہد اور قربانیوں کی طالب ہوتی ہو اس کی نسبت وہ کہتا ہے کہ وہ افراد کی شخصیتوں کو وسیع کرتی ہو اور انھیں حقیر

اغراض اور پست غایتوں سے نکال کر بلند اور زندگی کے انفرادی محور کو حیات کے میدان میں منتقل کرتی ہے ایک حکومت اجتماعی آداب و رسوم کی سب سے بڑی تمثیل ہے لہذا اس کے لیے یہ ملزوم نہیں کہ وہ شریعت اخلاق کی پابند اور مقلد ہو کیونکہ اخلاقی رشتہ اس کا مقتضی ہے کہ جانبین اور طرفین کا وجود ہو مگر حکومت کے لیے کسی مد مقابل یا جانب آخر کا موجود ہونا ناممکن ہے کیونکہ وہ تو تمام قوم کی ایک متحدہ جمعیت ہے۔

ان کے خیال میں حکومت کو چاہیے کہ وہ امن و سلامتی کے ایام میں بہ حیثیتوں یہ نظری طور پر حاوی رہے مگر جنگ کے زمانے میں عملی طور پر افراد کی زندگی پر اس کا اقتدار رہے اور انھیں جس طرف چاہے منعطف کرے قانونی طور سے اس کی کوئی سند نہ ہوگی اگر کوئی اس کے احکام سے گریز یا اس کے مقابل میں آئے کیونکہ خود وہ افراد جن پر ضرورت ہے کہ اس کا اقتدار قایم ہو کسی طرح بھی ان افراد سے مختلف اور ممتاز نہیں جو اس کے قوانین کے سامنے سربسجود اور اس کے اعمال اور فرائض اپنے کاندھے پر ڈھوتے ہوے ہیں درحقیقت حکومت کے معاملات محض ان لوگوں کی حقیقی رغبتوں اور کاوشوں کا ایک مجموعہ ہے جو اس کے احکام کو صدق دل سے مانتے ہیں اور خود اپنی رغبتوں اور اپنے ارادوں کے خلاف حکومت کے ارادوں اور اس کی رغبتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

ایک دولت کے لیے جو مصائب اور مشکلات سے بہادرانہ دوچار ہوتی ہے لازم ہے کہ وہ افراد سے اس کا مطالبہ کرے کہ وہ اپنی زندگی اور ہر ممکن شے حکومت کے ہاتھوں رہن کر دیں چنانچہ ہیگل کا بیان ہے "زمانہ حرب و قتال دولت کی قوت و سطوت اور طاقت و اقتدار کا حقیقی آئینہ ہوتا ہے اس وقت جذبۂ وطنیت ہی ایک ایسی شے ہے جو افراد کی انفرادی آزادی کو جمعیت میں جذب کر دینے کی داعی ہوتی ہے"

ہیگل کے بعد سے المانی مفکرین نے اس نظریہ کو درجہ بدرجہ طریقوں سے ترقی دی ہے ان میں المانی مورخ ٹریشکیہ اور سیاسی کاتب برنارڈی نہایت مشہور ہیں جنھوں نے اس نظریۂ سیادۂ مطلقہ

... رزیادہ ہی بخش دی ہو۔ انگریز مفکرین نے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا ہو اور وہ المانیوں کے اس غلو اور انتہائی مبالغہ کو ایک دم قبول نہیں کرتے۔

حکومت کے سیادۂ مطلقہ کا نظریہ باوجود اپنے منطقی استدلال کی چستی کے ایک ناقابل قبول اور واقعیت کے غیر مطابق ہو۔ یہ نظریہ بعض حیثیتوں سے نہایت پرخطر ہو کیونکہ یہ حکومت کو وہ تمام جواز بخش دیتا ہو جس سے وہ ایک دم خودمختار ہو جاتی ہو اور اپنی خارجہ سیاست میں وہ جو روش چاہے اختیار کر سکتی ہو خواہ اخلاق و آداب کی تمام عمارتیں منہدم ہوتی ہوں تو ہو جائیں اس نظریہ کی مخالفت بھی بہت شدومد کے ساتھ کی گئی ہو چنانچہ بعض لوگوں نے تو مخالفت میں یہاں تک کہدیا ہے کہ اگر حکومت اسی کو کہتے ہیں تو دولت کے وجود کی ایک دم ضرورت نہیں۔

اس نظریہ کا واضح عیب یہ ہو کہ اس نظریہ کے مطابق دولت اپنے آپ کو تمام بنی نوع انسانی کے لیے ایک تمثیل ما کر پیش کرتی ہو اور یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہو اگر دولت کو اس کے افراد کے ساتھ محکم رشتہ کی بنا پر ایک کامل قدرت اور سطوت بھی حاصل ہو جائے تب بھی یہ مسلم ہو کہ اس قوت کے باوجود بھی جو اسے ان لوگوں کے ارادوں کی تمثیل سے حاصل ہو جو خود دولت کے اعضاء و افراد ہیں یہ دعویٰ کہ وہ تمام انسانی ارادوں پر فائق ہو ایک دم باطل ہوگا کیونکہ یہ دعویٰ مستلزم ہو کہ اسے ان افراد کے ارادوں میں بھی درخور حاصل ہو جن کا رشتہ دوسری دولتوں کے ساتھ وابستہ ہو۔ حالانکہ یہ ممکن ہو۔ لہذا جب بھی ہر شے پر ایک قدرت اور تمام ارادوں پر تفوق و برتری کا ادعا و احساس پیدا ہوگا اور اسے حکومت کی انانیت اور اخلاقی رسوم و قیود سے آزادی کا بہانہ بنایا جائے گا تو یہ یقیناً دوسری دولتوں کے تعلقات تک ممتد ہوگا اور اس وقت کوئی چیز اسے نظری طور پر اس بے قابو انانیت سے روک نہیں سکتی۔ پس یہ واضح ہو کہ جو حکومت خود اپنے افراد کے تعلقات کو شریفانہ اہمیت نہیں دے سکتی وہ یقیناً دوسری دولتوں کے رشتوں کو بھی اچھی طرح نباہ نہیں سکتی۔

مجھے یہ تسلیم ہو کہ مجتمع (سوسائٹی) میں رہ کر ایک فرد کو طبعی صلاحیتوں کی نشو ونما اور اپنی طاقت و قدرت کے اظہار کا بہترین موقع ملتا ہو کیونکہ گو ایک جلاوطن انسان ایک غیر آباد اور دور افتادہ

جزیرہ میں، ایک بے قید وبند آزادی سے متمتع ہوتا ہے مگر یہ حریت کی ایک مجبور شکل ہے کیونکہ اس کے اندر ہر چیز کے کرنے کی صلاحیت ودیعت ہو مگر وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا اور درحقیقت مجبور ہے لیکن یہ تسلیم کرلینے کے باوجود بھی یہ کبھی نہیں مانا جاسکتا کہ حکومت ہر شے پر قادر ہے اور افراد حکومت کی تعمیر کے لیے خلق ہوئے ہیں نہ کہ دولت افراد کی بہبودی وفلاح کے لیے قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت افراد کی سعادت کے لیے عمل نہیں کرتی تو دولت کے کوئی معنی نہیں اس لیے کہ دولت خود بنفسہا کوئی مقصد نہیں بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ اس کے قیام سے افراد مسعود اور پرمسرت زندگی بسر کرسکیں۔ اگر ہم اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ نظریہ "سیادۂ دولت مطلقہ" کتنے مغالطوں اور غلط فہمیوں پر قائم ہے۔

نظریہ سیادۂ دولت کے بعض انصار ومؤیدین کہتے ہیں کہ دولت کبھی بھی فرد کی حیات برخلاف مجد وعظمت کے تعمیر نہیں کرسکتی ہے اس لیے کہ خود دولت کی مصلحت فرد کی مصلحت ہے اور دولت کا ارادہ خود استبداد وجبر کے وقت میں بھی فرد کا ارادہ ہے لیکن درحقیقت یہ ایک غیر معقول اور بے جا تاویل ہے اس کا تجربہ اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ ان افراد کا رایوں، خیالات اور عقاید میں جو دولت کے امور واعمال کے متولی ہیں دیگر افراد سے زبردست اختلاف ہو اس وقت یہ بات اچھی طرح تمیز کی جاسکتی ہے کہ دولت عام افراد کی کہاں تک وکالت کررہی ہے سیادۂ دولت کے نظریہ کی رو سے تو عام شخصی آزادی کا پورا خاتمہ ہوجاتا ہے کیونکہ دولت وفرد کی جنگ میں مسلم ہے کہ دولت برابر صواب کی حامل ہوتی ہے اور ہر مخالف سراسر لائق مذمت اور مستحق سرزنش وملامت ہے اور کسی کو کبھی حق نہیں کہ وہ اپنی آواز بلند کرے اور اپنی باتیں دوسروں تک پہنچائے۔

اس دور میں اب زمانہ نے اپنی رفتار ایک دوسری ہی طرف پھیر دی ہے اب قوموں میں باہم اقتصادی علاقے اور روابط بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور اجتماع انسانی میں یہ رجحان پیدا ہوگیا ہے کہ عالم کی تنظیم اقتصادی اصول پر ہو جو ہمارے موجودہ جغرافیائی نظام کی ایک دم تنسیخ کردے۔ لہذا اب ہر فرد کو اس اجتماعی مصلحت کی فکر ہوگی جسے ہم اقتصادی بیداری کہہ سکتے ہیں۔

اس کے لازم ہونے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد جغرافیائی تنگ خیالیاں باقی نہ رہیں گی اور نوع انسانی کی عالمگیر مصلحت کو دولت کی مصلحت پر تفوق حاصل ہوگا جس طرح خاندان اور قبیلہ کی دنیا وسیع ہو کر ایک دولت کی شکل اختیار کرتی ہے اسی طرح اب مستقبل میں یہ متوقع ہے کہ یہ وسعت اور زیادہ ہمہ گیر ہو کر تمام بنی نوع انسان کو اپنے احاطہ حصار میں محدود کر لے گی۔ آج دولت کو اجتماعی تدریج کا آخری مرحلہ سمجھا جاتا ہے اور ایک دولت کی بقا و طاقت بہت بڑی حد تک ان عادات و نظریات پر منحصر ہوتی ہے جسے وہ اپنی قومی وراثت سمجھتی ہے۔ مگر مستقبل میں چونکہ ہمیں اقتصادی ضرورتیں دوسری دولتوں کے ساتھ ربط و علاقہ رکھنے پر مجبور کریں گی تو اس وقت ضروری ہوگا کہ ایک بین الاقوامیت کا تخیل قائم ہو اور یہ بین الاقوامیت اقتصادی تمام حکومتوں کی اسی طرح نگراں و محافظ ہو جس طرح دولت افراد کی اور وہ بھی اسی طرح امن کی ذمہ دار ہو جس طرح دولت ملک و قوم کے امن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس وقت ہر فرد اپنی حیثیت محسوس کرے گا اور وہ سمجھے گا کہ پوری انسانی برادری میں اس کی معاونت کی کتنی ضرورت ہے بعض اسی جیسے افراد کی ہم عملی و اشتراک پر انسانی بہبودی منحصر ہے آئندہ قومی انجمنیں یہ دولتیں نہیں ہوں گی جو انسانی فلاح کو پس پشت ڈال کر مجتمع کے نام پر فرد اور انسانیت دونوں کے وقار کو کھو ڈالتی ہیں۔

(ترجمہ) صدرالدین عظیم

فرائیڈ اور اس کا فلسفہ

زمانہ قدیم سے بڑے بڑے فلاسفروں سے ہم سنتے آئے ہیں کہ خود کو پہچانو۔ من کی دنیا ظاہری دنیا سے کم وسیع نہیں۔ وہ بحر بیکراں ہے اس کی غواصی کرو۔ گوہر زندگی ڈھونڈو یہ دنیا کا حاصل ہے لیکن عوام کے لیے یہ فلسفیانہ باتیں کچھ جاذب توجہ نہ ہو سکیں وہ دراصل اس کے صحیح معنی یا کوئی تصور ذہن میں پیدا نہ کر سکے کہ خود کو جاننا کیا ہوتا ہے اور اس سے کیا فائدہ ہے یہ خیال عوام کی نفسیات کے بالکل مطابق ہے۔ لوگ تو فائدہ اس کو سمجھتے ہیں جو کہ مادی صورت میں ان کو حاصل ہو سکے مال و دولت کی صورت میں یا جاہ و حشمت کی صورت میں ہو۔ اس لیے لوگ فطری طور پر علم فلسفہ سے دلچسپی بہت کم لیتے تھے اور یہ بیکاروں کا مشغلہ سمجھا جانے لگا یا چند عجیب و غریب اور انوکھے خیال آفرینی کا مجموعہ۔ مابعد الطبیعیات کا وجود بھی اتنا پرانا ہے جتنا کہ حضرت انسان۔ یہ تو صرف زندگی بعد ممات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے لوگ تو موجودہ اور مستقبل قریب کی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کو افکار معیشت ہی فرصت نہیں دیتے کہ وہ اس قسم کی ذہنی عیاشیوں میں حصہ لے سکیں یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ انسان مسرت کا خواہاں ہے یہی خواہش سائنس کے وجود اور تمدن کی ترقی کا باعث ہوئی۔ مال و دولت کی آرزو، جاہ و حشمت کی تمنا اس لیے ہے کہ ان کے خیال میں ان چیزوں کا مالک مسرت آشنا ہوتا ہے لیکن مابعد الطبیعیات اس خیال سے کوسوں دور ہے۔ اس لیے مابعد الطبیعیات سے عدم دلچسپی اور بے زاری فطری امر تھا۔ گو فلسفہ نفس کا وجود بھی زمانہ قدیم سے ہے لیکن انیسویں صدی سے یہ نظریات سے گزر کر عملیات میں دخل دینے لگا۔ بیسویں صدی میں تزکیہ نفس نام کی ایک تحریک کی یوگا سے نمود ہوئی اور انسان کے تمام افکار پر چھا گئی ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کے صحت بخش اثر سے محفوظ نہ رکھا جا سکا انسانی عمل کا کون سا ایسا گوشہ ہے جس پر تجزیہ نفس کا اثر نہ پڑا ہو اور تعلیم، جنگ، جنسیات، آرٹ ان سب کی گویا کایا کلپ ہو گئی ہسٹریا اور اعصاب زدہ

عوارض سے اس نے محض تجویزوں اور باتوں سے کامیاب علاج کیے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ سب عوارض عصبانی نہیں ہیں بلکہ نفسی ہیں اس لیے ایسے مریضوں کو بجائے دوا دینے کے تزکیہ نفس کے اصول کے ماتحت علاج کرنا چاہیے۔ اس لیے یہ عمل فلسفہ ہے۔ کیا یہ فلسفہ تزکیہ نفس انسان کے لبوں تک جام مسرت لا سکتا ہے؟ کیا اس کا وہی حشر نہ ہوگا جو دیگر نظریاتی فلسفوں کا عوام کے ہاتھوں سے ہوا ہے؟ باوجود سائنس اور تمدن کی ترقی کے انسان مسرت سے محروم ہے اس لحاظ سے انسان نے ترقی معکوس کی ہے انسان اس لیے ناشاد ہے کہ اس کے جبلی میلانات کچھ اور ہیں اور بیرونی حالات کچھ اور۔ اس سے طبیعت میں خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ ذہن متضاد قوتوں کی رزم گاہ بن جاتا ہے انسان گھبرا جاتا ہے بے کل ہو جاتا ہے۔ کسی طرح چین نہیں ملتا۔ دنیاوی ثروت ہوتے ہوئے بھی دل غم سے نڈھال رہتا ہے اور بے وجہ اداس رہتا ہے۔ اس قسم کی مشکل کا حل تجزیہ نفس ہے یہ انسان کے خیالات کی چھان بین کرتا ہے اس کی بے چینی کی اصل وجہ دریافت کرتا ہے۔ متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے تلاطم جذبات کو سکون میں لاتا ہے اور انسان اس بے چینی سے آزاد ہو جاتا ہے اب ہم پہلے تجزیہ نفس کے بانی سگمنڈ فرائیڈ کی زندگی پر اجمالی نگاہ ڈالتے ہیں اس کے بعد تفصیلاً اس کے فلسفہ کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سگمنڈ فرائیڈ آسٹریا کے دارالسلطنت وائنا میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوا۔ فرائیڈ کالج میں بہت ذہین اور طباع طالب علم تھا اور ہمیشہ امتحان میں اول رہتا۔ اگرچہ اس کے یہودی والدین کی مالی حالت پتلی تھی لیکن پھر بھی اس کے والد نے اس کو اختیار کلی دیدیا کہ اپنی افتاد طبع کے مطابق جو پیشہ چاہے اختیار کرے اس زمانہ میں اسے علم طبابت سے کوئی خاص شغف دلگاؤ نہ تھا لیکن انسان اور اس کی جبلت کے رازہائے سربستہ کا متلاشی تھا ڈارون کا نظریہ اس کو بہت بھایا گوئٹے کے من موہنے مضمون "فطرت" سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کی راہ اسی کی روشنی میں متعین کی اور میڈیکل اسکول میں داخل ہو گیا۔ فرائیڈ کے متعلق کوئی کتاب ایسی شایع نہیں ہوئی جس سے اس کے نجی حالات روشنی میں آتے ہوں اس نے خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی۔

لیکن ان سے صرف اس کے فلسفیانہ خیالات کی نشوونما اور ارتقا کا علم ہوتا ہے۔ اس کا نجی ماحول اور عملی زندگی بدستور تاریکی کے پردے میں رہتے ہیں صرف اس کی مختلف تصانیف میں اس کی زندگی کے چند چھپے ہوئے گوشے قلم کی غیر ارادی لغزش سے سرک گئے ہیں جو اس کے اصلی جذبات اور احساسات کے آئینہ دار ہیں خصوصاً تعبیر خواب میں تو اس کی زندگی مدفن ہے اس کے زمانہ طالب علمی میں یہودی قوم اور حقیر و کمتر سمجھے جاتے تھے تہذیب و تمدن کی تمام آسائشیں اور سوسائٹی کی تمام وسعتیں اس بدنصیب قوم پر تنگ تھیں اس لیے فرائیڈ کو یہودی ہونے کے باعث سن بلوغ ہی سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ ماحول کی ناموافقت اور حالات کی ناساعدت اس کی سیرت کی عمدگی اور عزم کی پختگی کا باعث ہوئی ۱۸۸۵ء میں ڈاکٹر شاکر کی شہرت کشاں کشاں فرائیڈ کو پیرس کھینچ لائی جہاں ڈاکٹر شاکر تنویمیت کے ذریعہ ہسٹریا اور اعصابی امراض کا علاج کر رہا تھا۔ اس کے ہاں زانوئے تلمذ تہہ کیا اور یہاں تنویمیت کی عملی تعلیم حاصل کی اور ایک سال شاگرد کی حیثیت سے استاد کی تصانیف کا مترجم رہا۔ بالآخر ۱۸۸۶ء میں وائنا واپس ہوا اور اس دوشیزہ سے شادی کی جو کہ عرصہ چار سال سے دور دراز شہر میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

پہلے چند سال فرائیڈ تنویمیت اور برقیاتی علاج کرتا رہا لیکن کچھ عرصہ بعد اسے معلوم ہوا کہ اعصابی امراض کے لیے برقیاتی علاج موثر نہیں ہے ہاں تنویمیت کے طریقۂ علاج سے کچھ اچھے نتائج تو ضرور پیدا ہوئے لیکن یہ (تنویمیت) ہر مریض پر کارگر نہیں ہوتا تھا اگر ہو بھی جاتا تو پھر بھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوتا۔ اس طرح تنویمیت اور برقیاتی علاج تجربات کی کسوٹی پہ پورے نہیں اترے۔ اس لیے فرائیڈ ان سے دست کش ہو گیا اور ایک نیا طریقۂ علاج تخلیق کیا جو کہ تجزیۂ نفس کے نام سے مشہور ہے اس کو باتونی یا باتوں کا علاج بھی کہتے ہیں کیونکہ دوا یا عمل جراحی کے استعمال کے بجائے مریض سے صرف باتیں کی جاتی تھیں اور مریض سے کہا جاتا کہ جو بھی خیالات ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ اس کے ذہن میں آئیں بےکم و کاست بغیر کسی قطع و برید کے بیان کر دے۔ اس طرح سے ہسٹریا کے مریض کے دل کی بھڑاس نکل جاتی اور محبوس شدہ جذبات جو مرض کا اصل باعث ہوتے آزاد ہو جاتے اور مریض صحت یاب

ہو جاتا۔ ہسٹریا کے مریض کے ساتھ مسلسل ربط ہونے کی وجہ سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سب عموماً بہت خواب دیکھتے ہیں فرائیڈ ان کی حقیقت اور ماہیت معلوم کرنے کے درپے ہوگیا اور تقریباً ایک ہزار خواب کی کامیاب تعبیریں دیں اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ خواب خواہش کی تکمیل کا اظہار ہے کیونکہ انسان کی بہت سی خواہشیں جو شرمندۂ تکمیل نہیں ہوتیں نفس نیم شعوری میں دب جاتی ہیں اور اظہار کی راہ ڈھونڈتی رہتی ہیں خواب بھی ایک طریقہ ہے محبوس شدہ جذبات کے اظہار کا۔ اس نے ایک عظیم الشان کتاب "خوابوں کی تعبیر" لکھی جو کہ سنہ ۱۹۰۰ء میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد فرائیڈ اپنے خیالات کا اظہار جلسوں میں کرنے لگا۔ پہلے جلسہ میں حاضرین کی تعداد تین افراد پر مشتمل تھی اور وہ تین اشخاص سٹیگر، آڈلر اور سٹیکل تھے مؤخرالذکر دو اشخاص نے بعد میں فرائیڈ سے علیحدہ ہو کر تجزیۂ نفس کے کام میں خاص شہرت حاصل کی اب ہم تفصیلاً فرائیڈ کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اصول جبریت کی عضویاتی تشریح | فرائیڈ کی تعلیمات کا سنگ بنیاد اس اصول پر مبنی ہے کہ نفسی یا ذہنی زندگی کے تمام واقعات ایک سلسلہ میں مربوط ہیں اس معنی میں کہ ہر کوئی واقعہ گزشتہ واقعہ کی ایک کڑی ہوتا ہے جس طرح طبیعیات اور کیمیات نے مادے کے خواص سے بحث کی اور بتایا کہ دنیا کی تمام چیزیں خاص قوانین کے ماتحت کام کرتی ہیں اسی طرح تجزیۂ نفس نے واضح کیا کہ انسانی نفس بھی قانون علت کی کارفرمائی کے تابع ہے اور انسان کا ہر خیال ایک خاص سبب کے ماتحت وجود میں آتا ہے اور کوئی خیال کی سوء اتفاق یا حسن اتفاق سے دل میں نہیں اٹھتا بلکہ یہ صرف ہماری کوتاہ بینی ہے جو کہ سطح ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور گہرائی میں ڈوب کر حقیقت کے جوہر تابناک کو نہیں پاتی۔

فلسفیوں نے سہولیت کی بنا پر نفس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی نفس شعور اور نفس لاشعور۔ نفس شعور ادراک کا ایک آلہ ہے۔ ہر وہ ذہنی حرکت جس کا انسان کو علم ہو نفس شعوریہ میں ہوتی ہے۔

نفس لاشعور۔ یہ لفظ بہت مشہور ہے اور اہم بھی اس کی تعریف یوں کر دینی کافی ہے کہ یہ جامع لفظ اپنے اندر سب عضویاتی تبدیلیوں کے مفہوم کو لیے ہوئے ہے جو ہماری توجہ سے بچ جاتی ہیں وہ تمام بھولے ہوئے ماضی کے تجربات اور تاثرات جو ہماری آرزوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں خواہ ہم ان سب

باتوں کو یاد بھی نہ رکھتے ہوں لاشعور اس قسم کے خیالات پر مشتمل ہے۔ لاشعور کو ایتھر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کہ اس دنیا کو ڈھانپے ہوئے ہے لیکن نخچیر نگاہ نہیں۔ صرف اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے فرائیڈ کے خیال کے مطابق لاشعور کے اعمال کی نمایاں خصوصیت ان کا ابدی اور سرمدی ہونا ہے یہ ناقابل فنا ہے یہ زندہ جاوید ہے۔ ہر وہ بات جو نفس شعور اہم نہیں سمجھتا نفس غیر شعوری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس طرح کسی گروہ یا قوم کا نفس لاشعور قدیم اور موروثی خواہشات کا ذخیرہ اور فرد کا نفس لاشعور زمانہ بچپن کے تاثرات اور تجربات کا ذخیرہ ہے۔ انسان امنگوں کے فردوس تعمیر کرتا ہے تمناؤں کی دنیا آباد کرتا ہے لیکن زندگی کے تلخ حقایق ایک پہاڑ بن کر راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھٹھکی ہوئی امنگیں یہ ابھری ہوئی خواہشات دب کر رہ جاتی ہیں لیکن مٹتی نہیں نیست و نابود نہیں ہوتیں بلکہ لاشعور میں پناہ لیتی ہیں اور موقع کی تلاش میں رہتی ہیں کہ ابھریں اور عالم ظہور میں آئیں لیکن نفس شعور صرف اُن دبے ہوئے خیالات و جذبات کے اخراج کی اجازت دیتا ہے جو کہ مروجہ سوسائٹی کے اصولوں کے ہم آہنگ ہوں جن کو تہذیب وقت کی تائید حاصل ہو اور جو اس کے برعکس ہوں ان کو دبا دیتا ہے اس عمل کو احتباس کہتے ہیں جس طرح پہاڑوں کے اندر پانی باہر پھوٹ نکلنے کی کوئی کمزور جگہ اور راہ تلاش کر لیتا ہے اسی طرح احتباس شدہ خیالات خارج ہونے کے کئی راستے نکال لیتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں بھول چوک لغزش زبان لغزش قلم خواب وغیرہ۔ اب ہم ان پر تجزیاتی نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) کچھ عرصہ سے کسی میاں بیوی کے درمیان شکر رنجی ہو گئی تھی مگر دونوں دل میں ایک دوسرے کی صفات کے قائل تھے ایک دفعہ جب اس کی بیوی صبح کی چہل قدمی کے بعد واپس آئی تو اپنے خاوند کو ایک کتاب پڑھنے کے لیے دی جو کہ اس کے خیال میں بہت دلچسپ تھی اس کے خاوند نے کتاب کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور پڑھنے کا وعدہ کر کے کسی جگہ رکھ دی تاکہ اطمینان کے وقت مطالعہ کرے لیکن اس کے بعد پڑھنے کی ضرورت ہوئی تو کتاب تلاش کرنے پر نہ ملی۔ اس واقعہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی والدہ جو کہ کسی دوسرے شہر میں تھی علیل ہو گئی اور اس کی حالت

تشویشناک صورت اختیار کر گئی اس کی بیوی تیمار داری کے لیے ساس کے پاس گئی اور بڑے انہماک اور خلوص دل سے خدمت کی بالاخر ساس صحت یاب ہو گئی جب واپس خاوند کے پاس آئی تو اس کو بہت خوش پایا کیونکہ اس نے اس کی والدہ کی بہت خدمت کی تھی۔ اس طرح پرانی شکر رنجی دور ہو گئی جب وہ آفس سے واپس گھر آیا تو بغیر کسی خاص ارادے کے میز کی دراز کو کھولا تو گمشدہ کتاب کو اوپر پڑا ہوا پایا۔

اب سوال یہ ہو کہ پہلے اس کو کتاب کیوں نہ ملی اور اب کیوں مل گئی؟ یہ کتاب اس لیے بھول گیا تھا کہ یہ کتاب اس کی بیوی کی تھی جس سے اس کی شکر رنجی تھی کتاب فوراً اس شخص کی یاد دلاتی تھی جسے وہ ناپسند کرتا تھا اور رہنا پسند یہ چیز نفس بھلا دینا چاہتا ہے تاکہ ذہنی کوفت سے بچے۔ اس لیے نفس شعور نے اسے بھلا دیا جب ان کے تعلقات بہتر ہو گئے اور بیوی کے خلاف جو ناپسندیدگی کا جذبہ تھا اس کے اخلاق حسنہ نے زائل کر دیا تو یہ کتاب خود بخود مل گئی۔

(۲) ایک شخص کسی کا نام بھول گیا یہ نام پونڈ (یعنی تالاب) تھا تجزیہ سے بچپن کی ایک دبی ہوئی یاد ظاہر ہوئی جب وہ لڑکا تھا تو اس کا ایک کتا تھا جس سے اسے بے حد محبت تھی ایک روز اس نے تالاب میں ایک پتھر پھینکا تاکہ پانی کی چھینٹوں سے کتے کو ڈرائے بدقسمتی سے وہ پتھر کتے کو جا لگا کتا زخمی ہو کر تالاب میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا اس سانحہ سے لڑکے کو انتہائی ندامت ہوئی اور کئی دن تک پریشان رہا یہ افسوسناک واقعہ دل کے اندر دب گیا اور بھلا دیا گیا لیکن برسوں کے بعد اس کے اثرات کا اظہار اس طرح ہوا کہ بڑے ہو کر اسے پونڈ (تالاب) کے لفظ سے جبلی نفرت ہو گئی اور نتیجۃً یہ نام جلد بھول گیا۔

(۳) لغزش زبان۔ ایک ڈاکٹر ایک دولتمند مریض کا معالج تھا جب اس کے مریض کو کچھ افاقہ ہوا تو اس نے کسی صحت افزا مقام کو جانے کا ارادہ کیا ڈاکٹر نے اس تبدیلی مقام کے فوائد بتلاتے ہوئے کہا تمہارا وقت بہت ہی اچھے طریقے سے گزرے گا اور میرا خیال ہو کہ تم بستر علالت کو جلد نہیں چھوڑو گے۔

یہاں بھی صاف ظاہر ہے کہ نیم شعوری طور پر ڈاکٹر کے دل میں خود غرضانہ جذبہ کام کر رہا تھا جو کہ لغزش زبان کا باعث ہوا۔ ظاہری طور پر تو ڈاکٹر کا سلوک مریض کے ساتھ نہایت مخلصانہ اور ہمدردانہ تھا اور مریض کے مفاد کو اولین جگہ دیتا تھا اور معاوضہ کو خاطر میں نہ لاتا تھا لیکن دولتمند مریض کو عرصہ تک زیر علاج رکھنے کی خواہش اس کے نفس لاشعور میں لہریں لے رہی تھی۔ جس کا اظہار لغزش زبان کی صورت میں ہوا۔

(۳) ایک نادار نوجوان نے ایک امیر بڑھیا عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور ان الفاظ میں اپنے دوستوں سے اس آنے والے واقعہ کا اعلان کیا "میں مس فلاں کو لوٹنا نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے بیاہنا چاہتا ہوں"

(۴) لغزش قلم۔ ایک دوشیزہ نے اپنی ایک سہیلی کو جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی لکھا کہ "امید ہے کہ تم خیریت سے ہو گی اور بہت ناخوش" گو یہ محض قلم کی ایک لغزش تھی لیکن اس سے اس کے چھپے ہوئے حسد کا صاف پتہ چل گیا۔

بعض اوقات ہم کسی خط کو ڈاک میں ڈالنا بھول جاتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو ہم خط ڈالنا ہی نہیں چاہتے تھے یا مکتوب الیہ سے نفرت ہے یا جس جگہ خط بھیجا جا رہا تھا اس جگہ کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا ہے اس جگہ کا نام تلازم خیالات سے کسی ایسی جگہ یا شخص کا نام یاد دلاتا ہے جس کو ہم نہیں چاہتے۔ ہم بل ادا کرنا بھول جاتے ہیں کیونکہ روپیہ کا ہاتھ سے جانا کسی کو اچھا نہیں لگتا لیکن کسی سے لینا نہیں بھولتے قاعدہ کلیہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نفس شعور ناپسندیدہ چیز کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے واضح ہو گیا ہے کہ کس طرح نفس لاشعور نفس شعور پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے عمل کو متعین کرتا ہے یہاں تک کہ ہونے والی شریک زندگی کے انتخاب میں غیر شعوری طور پر ان ذہنی اور جسمانی خصوصیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں جو کہ ہم نے والدہ، ہمشیرہ، دایہ یا کسی ملاقاتی میں پاتے تھے۔ ان ہی خصوصیات کو ہم پسند کا معیار قرار دیتے ہیں۔ یہ بھول چوک، لغزش زبان اور لغزش قلم اس بات کی شاہد ہیں کہ نفس شعور اور نفس لاشعور کی خواہشیں عموماً

متضاد ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر کی مثال کو لیجیے ڈاکٹر کے دل کی گہرائیوں میں دولتمند مریض کو کچھ عرصہ تک زیر علاج رکھنے کی خواہش دبی ہوئی تھی لیکن ظاہرداری رکھنے کے لیے نیک نیتی اور خلوص کا اظہار کر رہا تھا۔ ان دو متضاد قوتوں کا وجود اس کی لغزش زبانی سے آشکارا ہو گیا کہ "تم بستر علالت کو جلد نہیں چھوڑو گے"۔ اس لیے ان دونوں قوتوں میں توازن رکھنا ہی انسانی زندگی کا مشکل ترین کارنامہ ہے اور یہ کہ ہم ایسا کرنے میں ناکام رہتے ہیں اس کا مین ثبوت پاگل انسانوں میں ملتا ہے دوسری بات کہ تشفی کی حد تک ان دونوں قوتوں کا ہم آہنگ رکھنا قابل عمل ہے اس کا ثبوت ان اشخاص میں ملتا ہے جو زندگی کے مقاصد کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کرتے ہیں اور تیسرے یہ کہ نفس شعور اور نیم شعور میں مکمل یگانگت حاصل ہو سکتی ہے دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹ ان کا زندہ ثبوت ہیں کیونکہ آرٹسٹ میں دونوں قوتیں یکجا اور ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ شعوری طور پر آرٹسٹ جو چیز تخلیق کرتا ہے تو اس تخلیق شدہ چیز میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کہ شعور کو معلوم نہیں ہوتیں یہ سب خیالات لاشعور کے ہوتے ہیں اس لیے جتنا ہی شعور اور لاشعور میں اتحاد ہوگا اتنا ہی آرٹسٹ کے ذہن میں خیالات کی فراوانی ہوگی۔ اقبال کا جاوید نامہ، شیکسپیر کا ہملٹ اور فرائیڈ کا فلسفہ لاشعور یہ سب دونوں قوتوں کی یک رنگی اور یک جہتی کا شاہکار ہیں۔

(باقی)

رشید الدین بی۔ اے

غزل

سانس ہو گرم و تیز سینے میں ہوئی جاتی ہو دیر جینے میں
پھونک ڈالے جو نظم کہنہ تمام آگ ایسی ہو تیرے سینے میں
ذرہ ذرہ ہے حالِ کونین بحرِ خود غرق ہے سفینے میں
پڑ گیا عکس روئے جاناں کا آبِ حیواں ہو تر پسینے میں
آنسوؤں پر نہ جا اے دوست کوہِ آتش فشاں ہو سینے میں
جو نئی زندگی سے جلتے تھے جل گئے آج اپنے کینے میں
تھرتھراتے ہیں ہاتھ کیوں صیاد پر کترنے میں ہونٹ سینے میں
آبِ حیواں کا مل رہا ہو سواد زہر کا گھونٹ آج پینے میں
سمِ قاتل کا آ رہا ہے مزا آج آبِ حیات پینے میں
تیرا مرنا ہو یا ترا جینا نہ یہ مرنے میں ہو نہ جینے میں
میرے دل میں ہو عکس رخ تیرا کیا جھلک ہے اس آبگینے میں

اور دکھ ہو کہ ہجرِ دوست فراقؔ
آج کچھ درد سا ہے سینے میں

فراقؔ گورکھپوری

تجلیات

غمِ حیات غمِ عشق کو مٹا نہ سکا
یہ آگ تھی ہی کچھ ایسی کوئی بجھا نہ سکا

فنا حرام ہے تیرے نیاز مندوں پر
ہزار چاہا فلک نے مگر مٹا نہ سکا

تری تلاش میں کون و مکاں تو دیکھ لیے
یہ بات الگ ہے ابھی تک میں تجھ کو پا نہ سکا

جسے ملی تری الفت کی شورشِ مستی
وہ قلب وسعتِ کونین میں سما نہ سکا

تری نگاہ نے جس دل کے ہوش چھین لیے
وہ خوش نصیب کبھی ہوش میں پھر آ نہ سکا

وہ دستِ شوق نہیں دستِ شوق اسے نہ کہو
ستارے توڑ کے جو آسماں سے لا نہ سکا

ہنسی خوشی سے دل اپنا اٹھائے پھرتا ہے
وہ بارِ عشق جسے آسماں اٹھا نہ سکا

حریمِ حسن کے لائق کہاں ہے صہبائی
وہ دل کہ دار پہ چڑھ کر جو مسکرا نہ سکا

اثر صہبائی

دو غزلیں

(۱)

گدائے راہ کہاں، قصرِ بادشاہ کہاں — اڑا کے لے گئی یہ آہِ صبحگاہ کہاں
مری جبیں کو میسر کہاں وہ سجدۂ شوق — مرے نصیب میں اب ان کی بارگاہ کہاں
لبوں پہ پردہ کشائی کا ذکر کیوں آیا — جمالِ یار کے قابل مری نگاہ کہاں
ابھی ملیں کہ کبھی۔ وہ مجھے ملیں تو سہی — مرے نیاز کی دنیا میں سال و ماہ کہاں
یہاں حیات کا کھٹکا وہاں حیات کی قید — جہاں پناہ ملے گی مجھے پناہ کہاں
کوئی تو اُن کو سنا دے مرا فسانۂ غم — مگر کسی کی ستاروں سے رسم و راہ کہاں

ندیم، اور تماشائے حسن بے پروا!
گلیم پوش کہاں: صاحبِ کلاہ کہاں!

(۲)

اس قلبِ بے قرار میں جانے چھپا ہے کیا — میں جانتا نہیں ہوں مرا مدعا ہے کیا
جس نے مری امید کی دنیا اُجاڑ دی — سرگرمِ ناز پھر وہی طوفاں ہوا ہے کیا
جنت بھی تیری دَین، جہنم بھی تیری دَین — اتنا مجھے بتا دے کہ تیری رضا ہے کیا
تجکو اگر سزا سے غرض ہے سزا ہی دے — کس منہ سے میں بتاؤں کہ میری خطا ہے کیا
ہنگامہ مچ رہا ہے خیالوں کی بزم میں — تو نے دبی زبان میں جانے کہا ہے کیا

احساس کی تپش سے ہیں جل مرا ندیم
اللہ! اس جہاں سے ابھی ماورا ہے کیا!

احمد ندیم قاسمی

قایم چاندپوری

(شیخ محمد قیام الدین قایم چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے بسلسلہ روزگار ابتدا سے دلی میں رہنا ہوا میر، سودا اور درد وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ دلی کے بگڑنے پر ٹانڈہ پھر رامپور اور لکھنؤ گھومتے پھرے سنہ ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔ کلام اعلیٰ درجہ کا ہے بعض لوگ سودا و میر کے بعد ان ہی کو مانتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو)

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا　　درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

ہنگامے میں ہم صیادی کے یاتک پھنسے کہ آہ　　مقصود تھا جو اپنے تئیں کام رہ گیا

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند　　کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

نے تجھ پہ وہ بہار رہی اور نے یہاں وہ دل　　کہنے کو نیک و بد کے اک الزام رہ گیا

اے ابر اپنے گریہ میں جس وقت جوش تھا　　جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں بدوش تھا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا　　آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ　　کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا　　دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا

اس دشت پر سراب میں بھٹکے بہت پہ حیف　　دیکھا تو دو قدم پہ ٹھکانا تھا آب کا

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا　　تیر سا کچھ دل سے گزر کر گیا

خاک کا سا ڈھیر پڑا رہ ہوں میں　　قافلۂ عمر سفر کر گیا

چپکے ترے کوچہ سے گزرا نہیں　　نالہ اک عالم کو خبر کر گیا

تا بفلک نالہ تو پہنچا تھا رات　　میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

پوچھ نہ قایم کٹی کیونکر عمر　　جوں ہوا یک چند بسر کر گیا

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن سے بھی دور گیا

رہبر فرقۂ اسلام رہا ساری عمر
حیف یہ ہو کہ میں آپ مسلماں نہ ہوا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہو صیاد
ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہو صیاد

گرفتہ طبع جو مجھ سا چھٹا قفس سے تو کیا
رہائی جس کی اسیری کا ننگ ہو صیاد

نہ گل بجا ہیں نہ بلبل چمن میں نغمہ سرا
مری خلاصی میں اب کیا درنگ ہو صیاد

قفس کی تنگی سے میں ہی نہ تنگ ہوں صیاد
مری بھی تنگی حالت سے تنگ ہو صیاد

کی کس کی نگاہوں نے یہ تاثیر ہوا پر
چلتی ہے جو یہ برق سی شمشیر ہوا پر

بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

دے طول امل نہ وقت پیری
ہوئی صبح فسانہ مختصر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

نہیں کہتا میں کر ترک تمنا
پہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر

فریب باغباں پر ہو کے غافل
نہ لے بلبل اکٹھے خار و خس کر

بسا عمر ہو قایم کوئی دن
لے جوں گل پیارے کاٹ ہنس کر

غیر اس کے کہ خوب روئیے اور
غم دل کا کوئی علاج نہیں

اب بھی قیمت ہو دل کی گوشۂ چشم
اتنی یہ جنس بے رواج نہیں

دو جہاں بھی ملے تو بس ہے نہیں
یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

مجلس مے سے مشابہ ہے خرابات جہاں
جان کر یاں جو نہ مست وہ ہشیار نہیں

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قایم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں
دونوں عالم سے پھرے بیٹھے ہیں

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سوانح امام ابن تیمیہ:۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام جیلانی خاں صاحب برق ایم۔ اے۔ پی، ایچ، ڈی ملنے کا پتہ مکتبہ اردو لاہور، حجم ۲۰۰ صفحے، قیمت درج نہیں لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ سفید چکنا۔

اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے امام تیمیہ کے حالات الندوہ میں لکھے چودھری غلام رسول صاحب مہر نے ایک مختصر رسالہ میں امام موصوف کے سوانح حیات اور ان کے علمی کارناموں پر تبصرہ کیا لیکن اب تک علامہ موصوف کا کوئی جامع مرقع ہماری زبان میں موجود نہ تھا ڈاکٹر غلام جیلانی خاں صاحب مستحق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے امام موصوف کے سوانح حیات کے متعلق ایک مبسوط کتاب شایع کر کے ملت اسلامیہ ہند کو ممنون فرمایا۔

فاضل مصنف نے اس عہد کی سیاسی و مذہبی حالت دکھلا کر نہایت شرح و بسط سے امام صاحب کے اصلاحی کارنامے دکھلائے ہیں۔ ان پر نہایت فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بحث کر کے امام صاحب کے دیگر ہمعصروں سے موازنہ کیا ہے امام صاحب اپنے وقت کے سب سے بڑے مجاہد تھے اور عام اصحاب علم کی طرح اُن کا جہاد محض زبان و قلم یا وعظ و تقریر تک محدود نہ تھا بلکہ جہاد بالسیف میں بھی وہ سب پر گوئے سبقت لے گیے۔ نصرت حق میں ان کی پامردی اور دلیری حیرالعقول تھی۔

کتاب میں پیش لفظ مولانا غلام رسول صاحب مہر مدیر انقلاب نے تحریر فرمایا ہے۔ مقدمہ جو مصنف کا ہے زبان نہایت پاکیزہ انداز بیان شگفتہ ہے۔ پانچ ابواب ہیں پہلا باب ولادت حمویت اور تعلیم وغیرہ، دوسرا تحریک تجدید، تیسرا تصانیف۔ چوتھا امام صاحب کے اختلافی مسائل اور پانچواں وفات پر ہے۔

جواہر العلوم:- مترجمہ مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل، پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور پبلشر کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۳ ضخامت ۲۲۰ صفحے، قیمت دو روپے، لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ہے۔

پیش نظر کتاب مصر کے مشہور عالم علامہ طنطاوی جوہری کی تصنیف جواہر العلوم کا بامحاورہ سلیس ترجمہ ہے جس میں انھوں نے ایک قصہ اور مکالمہ کی صورت میں بہت سے قدیم و جدید عجائبات قدرت کے فواید و مصالح علمی اصول کے مطابق دکھلاے ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے مقدمہ میں سبب سفر کا بیان ہے۔ پہلے باب میں زمین کے عجائبات کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں عالم بالا کی کائنات کا ذکر ہے تیسرے باب میں وہ آیتیں لکھی ہیں جن کا تعلق ان دونوں ابواب سے ہے خاتمہ میں دوستوں کے آپس میں ملاقات کا ذکر ہے۔

شروع میں ایک مختصر مقدمہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"یہ ترجمہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے پڑھنے کے قابل ہے کیونکہ اس سے ایک طرف تو ان کے ایمان و عقیدہ میں پختگی پیدا ہوگی دوسری طرف علم کی وسعت اور گہرائی کی طرف ان کا میلان پیدا ہوگا اور ان کو معلوم ہو جائے گا کہ علمی ہم مذاقی کے ذریعہ سے کیونکر تعلقات زناشوئی میں خوشگواری پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ عام فہم اور سلیس ترجمہ اس قابل ہے کہ بچوں کے دینیات کے نصاب میں شامل کیا جاے اور اس کے ذریعہ سے ان کو عقاید کی تعلیم دی جاے۔"

(ش سندیلوی)

ناکام:- مصنفہ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، لکھائی چھپائی دیدہ زیب، قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ خواجہ محمد شفیع اردو مجلس پبلشر میا محل دہلی

خواجہ صاحب پرانے لکھنے والے ہیں اور اچھا لکھنے والے ہیں۔ زبان کی لطافت اور انداز بیان کی پاکیزگی ان کا خاص حصہ ہے پیش نظر تصنیف میں انھوں نے تشبیہات اور استعارات میں

...ص حدت اور ندرت پیدا کی ہے جس سے ان کی صاف ستھری دہلی کی خاص ٹکسالی زبان کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

کتاب کا موضوع ایک ایسی طوائف کی سرگزشت ہے جو صرف داد عیش دینے اور پیسہ لوٹنے کی مشین نہیں ہے بلکہ ہماری آپ کی طرح ایک انسان ہے جس کے دل بھی ہے اور دماغ بھی اس جذبات میں بھی کبھی مدوجزر کا طوفان اُٹھتا ہے اور وہ بھی کبھی گناہ کی مہیب تاریکی میں نجات کی روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے ـــــ لیکن کیا ہماری سماج اس کو اس کی اجازت دیتی ہے؟ بہت دنوں ہم اس تصویر کو صرف ایک ہی رُخ سے دیکھا کیے اور خود فریبی میں مبتلا رہے لیکن اب اس حقیقت پرستی کے دور میں ضرورت ہے کہ ہم اس کا دوسرا رخ بھی دیکھیں ـــــ ممکن ہے کہ اس میں ہمیں اپنے ہی خدوخال نظر آئیں۔

موضوع اگرچہ پامال ہے اور اس پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جس میں سب سے زیادہ قابل ذکر لیلےٰ کے خطوط، مصنفہ قاضی عبدالغفار صاحب ہے تاہم فاضل مصنف نے اپنے زور قلم ـــ اپنی کتاب کے لیے ایک نئی جگہ پیدا کر ہی لی ہے۔ فسانہ کا پلاٹ کچھ الجھا ہوا اور مکالمے ذرا [illegible] سکے ہیں، ہیرو کا کردار اپنی انتہا درجہ کی چرب زبانی اور فلسفہ خوانی کے باعث بالکل غیر فطری ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود کتاب کامیاب ہے لائق مصنف نے اپنے طرز بیان کی صباحت اور طنزیہ جملوں کی حلاوت نے کتاب پر ایک خاص قسم کی پالش کر دی ہے جس سے کسی صورت کتاب کی آب وتاب کم نہیں ہونے پاتی کتاب سبق آموز ہے اور لائق مطالعہ (و۔ سندیلوی)

سنہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں: ملنے کا پتہ و مرتبہ حلقہ ارباب ذوق لاہور صفحات ۶۰، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

حلقہ ارباب ذوق لاہور نے سنہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظموں کا یہ مجموعہ پیش کیا ہے جو تین افراد کی زیر نگرانی مرتب ہوا شروع میں ۱۱ صفحے کا ایک ابتدائیہ بھی ہے جس میں م صاحب نے شاعری کے موجودہ رجحانات پر [illegible] ڈالی ہے کوئی بائیس جدید قسم کے شعرا کے بہترین شاہکار جو سنہ ۱۹۴۱ء میں مختلف رسالوں میں نکلے جمع کیے

گئے ہیں اور ان کے انتخاب میں بڑی محنت اور کاوش کی گئی ہے اور ذہنی پس منظر میں شعر کی وضاحت یوں رکھی گئی۔ "کوئی خیال یا احساس یا جذبہ جس کی ترجمانی کم سے کم اور مناسب ترین اور بہترین لفظوں میں کی جائے اس کے بعد شعر یا نظم کے دو تین پہلو مقرر ہوے پہلا خیال یا موضوع کا اور دوسرا فنی۔۔ خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کا بھی لحاظ رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی دوسری بات اس خیال یا موضوع کی ادب میں تخئیل یا فنی لحاظ سے بنفسہ اور ممکن ہو تو اضافی طور پر اہمیت اور درجہ اس کے ساتھ ہی کسی ادبی تحریک کی روشنی میں بنفسہ یا اضافی طور پر اس کی اہمیت اور کسی حد تک عصری شعر پر اس کا تاثر (یہ آخری نکتہ ذیلی ہے) دوسرا بڑا پہلو فن کے لحاظ سے تھا اس میں زبان، محاورہ بیان الفاظ کا انتخاب اور نشست ہے یا وزن کی خیال یا موضوع سے ہم آہنگی، نظم کی ہیئت تشبیہ استعارے کنایے وغیرہ جزئیات یہ سب باتیں مدنظر رہیں۔"

باوجود شعر کی اس تعریف اور طریقہ انتخاب کی اس وضاحت کے صحیح انتخاب دو تین افراد کے بس کی بات نہیں ہوتی سال بھر کی نظموں کے جائزہ کے لیے اس سے زیادہ افراد، نقاد اور شعرا کی شرکت ضروری تھی چنانچہ جہاں یہ صحیح ہے کہ بعض نظمیں بعض شعرا کی واقعی قابل تعریف ہیں مثلاً قاسمی، مختار صدیقی۔ قیوم نظر، تخت سنگھ مقبول حسین، شریف کنجاہی، اختر شیرانی، مطلبی فریدآبادی، شاد عارفی۔ مہدی علی خاں وغیرہ کی لیکن بعض اچھے شعرا کی ۱۹۴۲ء کی اچھی نظمیں نہ آسکیں مثلاً فیض احمد، جوش ملیح آبادی، راشد، میراجی وغیرہ کی۔ مگر اس کے کہنے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے کہ انتخاب ہر ایک کا اپنا جدا گانہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اگر اس میں خود شاعروں کی اپنی اپنی نظموں کے انتخاب کے متعلق رائے لے لی جاتی تو بہتر تھا۔ مزید یہ کہ پنجاب کے باہر کے شعرا کی طرف کچھ کم توجہی کو دخل رہا ہے۔

رسالہ الحکیم (دیسی طبی فارماکوپیا)، مرتبہ حکیم غلام محی الدین صاحب چغتائی ایڈیٹر الحکیم لاہور ملنے کا پتہ چشمۂ صحت اندرون موچی دروازہ لاہور، سائز ۲۶×۲۰/۸، صفحات ۲۱۵، قیمت عا۸

رسالہ الحکیم کا یہ دیسی طبی فارماکوپیا نمبر ہے جس میں بڑی محنت سے تمام بیماریوں کے لیے سہل اور مجرب نسخے جمع کر دیے گئے ہیں۔ عوام کے لیے یہ رسالہ بہت مفید ہے خصوصاً جہاں طبی امداد میسر نہ ہو سکے۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز راں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی، کراچی، اور کلکتہ سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

گذشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایا لیا اور نہ حج سروس بند کی

بمبئی اور کراچی سے عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں
تفصیلات کے لئے خط کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

[illegible] میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال — عالیجناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ	ساٹھ لاکھ روپے	
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
ادا شدہ سرمایہ	گیارہ لاکھ چھ ہزار چھ سو پانچ	

اپنے بیموں کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے، ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل ورسائل، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد۔

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل وعطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر جنا بلڈنگ لکھنؤ

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد (پشاور)

جنوری ۱۹۱۷ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے شائع ہوتا ہے۔

۱۔ آزادیٔ وطن کا داعی اور اسلامی حکومت کا نگہبان ہے

۲۔ صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاست کا آئینہ ہے

۳۔ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد اور ہندوستان کی قومی تحریکات کا ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔

سرحدی مقامات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد و افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار پسندوں کے لیے تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے چندہ رعایتی للعہ ششماہی ۳؍

منیجر ترجمان سرحد پشاور

دنیا بھر میں اسلامی خدمت بجا لانیوالا ماہوار میگزین

ریویو آف ریلیجنز (انگریزی)

جو ۱۹۰۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور ہر ماہ کی دس تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور جو غلطیاں اور غلط فہمیاں دیگر مذاہب نے اسلام کے متعلق پھیلائی ہیں ان کو دور کر کے اس عالمگیر مذہب کو اصلی رنگ میں پیش کرنا اور دیگر مذاہب پر تحقیقی تبصرہ اور موجودہ زمانے کے فلسفیانہ اور مذہبی رجحانات پر نظر رکھتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف چار روپے (للعہ)
نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہے۔

دفتر ریویو آف ریلیجنز انگریزی
قادیان (پنجاب)

ہفتہ وار صداقت کانپور

کانپور کا واحد قابل مطالعہ اخبار جو وسیع ترین اشاعت رکھتا ہے اس کی مقبولیت اور سنجیدگی کی وجہ سے تمام بڑے بڑے حضرات اس کے خریدار ہیں۔ اس میں ممالک اسلامیہ موجودہ جنگ اور موجودہ سیاست پر مقالے ہوتے ہیں ادب اور معلومات کے سلسلے میں سبد گل، ادب لطیف، عالم النسواں، بچوں کی دنیا، پردہ فلم اقوال زرین، موج تبسم اور دلچسپ معلومات کی سرخیوں سے مستقل مضامین دیئے جاتے ہیں، ہر اشاعت میں ایک مختصر افسانہ دلچسپ اور نصیحت آمیز ضرور ہوتا ہے اردو داں حضرات سے درخواست ہے کہ اسے ایک مرتبہ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

مفت لٹریچر کی تقسیم

جناب میاں محمد احمد علی صاحب الیکٹریکل انجینئر کپورتھلہ نے جو "البیان" کے ایک قدیم معاون ہیں ہمارے پاس چند دینی کتابوں کی ایک تعداد بھیجکر یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم البیان کے پڑھنے والوں میں تقسیم کردیں۔ ان کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسیح احمد (ضخامت ۴۸ صفحے) (۴) قیامت (ضخامت ۴۸ صفحے)

(۲) حیات و ممات کا مسئلہ (ضخامت ۳۲ صفحے) (۵) تقلید و تحقیق (ضخامت ۱۰۴ صفحے)

(۳) فلسفۂ روحانی (ضخامت ۴۸ صفحے) (۶) صراط مستقیم (ضخامت ۲۸۰ صفحے)

یہ کتابیں بلاغ کے قدیم و مرحوم معاون ڈاکٹر صادق علی صاحب ریٹائرڈ سرجن میجر کی تصنیفات سے ہیں ہمنے انکو سرسری طور سے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ معطی کی خواہش کے احترام میں انہیں ناظرین البیان کے ہاتھوں پہنچا دیا جائے خوشی کی بات ہے کہ یہ سارا لٹریچر قرآن مجید کی روشنی میں تحقیق و کاوش سے لکھا گیا ہے اور ہمارے ناظرین اس کے مطالعے سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے۔

اس سے پہلے بھی البیان کے نئے اور پرانے معاونوں کو "بلاغ" کے پرانے پرچوں کی صورت میں ایک رعایت پیش کی جا چکی ہے، یعنی جو صاحب اپنے سالانہ چندے کے ساتھ مزید عہ محصول ڈاک کے لئے بھیج دیتے ہیں، انہیں سالہ "بلاغ" کے ۴۴ منتخب پرچے، جن کا حجم ۱۳۰۰ صفحے سے زاید ہے، مفت ارسال کردیئے جاتے ہیں۔ آج ہم اس رعایت کیساتھ ان کتابوں کا اضافہ بھی کر لیتے ہیں۔ آئندہ سے جو اصحاب "البیان" کے سالانہ چندے کے ساتھ مزید عہ یعنی کل للعہ منی آرڈر کے ذریعہ ارسال فرمائیں گے، ان کے نام ایک برس کے لئے "البیان" جاری کرنے کے علاوہ ۱۴۰۰ صفحے کے بلاغ کے پرانے پرچے اور ۷۰۰ صفحے کی مذکورہ بالا کتابیں مفت بھیجی جائیں گی۔

ہم قارئین "البیان" سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف خود اس پیش کش سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس رعایت کی طرف متوجہ کریں گے۔ "البیان" کی اشاعت بڑھانے کے لئے یہ ایک اچھا موقع ہے۔ احباب کو اس طرف ضرور دھیان دینا چاہیئے۔

منیجر "البیان" امرتسر (پنجاب)


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس قیمت ۱۰۰ گولیاں بڑا بکس
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہِ راست اوکاسا ڈپو پارک منشن دہلی گیٹ دہلی

تعلیم پر دو نئی کتابیں

تعلیمی خطبات: - یہ مجموعہ ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے ان خطبوں کا، جو وقتاً فوقتاً ملک کی مختلف کانفرنسوں میں پڑھے گئے، مثلاً کاشی ودیاپیٹھ بنارس، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ، طبیہ کالج پٹنہ، بنیادی تعلیمی کانفرنس جامعہ نگر وغیرہ اور ان مضامین کا جو آل انڈیا ریڈیو کے ذریعہ نشر ہوئے، مثلاً اچھا استاد، بچوں کی تربیت، بچہ اور مدرسہ وغیرہ۔

تعلیم کے عام نقائص موجودہ تحریکوں جدید رجحانات اور تعلیم و تربیت کے نئے اصولوں کو معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید اور از بس ضروری ہے۔

طریقۂ تعلیم عام: - اسے جناب سلامت اللہ صاحب ایم ایس سی بی ٹی معلم استادوں کا مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ٹرننگ اور نارمل اسکولوں کے زیر تربیت اساتذہ کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھا ہے۔ اس میں پڑھانے کے عام طریقوں سے بحث کی گئی ہے بچوں کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، تمام اصولوں کو موزوں مثالوں کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، نیز ہندوستان کے مخصوص حالات اور استادوں کی دشواریوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اگست میں شائع ہو جائیں گی۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی نمبر ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲ ۱۸۹۹

سیرِ کائنات

یہ کتاب نامور سائنس داں، سر جیمس جینس کی مشہور و معروف کتاب (Through Space and Time) کا ترجمہ ہے۔ جس میں زمین ہوا، آسمان، ماہتاب، آفتاب، سیاروں اور ستاروں وغیرہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ طرز تحریر نہایت دلچسپ اور سادہ ہے اور ترجمہ میں اصطلاحات سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے، اس لئے خواص کے علاوہ عوام بھی بغیر کسی دقت کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

لیتھو کے متعدد نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ہاف ٹون کی ۲۷ تصویریں بھی شامل ہیں، جن سے کتاب کی افادی حیثیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ، جلد مضبوط اور گرد پوش خوبصورت۔ قیمت کاغذ کی اس غیر معمولی گرانی کے باوجود محض دو روپے چار آنے (عہ۲)

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

جولائی کی مطبوعات

مکتبہ جامعہ سے، ماہ جولائی میں حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:-

جگ بیتی حصہ اول — پنڈت جواہر لال نہرو کی مشہور کتاب Glimpses of World History کا ترجمہ۔ اس میں ایران، یونان، روم، چین اور ہندوستان وغیرہ کی تہذیبی اور تاریخی مسائل پر نہایت بسط و تفصیل سے تاریخی اور تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ حجم ۵۵۲ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۳؎

سیرِ کائنات — نامور سائنس داں سر جیمز جینس کی مشہور کتاب Through Space and Time کا سلیس ترجمہ۔ اردو میں اس موضوع پر پہلی مستند کتاب۔ بیسیوں کے متعدد نقشے اور ہاف ٹون کی ۲۷ تصویریں۔ حجم تقریباً ۳۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش۔ عہ

آسیبِ الفت — سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے اسے ترکی زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں ایک مُردہ عورت کی روح کی زبانی اس کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ قیمت بارہ آنے ۱۲؍

زہرہ — یہ بھی ایک ترکی ناول کا ترجمہ ہے۔ ترکی کی دورِ انقلاب سے قبل کی زندگی اور معاشرت اگر معلوم کرنی ہو تو اس ناول کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ قیمت ۱۰؍

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۷ - نمبر ۲ | ماہ اگست ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دار المصنفین اعظم گڈھ، دار الترجمہ حیدر آباد، ہندوستانی اکیڈمی
الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی
انڈین پریس الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی مطبوعات
اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اُردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے
ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمائیے اور قواعد و
ضوابط ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمائیے۔

سیاسی نظریے

زمانۂ عقلیہ

دستوریت | جب فرانس میں ہابس کی کتاب لیوتھین نامی سنہ ۱۶۵۱ء میں چھپی تو وہاں پیرس میں جتنے انگریز تھے سب اس سے بے حد خفا ہو گئے اور یہاں تک پریشان کیا کہ اس بے چارے فلاسفر کو پھر انگلینڈ بھاگنا پڑا اس وقت انگلستان میں کرامول کے ماتحت ایک جمہوری حکومت قایم ہو گئی تھی اور خیال تھا کہ اب یہاں اس کو بادشاہ پسند لوگوں سے سابقہ نہیں پڑے گا لیکن یہاں کا مذہبی طبقہ اس کا سخت مخالف تھا محض اسی لیے نہیں کہ اس نے اصول خداداد بادشاہت کے خلاف لکھا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ایک متشکک اور مادہ پرست تھا اس کے علاوہ شاہ پسند لوگ بھی نالاں تھے جب وہ انگلستان میں وارد ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی تصنیف یہاں بھی مقبول نہیں ہے اور اسی نفرت سے جمہور پسند طبقوں میں بھی دیکھی جاتی ہے جیسی کہ فرانس میں شاہ پرست انگریز طبقہ اسے دیکھتا تھا۔ ان میں جو سیاست داں طبقہ تھا وہ اس بات پر خفا ہو گیا کہ ہابس نے ان کے مشہور تخیل معاہدۂ سماجی کو مطلق العنانی کا ذریعہ بنایا جو ان میں مقنن تھے انھوں نے اس کے نظریۂ بادشاہت اور نظریۂ قانون کی مخالفت کی اور جو مورخین تھے انھوں نے اس کے تصور انسانی کی (جو اس نے ایک مملکت فطری فرض کر کے اس میں دکھلائی تھی) کی درستی سے قطعی انکار کر دیا اور جو فلاسفر تھے انھوں نے اس کی نفسیات کو بالکل باطل قرار دیا جہاں کہیں وہ جاتا ہر ایک طبقہ اس کی مخالفت پر کمر بستہ اور معترض نظر آتا غرضکہ پریشان ہو گیا پھر بھی ہابس سے نفرت کرنا تو آسان تھا لیکن اس کے نظریوں کی مخالفت کرنا کوئی آسان کام نہ تھا بہت کم ایسے فلاسفر گزرے ہیں جنھوں نے اس سے بڑھ کر منطقی یا استدلالی دماغ پایا ہو جہاں تک اس کی تصنیف میں

داس کے مسلمات اگر مان لیے جائیں) دلائل کا تعلق ہے وہ اس قدر درست اور صحیح ہیں کہ نقطہ دھرنے کی جگہ نہیں دو مشہور فلاسفر جنھوں نے اس کی مخالفت کی اسپانوزا (۱۶۳۲ء تا ۱۶۷۷ء) اور جان لاک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء) تھے ان فلاسفر نے بھی اس کے دلائل اور ماخذات و نتائج کو رد کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ اُن کو مان کر دنیائے عمل میں لانے کے لیے ان میں ترمیمات کر دیں۔

اسپانوزا تو خصوصاً اپنے مقالۂ مذہب و سیاست (۱۶۷۰ء) و مقالۂ سیاست (مطبوعہ ۱۶۷۷ء) میں بالکل تقریباً ہابس کے دلائل کی نقل ہی کرتا چلا گیا ہے فرق اتنا ہے کہ اس کی ذہنیت میں فطرت اور انسان کے متعلق اس قدر قنوطیت نہیں ہے جتنی کہ ہابس کی تصنیف میں اس لیے وہ آخر میں ایسی مملکت پیش کرتا ہے جو دستوری ہے جمہوری ہے۔ مذاہب کے اختیار کرنے میں کامل آزادی دیتی ہے اور اس کے علاوہ کامل انفرادی آزادی بھی۔

جان لاک جو کہ انقلاب انگلیسیہ کا بہت موافق تھا اس نے ایک محدود بادشاہت کا نظریہ پیش کیا یہ اس وقت کے لیے موزوں بھی تھا اس لیے بے حد مقبول ہو گیا چونکہ یہ پرانے خیال کے لوگوں کو پسند اور نئے لوگوں کے بھی طبیعت کے مطابق تھا اس لیے اٹھارویں صدی تک برابر لاک کے نظریہ کا گہرا اثر باقی رہا بلکہ اٹھارویں صدی کے مشہور مفکرین مثلاً بالیناکس و مانٹسکو، روسو بلیک اسٹون اور امریکہ کے وفاقی زمانہ سے لے کر اب تک اس کا اثر باقی ہے اس نے بذات خود یہ خیالات نہیں سوچے اس نے انگلستان کا پرانی دستوری حکومت کا نظریہ اور پارلیمنٹ کا لائحہ عمل دیکھ کر کچھ ہکر (۱۵۵۴ء تا ۱۶۰۰ء) کے خیالات کچھ سڈنی (۱۶۲۲ء تا ۱۶۸۳ء) یہاں بوجہ طوالت کے ان کا بیان نظر انداز کرتے ہیں ان کے تصورات غرضکہ ان سب کو ملا کر ایک ایسی ہی دستوری صورت پیدا کر دی جو مقبول عام ہو گئی سب سے پہلے وہ دو مقالے سِول گورنمنٹ کے متعلق ہیں جو فلمر کے پرانے نظریہ خداداد بادشاہت کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ہابس اور اس کے نظریہ بادشاہت کی طرف مخاطب ہوتا ہے لیکن اپنے طویل مقالے میں ہابس اور اس کے نظریہ کے متعلق براہ راست کچھ نہیں لکھتا بلکہ تذکرہ ہی نہیں کرتا حالانکہ ہابس کے نظریہ کو برابر کمزور کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی بادشاہت

کی کمزوریوں کو بھی دور کرتا چلا گیا ہے۔ اول اول وہ انسان کی فطری حالت کا تصور کرتا ہے کہ شروع میں میں کس طرح انسان آپس میں مل جل کر ایک اطمینان بخش زندگی بسر کرتے تھے لیکن یہ فطری مملکت باوجودیکہ مطمئن اور خوش حال تھی پھر بھی بے ترتیب تھی اور غیر مکمل تھی پھر اس کے بعد بتلاتا ہے کہ ایک مملکت کی تخلیق کن وجوہ کے باعث ناگزیر ہو گئی اور پھر کہتا ہے کہ مملکت کی بنیاد در اصل آپس کے سماجی معاہدہ پر پڑی پھر اُن ہی لوگوں نے آپس میں ایک بادشاہ اپنے اوپر حکومت کرنے کے لیے منتخب کر لیا اور پھر وہ سماجی معاہدہ بادشاہ سے کر لیا گیا۔ بادشاہ کو لوگوں نے اپنے تمام حقوق سپرد نہیں کر دیے بلکہ وہی جو آپس میں ایک دوسرے کی بقا کے لیے ضروری تھے۔ اس کے نزدیک مملکت کا محض اور واحد فرض یہی ہے کہ وہ ذات واحد کے حقوق کی نگہبانی اور حفاظت کرے خصوصاً زندگی آزادی اور ملکیت کی یعنی یوں سمجھ لیجیے کہ انسان چونکہ ایک سماجی جانور ہے اکیلا رہ نہیں سکتا اور ساتھ رہنے میں یہ ممکن تھا جو طاقتور ہوتے کمزوروں کو مار ڈالتے یا ان کا تمام اثاثہ چھین لیتے یا جو مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہوتے وہ دوسرے کا مال چرا لیتے یا آنکھ بچنے پر اُڑا لیتے اس لیے ضروری تھا کہ آپس میں ایک قسم کا ایسا معاہدہ ہو جائے اور ایسے قوانین بن جائیں تاکہ ہر ایک کے حقوق کی نگہداشت ہو سکے اور سوسائٹی ایک پُرامن زندگی بسر کر سکے انھیں قوانین کو سوچنے کے لیے اور ان کو عمل میں لانے کے لیے انھوں نے آپس میں ایک ایسے شخص کو چن لیا جو ان تمام حقوق اور اس تمام کاروبار کی ہمہ وقت دیکھ بھال کر سکے کیونکہ ہر شخص کو فرصت نہ تھی جو اِن اُمور کو دیکھتا رہے اس لیے ایک کے سپرد کر دیا گیا، ایسے شخص کا نام رکھا بادشاہ اس نظریہ کی بنا پر اس نے بادشاہت کا نظریہ محدود کر دیا۔ جب یہ نظریہ قایم کر لیا تو پھر یہ ثابت کرنے میں کوی بات نہ رہی کہ مملکت کو مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور یہ کہ مملکت کو ہر شخص کی مذہبی آزادی تسلیم کرنا چاہیے۔ جو مذہب جس کا جی چاہے اختیار کرے بشرطیکہ کوئی مذہب یا مذہبی فرقے کا عمل درآمد حکومت کے انتظام اور امن عامہ میں حائل نہ ہو۔

لاک کے دلائل اور دستوری روایات جو اس کے اور اس کے معتقدین کے اثر سے شروع اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلستان میں قایم اور مروج ہو گئے ان کا اثر فرانس پر بھی پڑا جب فرانس

کا مشہور فلاسفر مانٹسکو سنہ ۱۷۲۹ء میں انگلستان آیا تو اٹھارہ مہینے تک انگلستان کے نظام حکومت کا نہایت غور وخوض سے مطالعہ کرتا رہا اور اپنے ملک کے بادشاہ کی بے حد و بے حساب مطلق العنانی اور انگلستان کے بادشاہ جارج دوم کی محدود طاقت کا موازنہ کرتا رہا چنانچہ سنہ ۱۷۴۸ء میں اس نے اکتیس جلدوں کی ایک کتاب تصنیف کی جس میں پانچ سو چھیانوے باب تھے اس تصنیف کا واحد مقصد یہی تھا کہ فرانس کی گورنمنٹ بیدار ہو اور ظلم کو چھوڑ کر دستوری حکومت اختیار کرے جس طرح کہ قدیم زمانہ میں دستور تھا یا اطالیہ میں ازمنۂ وسطیٰ میں یا پھر موجودہ انگلستان میں۔ مانٹسکو نے ایک خاص بات پر بہت زیادہ زور دیا وہ یہ کہ شخصی آزادی کے لیے یہ قطعی ضروری ہے کہ حکومت کے تین شعبے یعنی شعبہ قانون سازی و شعبہ عمل و شعبہ عدل تینوں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ رہیں اس کے علاوہ اس دستوری قسم کی حکومت کی نگہداشت اور نگرانی پر بھی کافی زور دیا تاکہ کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ مانٹسکو کی تصنیف نے امریکہ میں بڑا اثر اور رسوخ پایا کیونکہ اس زمانہ میں وہاں کا دستور حکومت زیر ترتیب تھا۔

انقلابی یا انقلاب پسند | لاک کے خیالات نے مانٹسکو کے دماغ میں تو دستوری حکومت کی بنیاد ڈالی لیکن روسو (سنہ ۱۷۱۲ء تا سنہ ۱۷۷۸ء) کے ذہین مگر نہایت متوازن دماغ میں انقلابی خیالات موجزن کر دیے روسو جنیوا کا ایک باشندہ تھا اور ایک پاگل گھڑی ساز کا لڑکا سولہ برس ہی کی عمر سے سیر و گشت اور جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ صرف ایک دفعہ پیرس میں جم کر بارہ برس رہا ورنہ تمام عمر گشت ہی میں گزری سنہ ۱۷۵۰ء میں دیجان کی اکاڈمی سے اس کو ایک مضمون کے صلہ میں جو اس نے فنون و سائنس کا اخلاق پر اثر کے عنوان سے لکھا تھا ایک گراں قدر انعام ملا۔ اس سے اس نے سمجھ لیا کہ اس میں لکھنے کی قابلیت موجود ہے چنانچہ اس نے لکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ بے انتہا مقبول ہوتا گیا یہاں تک کہ سنہ ۱۷۶۲ء میں اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "سماجی معاہدہ" یا (معاہدۂ عمرانی) معرض ظہور میں آئی جس کی طرز تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے مباحث نہایت مدلل اور جذبات سے لبریز اس میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ قوم کی بیداری کی خاطر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا جائے تصنیف کے

یہ دو خیالات کہے جا سکتے ہیں ایک تو قوم کا خیال دوسرے ذاتی آزادی کی آرزو لیکن ان دونوں باتوں کا ملانا کس طرح ممکن تھا کہ شخصی آزادی بھی قایم رہے اور مملکت کی منزلت بھی روسو نے ان دونوں باتوں کا امتزاج اس طور پر کیا کہ اس نے پہلے لاک کی طرح ایک ایسی قوم کی فطری حالت کا نقشہ فرض کیا جس نے آپس کے معاہدہ سے اپنی آپ گورنمنٹ بنالی ہو جب ایک ایسی گورنمنٹ آپس کے معاہدہ سے بن گئی تو اس میں اور ذاتی عام رائے میں کوئی فرق ہی نہیں رہا ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی طاقت و لیاقت رائے عامہ کے تحت میں دیدیتا ہے کہ وہ اس کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ و بحیثیت مجموعی ہم میں سے ہر ایک کو (کل کا ایک جزو ہوتے ہوئے) اس کا جائز حصہ مل جاتا ہے۔ اس کے بعد روسو کہتا ہے کہ فرض کرو اس پر بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہو جائے جس کی رائے رائے عامہ کے خلاف ہو یا ہوسکتی ہو تو ایسے شخص پر دباؤ ڈالا جائے اور اسے بہ جبر مجبور کیا جائے کہ وہ رائے عامہ کے خلاف ملک میں بدامنی نہ پیدا کرے لیکن ایسی صورت میں ذاتی شخصی آزادی باقی نہیں رہتی روسو اس کا جواب دیتا ہے کہ نہیں باقی رہتی ہے جس شخص نے اپنی رائے، رائے عامہ سے ہٹ کر دکھلائی اس نے غلطی کی۔ اس کو خود نہیں معلوم تھا کہ اس کی اصلی رائے کیا ہے اور یہ جبر اس کی اصلی رائے کے مطابق ہے جب قوم اس کو اس کی اصلی رائے کی طرف مجبور کرتی ہے تو اسے درحقیقت آزاد بنا رہی ہے لیکن اس طرح آزادی پر مجبور کیا جانا ویسا ہی ہے جیسا اطاعت ماننے پر مجبور کیا جانا اس لیے روسو کا یہ مسئلہ حل شدہ نہیں کہا جا سکتا۔

اگر وہ اپنے معاملہ کو ثابت کرنے میں ناکامیاب رہا تب بھی اس نے علم سیاست میں اس قدر گراں بہا اضافہ کیا ہے کہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بتلاتا ہے کہ سیاسی حکومت کا مخرج صرف لوگوں ہی کی مرضی ہے اور سیاست و حکومت کی بنیاد محض عوام الناس ہی نے ڈالی ہے۔ دوسرے یہ کہ گورنمنٹ کا واحد ترین مقصد صرف یہی ہے کہ ہر شخص کا بھلا ہو اور ہر شخص کو آسانیاں نصیب ہوں وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مملکت صرف ایک سماجی نظام یا ترتیب یا عضویہ ہے اور بحیثیت ایک عضویہ ہونے کے اس میں ایک ملی یا عام ارادہ بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جب وہ اس جمہوری بات کو مانتا ہے کہ

ایک سیاسی جماعت کی صحیح بنیاد اصل میں آپس کی رضامندی ہو اور جب وہ اس بات کے امکان کا قطعی دعویدار ہو کہ آزادی اور تحکم دونوں میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے تو روسو کے متعلق یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے سنجیدہ اصول ایسے ہیں جو اعلیٰ سیاسی مفکرین میں پائے جاتے ہیں حالانکہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خرافات بھی کافی بک گیا ہے۔

روسو کی فصاحت اور پرجوش طرز تحریر کی بدولت بہت سے لوگ اس کے مقلد اور پیرو ہو گئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ فرانسیسی انقلاب کے بردئے کار ہونے میں اس کا اثر پیش پیش تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے فرانسیسی سماجی نظام کی خرابیوں کا قطعی اتصال کر دیا جب انقلاب برپا ہوا (۱۷۸۹ء) تو انقلابی لوگوں کی زبان پر مساوات مساوات اور رائے عامہ رائے عامہ کے ہی نعرے تھے۔ ایک فرانس میں کیا اور ملکوں میں بھی روسو کا کافی اثر پھیلا خصوصاً انگلستان اور امریکہ میں سب سے زیادہ۔ انگلستان میں طامس پین (۱۷۳۷ء سے ۱۸۰۹ء) خاص کر روسو کا مقلد بنا وہ طبیعت ہی سے انقلاب پسند ذہنیت کا آدمی تھا ایک نہایت پرجوش زندگی بسر کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے "عام سمجھ (۱۷۷۶ء)" وغیرہ کتابوں کے ذریعہ امریکہ والوں کو انگلستان والوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور جنگ آزادی کے فتنہ کے موافق جو وہاں ہو رہی تھی خوب آگ لگاتا رہا ۱۷۸۹ء میں انگلستان پھر واپس آیا اور فرانس کے انقلاب کا ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۲ء تک بغور و خوض مطالعہ کرتا رہا۔ جب برک نے اپنے تخیلات فرانسیسی انقلاب کے خلاف طبع کرائے تو اس نے ان کا نہایت پرزور جواب بعنوان "حقوق انسان" لکھا (۱۷۹۱ء) لیکن یہاں کی حکومت سے خطرہ تھا کہ کہیں اس کے لیے طوق و سلاسل کی نوبت نہ آ جائے اسلیئے ۱۷۹۲ء میں فرانس بھاگ گیا وہاں فرانسیسی جمہوریت کا ایک رکن بنا دیا گیا دس برس تک فرانس میں رہنے کے بعد پھر امریکہ گیا اور وہیں نیویارک میں اپنے دن ختم کیئے۔ پین روسو کے نظریہ ذات یا فرد واحد کی آزادی پر بہت زیادہ زور دیتا تھا۔ بہ نسبت اس کے سماجی ملی یا قومی نظریہ کے لیکن اس نے روسو کے نظریہ حقوق انسانی و سماجی مساوات و عوام الناس کی افضلیت و حکومت کی بے جا مداخلت و فرد کی آزادی

ان تمام باتوں کو نہایت پرجوش طریقہ پر ہر ہر جگہ پھیلا دیا۔

جرمنی کا مشہور فلاسفر کانٹ (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء) ایک نہایت پُرمغز، نہایت سنجیدہ، نہایت سمجھدار اور ٹھوس دماغ کا آدمی تھا اس نے روسو کے "معاہدۂ سماجی" میں سے جذبے و استعارے تشبیہات والے جملے نکال ڈالے اور اس کے خیالات کو نہایت مدلل اور مکمل صورت میں پیش کیا اس کے علاوہ اس نے روسو کے خیالات اور مانٹسکو کے اصول کو ایک کر دینے کی کوشش کی کانٹ کا گراں قدر کارنامہ اس کا "فلسفۂ قانون" ہے جو کانٹ نے ۱۷۹۰ء میں ترتیب دیا اس میں قانون [illegible] کی تعریفات اور ان پر بحثیں سیاست میں بالخصوص بیش بہا اضافہ ہیں۔

مصلحین (ریفارمرز) کانٹ کو انقلابی لوگوں کی صف میں دیکھنا ذرا تعجب انگیز بات ہے اس لیے کہ اس سے سیدھا اور نیک شاید ہی کوئی ہو اپنی تمام عمر اپنے ہی وطن میں نہایت خاموشی اور سادگی سے گزار دی اس کا فلسفہ بھی نہایت ہی خشک جذبات سے قطعاً مبرا تھا وہ بذات خود تو اس قدر سیدھا اور نیک تھا کہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ کبھی کسی سے اُلجھے لیکن انقلاب کا مطلب ہمیشہ زور و شور، مار دھاڑ نہیں ہوا کرتا اور انقلابی خیالات نہایت روکھے الفاظ میں بیان کیے جا سکتے ہیں اس میں شک نہیں کہ کانٹ کا اخلاق کا قانون اس کی اعلیٰ تخئیل، اس کی ہمہ دانی، اس کی انسانیت اور اس کی خاموش نرم طبیعت اپنے پرآشوب اور ہنگامہ خیز زمانہ کے قطعی منافی تھی اس کے برخلاف اس نے ایک ایسے ملی سماجی نظام کے اصول بنائے جن کے برلانے کے لیے اخلاقی انقلاب کی ضرورت تھی نہ کہ جنگی۔

ان کے چند معاصر ایسے بھی تھے جو تبدیلی تو چاہتے تھے لیکن نہ اس حد تک یہ ایسے مصلحین تھے جنھوں نے سیاسی اور سماجی دونوں قسم کے حالات میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی اور انھوں نے یہ اصلاح موجودہ نظام و ترتیب کے اندر ہی مناسب جانی یہ لوگ زیادہ تر برطانوی تھے جو مدبّریت میں کافی دخل رکھتے ہیں اور دو ناموافق باتوں میں سمجھوتہ کرا دینا ان کی خصوصیت ہے ان میں تین شخص خاص کر قابل ذکر ہیں یعنی برک، ولیم گاڈوین اور جرمی بنتھم۔

– اڈمنڈ برک (۱۷۲۹ء تا ۱۷۹۷ء) آئرلینڈ کا باشندہ تھا نہایت پڑھا لکھا عالم فاضل اس کا

رجحان ابتدا میں قانون کی طرف تھا پھر ادب و سیاست کی طرف مائل ہو گیا وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوا اور آزاد خیال پارٹی کے ایک وزیر کا سکریٹری ہو گیا اور اپنی پارٹی اور اپنے وزیر کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ برک ایک عملی سیاست داں تھا نہ کہ محض تخیّلی لکھنے والا بابا کا تھا۔ ہر موضوع پر جو اس کے زمانہ میں پیدا ہوتے اس کا قلم اور زبان برابر چلتے۔ وہ اس راز کو بخوبی سمجھ گیا تھا کہ ایک قابل اور کامیاب سیاست داں ہونے کے لیے فلاسفر ہونا ضروری ہے۔ وہ سیاستدانوں کی اوپری چیخ پکار پر کبھی کان نہ دھرتا بلکہ امورِ متعلقہ کا نہایت گہرا مطالعہ کرتا اور دیکھتا کہ واقعی اُن مباحث میں اور انسانی فطرت میں کس قدر مطابقت ہے اور وہ کس حد تک انسان کے لیے مفید یا غیر مفید ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اس کی تصانیف ایک طرح کی مشعلِ ہدایت ہیں بمقابلہ دوسرے لوگوں کی تصانیف کے۔ دو واقعوں پر اس کی رائیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو فرانسیسی سنہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب پر، دوسرے امریکہ کی آزادی سنہ ۱۷۷۶ء پر۔ یہ بات ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے کے تو وہ خلاف تھا اور دوسرے کے موافق۔ اگر آزادی پیشِ نظر تھی تو دونوں کے موافق ہونا چاہیے تھا یا پھر دونوں کے مخالف۔ اس نے بحث یوں کی کہ نظامِ حکومت ایک عضویہ ہے جو نہایت قدیم زمانہ سے اب تک چلا آ رہا ہے چونکہ عضویہ زندگی رکھتا ہے اس لیے امکانات ہیں کہ وہ کمزور ہو جائے یا ترقی کر جائے یا بالکل فنا ہی ہو جائے۔ لہٰذا اس کو نگرانی اور نگہداشت کی برابر اور ہمہ وقت ضرورت رہتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ اپنے ماحول اور زمانہ کے لحاظ سے صحیح چل رہا ہے یا ترقی کر رہا ہے کہ نہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۷۷۵ء میں اس نے امریکہ والوں کی حق طلبی کی قطعی موافقت کی تاکہ حکومتِ برطانیہ کے عضویہ میں کوئی کمزوری یا رخنہ نہ پیدا ہو اور ساتھ ساتھ وہ دستوری طریقوں پر ترقی کرتا رہے برخلاف اس کے فرانسیسی انقلاب کی اس نے مخالفت کی کیونکہ وہ اس کے نزدیک ایک گمراہی تھی جو فرانس کے سیاسی و سماجی عضویہ کو قطعی تباہ کر ڈالنا چاہتی تھی اور اس کے تمام نظام کو خواہ مخواہ درہم برہم کر ڈالنا ہی اس کا مقصودِ واحد تھا۔

ولیم گاڈون (سنہ ۱۷۵۶ء تا سنہ ۱۸۳۶ء) اس قدر سنجیدہ اور متوازن الدماغ نہیں تھا۔ اس کے

اعتقادات برابر بدلتے ہی رہے سب سے پہلے وہ نراجی خیال پر رہا پھر لا مذہب ہو گیا آخر عمر میں جب پابند مذہب ہو ہی رہا تھا کہ مرگیا۔ سیاسی ادبیات میں اس کی ایک کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہے "عدل سیاسی پر تنقید" یہ دراصل اس نے اپنی نراجی عقیدت کے زمانہ میں تحریر کی تھی۔
۱۷۹۳ء میں اُس نے نہایت جوشیلے انداز میں شخصی اور آزادی پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ آدمی طبیعتاً نہایت نیک اور سیدھا تخلیق ہوا ہے اور نہایت اعلیٰ ملکوتی درجہ تک ترقی کر سکتا ہے اس لیے نظام حکومت یا گورنمنٹ کو لازم ہے کہ اس کی ترقی میں حائل نہ ہو بلکہ اس کو اجازت دے کہ وہ ذاتی رجحانات کی بنیاد پر از سر نو اپنی تاسیس کرے اور تمام کلیسا بیکار کر دیے جائیں، ور تعلیمات کو گورنمنٹ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ سزا نہ دی جائے بلکہ مجرم کو اچھائی کی طرف راغب کیا جائے شادیوں کی بجائے آزادانہ رضامندی کی یکجائیاں ہوں۔ قسموں اور معاہدوں کی رسمیں توڑ دی جائیں۔ ملکیت کی تقسیم پھر سے ہو اور ہر شخص کو اتنا دیا جائے جتنا اس کو واقعی درکار ہو گا۔ گاڈوین کی انفرادیت اور اصول غیر مداخلت واقعی نہایت انتہائی ہیں۔

جرمی بنتھم (۱۷۴۸ء سے ۱۸۳۲ء) یہ بلا کا لکھنے والا تھا۔ ساٹھ سال تک متواتر لکھتا رہا کوئی اسّی سے زائد تصانیف چھوڑی ہیں اس کے علاوہ بھی کوئی ایک سو پچپن بنڈل قلمی نسخوں کے چھوڑے ہیں جو ابھی تک اشاعت کے منتظر لندن یونیورسٹی میں پڑے ہیں۔ بنتھم کی دو کتابیں زیادہ مشہور ہیں ایک تو "کچھ طرز گورنمنٹ پر" دوسری "نظریہ اخلاق و قانون سازی" اس کی دو خصوصیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے اخلاق میں نظریہ افادیت کے پرانے نظریہ کو پھر سے اُبھارا۔ دوسرے پھر اسی نظریہ کا ایک نہایت غیر منطقی اطلاق سیاست میں کیا ان الفاظ میں کہ گورنمنٹ کا مطمح نظریہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا چاہیے حالانکہ "ہے" اور "ہونا چاہیے" میں بہت کافی گنجائش ہے لیکن اس زمانہ کے لوگوں کو اس منطقی خلیج سے نہایت آسانی سے پار ہو جانا بہت اچھا معلوم ہوا چنانچہ شروع انیسویں صدی میں بہت سے آزاد خیال فلاسفروں نے اس زیادہ سے زیادہ فائدہ کے اصول کو بہت سی انتخابی پارلیمنٹری دستوری اور قانونی اصلاحوں میں برتا۔

انیسویں صدی

انفرادیت | تقریباً نصف صدی تک انفرادیت مغربی دنیا میں اپنا زور و شور دکھاتی رہی یورپ میں تو خیر انقلابی انفرادیت رائج تھی جو روسو نے پیدا کی تھی اسی کو ذرا نرم لہجوں میں ہمبولٹ (۱۷۶۷ء تا ۱۸۳۵ء) نے اپنی مختصر تصنیف مسمیٰ بہ "حدود احکام حکومت" میں یہ بتلایا کہ حکومت ایک ضروری لغویت ہے اس کا واحد مقصد محض جان و مال کی حفاظت ہونا چاہیے انسان کی ترقی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ اس کی زبان اور اس کے افعال پر کسی قسم کی پابندی نہ عاید کی جائے۔ انگلستان میں بھی یہی نراجی انفرادیت مروج تھی لیکن ذرا اور جوشیلے طریقوں پر۔ طامس پین کی اکثر تصانیف دوبارہ طبع کرائی گئیں اور بے انتہا پڑھی جانے لگیں اور انتہا پسند حضرات تو انھیں آسمانی صحائف کے برابر سمجھنے لگے تھے۔ ایک شخص رچرڈ کارلیل نے اپنا پیشہ ہی یہ بنا لیا تھا کہ طامس کے اصولوں کو اپنے میگزین میں برابر چھاپتا رہتا یہاں تک کہ گورنمنٹ نے اس کے پرچہ "ریاست" کو بند کرا دیا۔ حقوق انسانی کی وہ گرم بازاری رہی ہے کہ جہاں دیکھیے اور جسے دیکھیے انھیں باتوں پر تقریر کر رہا ہے آخر کار بنتھم نے بتلایا کہ محض یہ ایک منطقی نراجی مغالطہ ہے۔

انگلستان میں بنتھم والی افادی انفرادیت کا زیادہ رواج تھا ایک طبقہ اس قسم کے آزاد خیال فیلسوف کا پیدا ہو گیا جنھوں نے اور بھی اس کو ترقی دیدی۔ یہ انفرادیت ایسی تھی جو واقعی اٹھارویں صدی میں گورنمنٹ کی بہت سی بے جا مداخلتوں کے باعث پیدا ہو گئی تھی۔ گورنمنٹ بھی واقعی ہر بات میں داخل، مذہب میں داخل، تجارت میں داخل، مزدوریت میں داخل، صنعت و حرفت میں داخل غرضکہ ہر جگہ پیش پیش تھی چنانچہ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی آزادی اور اصول غیر مداخلت کے نعرے لگنے لگے یہ دراصل فرانس سے اٹھے اور ان کی صدائے بازگشت انگلستان میں گونج گئی چنانچہ گاڈون، آدم اسمتھ، فرانسیس یا پھر بنتھم اور اس کے شاگردوں نے اپنی تصانیف سے زمین و آسمان اکٹھا لیا اور تقریباً ملکہ وکٹوریہ کے ابتدائی دور حکومت تک یہ شور و غلغلہ برابر جاری رہا اور

بہت سی باتوں اور بے جا مداخلتوں سے گورنمنٹ کو ہاتھ اٹھا دیا۔

بنتھم کے سب سے زیادہ راسخ الاعتقاد شاگرد جیمس مل (۱۷۷۳ء تا ۱۸۳۶ء) نے اپنی زندگی کا مقصد یہ بنا لیا کہ بنتھم کی تمام تصانیف کا ترجمہ معہ تشریح کے کروائے تاکہ عام انگریزوں کو اس کے خیالات سے آگاہی ہو جائے۔ مل نے خود اپنا خیال بہت کم اس میں شامل کیا لیکن بعض باتیں اس کی قابل تحریر ہیں مثلاً یہ کہ ہابس کی طرح اس کا اعتقاد یہی تھا کہ انسان دراصل ایک نہایت خودغرض جاندار ہے جس کی دو خاص خصوصیات ہیں خواہش آزادی اور ہوس حکومت۔ اس لیے اس نے بتلایا کہ اس خودغرض جاندار نے مل جل کر اگر ایک گورنمنٹ قائم کر دی تو دراصل اس نے یہ محض اپنی ذاتی فوائد کی بنا پر کی ہے کہ اس کی زندگی، آزادی اور ملکیت کی حفاظت ہوتی رہے۔ اب جو لوگ اس میں ملازم ہیں وہ بوجہ اپنی فطرت انسانی کے مزید اقتدار کی ہوس کریں گے اور ممکن ہے کہ رعایا کی آزادی کو اس طرح چھین لیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر لوگ ہمیشہ نگرانی رکھیں اور جب کبھی اس قسم کی ہوس بڑھتی دیکھیں تو عمال کی قوتوں کی توبیخ کر دیں۔ اس غایت کی مناسبت سے اس نے یہ تجویز کیا کہ محض ایک دارالعوام ہو جس میں ووٹوں کے ذریعہ منتخبہ ممبران داخل کیے جائیں ووٹ دہندگان اور حق انتخاب بہت کافی لوگوں کو دیا جائے انتخاب جلد جلد ہوا کرے اور ووٹ خفیہ طور پر دیے جائیں۔

جیمس مل تو ایک نہایت ہی خشک آدمی تھا اور نہایت ہی منطقی لیکن اس کا لڑکا جان اسٹوارٹ مل (۱۸۰۶ء تا ۱۸۷۳ء) بہت نرم طبیعت کا تھا۔ وہ شروع سے نہایت ذہین اور طباع تھا لیکن بے انتہا پڑھائی اور بہت زیادہ تعلیم نے اس کی ذہانت اور طباعی کو کافی حد تک بیکار کر دیا حالانکہ وہ باقی ضرور رہیں لیکن جدت مفقود ہو گئی۔ اس کی ذہنیت سب سے پہلے بنتھم اور مل کی افادیت سے متاثر ہوئی بعد ازاں کولرج کی رومانیت سے بعد کارلائل کی اعلیٰ تخئیلیت نے اس کے بعد کامٹے کی رجائیت سے اس کے بعد مسز ٹیلر کی نسوانیت سے نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں نہایت گڑبڑ سڑبڑ خیالات پیدا ہو گئے باوجود ان تمام رجحانات کے وہ ذاتی آزادی اور انفرادیت کا بہت بڑا حامی تھا نظریۂ

سیاست پر اس کی بڑی ضخیم تصنیف "آزادی" ہے ۱۸۵۹ء اس میں وہ نہایت پرزور طریقہ سے آزادیٔ خیال و آزادیٔ گفتار کی حمایت کرتا ہے۔ آزادیٔ افعال کے متعلق اتنا کہتا ہے کہ آزادیٔ افعال اتنی دینا چاہیے کہ دوسروں کی آزادیٔ اعمال سے تصادم نہ ہو جائے۔ شخصیت کی بڑی ستائش کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ زندگی کا مقصد خوشی نہیں بلکہ تمام ودیعت کی ہوئی قوتوں کو برسرکار لانا ہے اس کے بعد حکومت کے احکامات کی حدیں مقرر کرتا ہے کہ حکومت کو کس قدر لوگوں کے ذاتی معاملات میں دخل در معقولات دینے کا حق حاصل ہے۔ اپنی دوسری تصنیف "منتخبہ گورنمنٹ" ۱۸۶۱ء میں جمہوری نظام پر بحث کرتے ہوئے بتلاتا ہے کہ جمہوری حکومت اسی وقت سب سے بہترین قسم کی حکومت کہلائی جا سکتی ہے جبکہ اس کے تمام ووٹ دہندگان تعلیم یافتہ ہوں۔

ایک طرف مِل آزادی اور اشتراکیت کو ملانے کی کوشش کر رہا تھا دوسری طرف ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ء تا ۱۹۰۳ء) نہایت زور شور سے اس بات کی مخالفت کر رہا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی اختلاف رکھتے ہیں۔ پہلے اپنی تصنیف "سماجی سکونیات" ۱۸۵۱ء میں اس کے بعد دوسری تصنیف "انسان و مملکت" میں نہایت پُرجوش اسلوب سے اس نے قانون سازوں کی غلط اندیشہ دوانیوں پر تعریض کی ہے۔ گورنمنٹ ۱۸۸۴ء کی ذاتی آزادی میں بے جا مداخلت پر آزادیوں کے سلب ہو جانے پر افسوس ظاہر کیا ہے پھر اس کے بعد مملکت کی قوتوں اور احکامات پر نہایت سخت حدیں مقرر کی ہیں کہ اسے محض ذاتی زندگی، آزادی اور ملکیت کی حفاظت کرنا چاہیے۔

اجتامیت | انسان اور مملکت کا سوال جو اسپنسر نے اٹھایا وہی دراصل روسو کا بھی تھا جسے اس نے اس طرح حل کیا تھا کہ قوم کی ایک رائے عامہ ہوتی ہے اور یہ رائے عامہ ہمیشہ ذاتی انفرادی رائے کے مطابق ہوا کرتی ہے اس نظریہ کی بدولت مملکت کا تصور ایک عضویہ کا ہو گیا اور مملکت بطور ایک شخصیت کے ہو گئی جس میں ذہانت، ضمیر اور ارادے بھی شامل تھے۔ روسو کے اس تخیل نے کانٹ کے سنجیدہ دماغ میں بھی جگہ پائی اور اس نے اپنے نظریہ قانون کو اسی کے مطابق تیار کیا جیسا اوپر مذکور ہو چکا ہے

کانٹ کا خاص موضوع آزادی تھا جو روسو کی انقلابی تقاریر کا انفرادی پہلو تھا۔ آزادی ہی کانٹ کے نہایت لائق اور ہونہار شاگرد فکٹے (سنہ ۱۷۶۲ء سے ۱۸۱۴ء) کا بھی موضوع تھا لیکن فکٹے کا یہ خیال اس کی شروع زندگی تک رہا۔ وہ نہایت وسیع اثر آدمی تھا شروع شروع میں تو انفرادیت کو سراہتا رہا اور احساس کی افضلیت کو بڑھاتا رہا روسو کی تعریف اور فرانسیسی انقلاب کی مدح سرائی کرتا رہا اس کی شروع کی دو تصانیف ان خیالات کی حامل ہیں لیکن جب فرانسیسیوں نے جرمنی پر حملہ کیا اور خصوصاً جب جینا کی لڑائی سے پروشیا کی آزادی سلب کرلی گئی تو اس کے دل و دماغ اور خیالات میں قطعی تبدیلی ہوگئی اور فکٹے وطن پرست ہوگیا قوم کی مضبوطی پر سب سے زیادہ زور دینے لگا بہ نسبت انفرادی آزادی کے۔ انفرادی اطاعت اور وفاداری کو قوم کی حفاظت کے لیے ضروری بتلانے لگا۔ قومی تعلیم کی اہمیت اور خود کو ملک پر نثار کر دینے کی ضرورت کی ترغیب دینے لگا اور بتلایا کہ درآمدات پر زیادہ ٹیکس لگا دیا جائے تاکہ خود ملک کے کاروبار میں ترقی ہو۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۰ء اور سنہ ۱۸۱۳ء میں جو اس کی تصانیف نکلیں وہ پیشتر کی تصانیف سے قطعی مختلف تھیں پھر بھی وہ روسو کا معنوی شاگرد رہا اب کانٹ کا نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس نے محض روسو کے ہی پہلو پر زیادہ زور دینا شروع کردیا یعنی ملت و قوم کی برتری۔ فرد واحد پر رائے عامہ کی فضیلت وغیرہ الغرض فکٹے انفرادیت کے دائرہ سے نکل کر اجتماعیت کے دائرہ میں آگیا۔

فکٹے کی اجتماعیت کی ترویج اور اشاعت اس کے بعد اس کے جانشین ہیگل (سنہ ۱۷۷۰ء سے ۱۸۳۱ء) نے شروع کی ہیگل انیسویں صدی کا نہایت ہی با اثر فلاسفر گزرا ہے۔ اس نے اپنی دو تصانیف کے ذریعہ (پہلی سنہ ۱۸۲۱ء میں دوسری اس کی موت کے بعد سنہ ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی) انفرادیت کو قطعی زیر کر ڈالا اور فرد واحد کو محض ایک ذریعہ گردانا جس کے ذریعہ اجتماعی مقاصد کی برآری ہوسکتی تھی ہیگل ایک تخیلی فلاسفر تھا اس کا اعتقاد تھا کہ کائنات میں اساسی جوہر روحانی ہے یعنی عقل (قوت عقلیہ) ہیگل تدریجی ترقی میں یقین رکھتا تھا (ڈارون اور اسپنسر سے پہلے) اور کہتا تھا کہ تاریخ ہمیشہ اس طاقت کل یعنی قوت عقلیہ کی تدریجی ترقی دکھاتی رہی ہے۔ وہ مطلقیت میں اعتقاد رکھتا تھا اس کے نزدیک کائنات کی

تدریجی ترقی کا دستور ہمیشہ سوالی وجوابی رہا ہے یعنی یہ کہ ہمیشہ متضاد باتیں اور متضاد چیزیں ایک دوسرے پیدا کرتی اور رفع پذیر ہوتی رہی ہیں مثلاً آزادی اور محکومیت میں، قانون و آزادی میں مطلق العنانی اور جمہوریت، قیام و حرکت اور زندگی اور موت وغیرہ اور آخر میں مطلق حقیقت وہ ہے جس میں یہ تمام ضدیں بالکل ایک اور متحد ہو جاتی ہیں۔ فلسفہ سیاست میں وہ بتلاتا ہے کہ ذات ارادی (جو قطعاً آزاد اور با اختیار ہے) انفرادیت اور مملکت دونوں کی جڑ ہے۔ یہ ذات ارادی اپنے کو پہچانتی اور ظاہر کرتی ہے پہلے تو خارجی قوانین میں۔ اس کے بعد داخلی اخلاق میں اس کے بعد سماجی اخلاقیات اور سب کے بعد مملکت کے سیاسی اخلاقیات میں اس کے نزدیک مملکت نتیجہ ہے انسان کی بتدریج معاشرتی اور تہذیبی ترقی کا۔ یہ مطلق ہے جس میں ہر شخص کی انفرادی ذات اور کل کی ملی ذاتیں ایک ہو گئی ہیں (وہی روسو کا نظریہ) محض مملکت ہی میں ایک شخص اپنی پوری آزادی اٹھا سکتا ہے یہی اس کی سچی آزادی ہے اور اس کی صحیح ترقی۔ غرضکہ ہیگل کے ذریعہ پھر وہی افلاطونی تخیلات آگے آ گئے گویا کہ دائرۂ سیاست پورا ہو گیا۔

ہیگل کے نظریہ نے انیسویں صدی کے آخر حصہ میں بڑے بڑے رنگ دکھائے۔ ٹریٹسکی نے جب ہیگل کی مثالی مملکت کو اپنی مملکت کی (ہوہنزالرن) بادشاہت پر منطبق کیا تو بسمارک، برن ہارڈی کے لیے اور جنگ عظیم کے لیے راستہ کھل گیا جب فرباش اور کارل مارکس نے اس بات کا انکار کیا کہ کائنات کا جوہر اصلی روحانی نہیں بلکہ مادی ہے تو اشتمالیت اور غربا کی حکومت کا دروازہ کھل گیا۔ جب انگلستان میں طامس گرین اور اس کے شاگردوں کے ذریعہ ہیگل کی باتیں دوسرے فلاسفہ کے اصولوں میں ملا جلا کر پھیلائی گئیں تو فیبانی اشتراکیت وجود میں آئی۔

۳ طامس گرین (سنہ ۱۸۳۶ء تا سنہ ۱۸۸۲ء) بہت بڑا اور بہت نیک آدمی تھا۔ وہ اول درجہ کا مفکر نہ تھا اس کی تصانیف میں زیادہ روانی نہ تھی لیکن اپنی تصانیف دیباچۂ اخلاقیات اور اصول جبر سیاسی میں اس نے ہیوم کی مادیت اور بینتھم کی افادیت، اسپنسر کی انفرادیت اور جی ایچ لیوس کی اجابیت کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بتلایا کہ انسان دراصل ایک روحانی وجود ہے

جس کی طاقتوں اور قوتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ ان قوتوں اور طاقتوں کی ترقی کے لیے آزادی کی ضرورت ہو، اور اس قسم کی آزادی اس کو مملکت ہی میں مل سکتی ہے۔ مملکت کا خاص مقصد یہ ہو کہ وہ اُن رکاوٹوں کو رعایا کے افراد کے راستے سے دور کرے جو اس کی آزادی اور نیک زندگی بنانے میں حائل ہوتی ہیں۔ گرین کے خیالات دراصل کانٹ سے متعلق ہیں بہ نسبت ہیگل کے۔

اشتراکیت | اس صدی کے آغاز میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے تین چھوٹے چھوٹے سرچشمے اُبل پڑے جو سب مل جل کر مارکس کے دریا سے اشتمالیت میں ضم ہو گئے۔ پہلا چشمہ فرانس میں پھوٹا۔ اس کا منبع وہی روسو کی تعلیمات تھیں۔ اس نے اپنی تقریروں میں کہیں کہیں یہ کہا تھا کہ ابتداءً اصلی فطری حالت میں سب انسان آزاد اور برابر تھے کسی کو کسی پر فوقیت نہ تھی مال و اسباب ہر ایک کا مشترک تھا جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے لیتا اُس امن اور خوش حالی کی حالت سے اب جو یہ ابتری پھیل گئی ہے وہ محض اس وجہ سے ہے کہ ذاتی ملکیت کا دستور ہو گیا ہے۔ روسو کی اس اشتمالیت کو بعد میں مورلی (۱۷۵۵ء) اور میبلی (۱۷۸۵ء) نے اپنی اپنی تصانیف کے ذریعہ ترقی دی۔ فرانسیسی انقلاب کے زمانہ میں ایک شخص بیباف نامی (۱۷۹۶ء) نے بھی ان تخیلات کو عملی جامہ پہنانا چاہا لیکن وہ انقلاب ہی کا زمانہ تھا اور آزادی کو نعرہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا نہ کہ مساوات کو اس لیے یہ ہنگامہ اس وقت کامیاب نہ ہو سکا وہ اُس وقت تو دب گیا لیکن بعد میں کاؤنٹ سائمن (۱۷۶۰ء-۱۸۲۵ء) کی تصانیف کے ذریعہ پھر ہلکا ہلکا پیدا ہو گیا اس نے بتایا کہ غریبوں کا فایدہ اور بہتری مدنظر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام زمین اور پونجی اور تمام آلہ جات پیداوار ملکیت عامہ ہونی چاہیے اور یہ کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق کام کرے اور اس کو اس کا معاوضہ اس کی محنت کی نسبت سے ملنا چاہیے۔ ایک شخص مسمی فوریر (۱۷۷۲ء-۱۸۳۷ء) نے ایک اسکیم بنائی جس کے ذریعہ اس نے تمام نسل انسانی کو ایک نئے طریقہ پر ترتیب دیا کہ پانچ پانچ سو خاندان ایک عمارت میں رہیں اور ہر ایک عمارت میں نظریہ اشتمالیت برتا جائے اس کے بعد ایک دوسرے شخص پروڈھن (۱۸۰۹ء-۱۸۶۵ء) نامی نے ذاتی ملکیت اور گورنمنٹ

پر بات سخت سخت اعتراض کیے اور بتلایا کہ اس طرح کی گورنمنٹ کی بنیاد محض ذاتی ملکیت پر ہے۔ سب سے آخر میں لوی بلانک (۱۸۱۱ء تا ۱۸۸۲ء) نے ایک اسکیم مرتب کی جس میں اس نے مزدور جماعت کو اشتراکی اصولوں کی بنا پر ترتیب دیا۔

دوسرا چشمۂ اشتراکیت انگلستان میں پھوٹا۔ اس کا منبع دراصل جان ہال اور طامس مور و ہرینگٹن کی تصانیف، سترہویں صدی میں ایڈرارڈ اور ونسٹینلی کی تصانیف اٹھارویں صدی کے مفکرین مثل ولیم آگلیو اور طامس اسپنس وغیرہ کی تصانیف تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں دراصل چھ آدمی تھے جنھوں نے اشتراکیت کا پروپیگنڈا کرنا شروع کیا۔ ان چھ آدمیوں کے نام حسب ذیل ہیں (۱) چارلس ہال (۲) رابرٹ اوون (۳) ولیم ٹامپسن (۴) طامس ہاجسکن (۵) جان گرے (۶) جان فرانسس برے۔ ان کی تصانیف میں جو کچھ اقتصادی غلطیاں رہ گئی تھیں وہ بعد میں مارکس نے درست کر دیں۔

تیسرا اور آخری چشمۂ اشتراکیت جرمنی میں ابھرا وہاں اس کا منبع دراصل ہیگل کا فلسفۂ سیاست تھا (یعنی وہی روسو کی تعلیمات کا نتیجہ) یہاں اشتراکی خیالات کے خاص حامی یہ تھے (۱) کارل مارلو (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۹ء) جس نے اپنے زمانہ کی اقتصادی ابتری کو دیکھ کر یہ خیالات قایم کیے کہ ملکیت ذاتی کی بجائے عوام الناس کی ہو جائے۔ پیداوار فرداً فرداً نہ ہو بلکہ اجتماعاً آبادی کی ترقی یا تنزل کو قابو میں لانے کی کوشش کی جائے۔ (۲) راڈبرٹس (۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۵ء) نے مزدوروں کا ایک مسئلہ قدر بنایا اس نے اپنے زمانہ کی تعداد شرح سود اور آراضی کے لگان کی نابرابری کی شکایت کی اور آئندہ کے لیے ایک ایسی قومی اشتمالی مملکت کا خاکہ تیار کیا جس میں ہر ایک کا مرتبہ برابر ہوگا اور ہر شخص اپنی خدمات کی مناسبت سے انعام کا مستحق ہوگا (۳) فردیننڈ لسیلی (۱۸۲۵ء تا ۱۸۶۴ء) نے اگرچہ کوئی خاص باتیں نہیں کہیں لیکن اشتراکیت کا اس سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ پروپیگنڈا کیا کہ آخر ۱۸۶۳ء میں مزدوروں کی ایک ایسوسی ایشن قائم کر کے المانوی ساجی جمہوریت کی بنیاد ڈالدی۔

یہ تینوں چشمے آخر میں کارل مارکس (۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۳ء) کی اشتمالیت میں ضم ہوکر ایک ہوگئے مارکس دراصل ٹریوی میں پیدا ہوا تھا اس نے بان اور برلن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی جہاں اس نے ہیگل کے فلسفہ کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔ کچھ دنوں وہ بطور ایک انقلابی جرنلسٹ کے کام کرتا رہا آخرکو وہ فرانس بھاگ گیا۔ وہاں (۱۸۴۳ء-۱۸۴۵ء) پرودھن وغیرہ سے مل کر جو کچھ وہ نسل انسانی کی تنظیم کے متعلق سکھلا سکتے تھے سیکھا پھر بلجیم چلا گیا تین برس وہاں رہنے کے بعد کچھ دنوں کے واسطے جرمنی آیا اس کے بعد لندن آگیا اور اپنی بقیہ عمر (۱۸۴۹ء سے ۱۸۸۳ء) یہیں مطالعہ، تصنیف و تنظیم اور لوگوں کو اکسانے اور ابھارنے میں گزاری تاکہ بہت جلد ایک سماجی انقلاب پیدا ہوکر موجودہ قیود کو توڑ ڈالے، ورنئے سرے سے ایک آزاد وسیع النظر اشتمالی دولت عامہ قایم ہوجائے۔ اس کی اشتمالی اسکیم میں سماجی کیفیات تو فرانس کی ہیں، اقتصادی برطانیہ کی اور سیاسی جرمنی کی۔ اس کے خیالات زیادہ واضح طور پر اس کے اس مشہور اشتمالی اعلان میں ملتے ہیں جو اس نے ۱۸۴۸ء میں اپنے دوست انجلس کی مدد سے لندن کی اشتمالی کانفرنس کے موقعہ پر تیار کیا تھا اس نے ایک ضخیم تر تصنیف بھی چھوڑی ہے دراصل زر مگر اس میں کوئی نئی باتیں نہیں ہیں۔

مارکس کے نظام میں دراصل پانچ خاص باتیں ہیں یعنی (۱) اس کے نزدیک تصور تاریخ کا مادی ہونا نہ کہ روحانی جس کی بنا پر وہ یہ کہتا ہے کہ انسان نے ترقی دراصل خیالات میں نہیں کی ہے بلکہ جسمانی ضرورتوں کے فراہم اور مہیا کرنے میں (۲) اس نے ایک نظریہ کشمکش طبقہ جات کا قایم کیا جس کے ذریعہ اس نے قوموں کے عروج و زوال، ملکتوں کی کامیابی و ناکامیابی اور سماجی نظام کے مدوجزر کو ثابت کیا ہے۔ (۳) ایک نظریہ مزدوری کی قدر اور قدر مافوق کا بنایا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے اجتماعی کشمکش پیدا ہوتی اور ثابت ہوتی ہے۔ (۴) ایک نظریہ اقتصادی پیشین گوئی کا بنایا جس کی بدولت سرمایہ دارانہ شاہی کی تباہی پیشتر سے بتائی جاسکتی ہے اور اس کے بجائے غریبوں کی جنت کی طرح قایم کی جاسکتی ہے (۵) ایک ایسی اشتمالی ترکیب کا سوچنا جس کی وجہ سے جو انقلاب سماجی ہونے والا ہے وہ جلد تر ہوجائے۔

بیسویں صدی

ترتیب نو | مارکس کا سسٹم اس قدر زوردار ہو گیا کہ لوگ اس سے خائف ہونے لگے اور مارکس کا نام ہر جگہ نہایت دہشت خیز ہو گیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ ۱۸۶۴ء میں لندن میں ایک بین الاقوامی مزدور سبھا قائم ہوئی اور اس کا افسر اعلیٰ مارکس مقرر کیا گیا (حالانکہ پہلے کچھ لوگوں نے اسے اوسط درجہ کے طبقہ والا کہکر الگ کر دینا چاہا تھا) اس کے بعد یورپ میں چار اور دوسرے مقاموں پر یعنی جنیوا، لاسین بروسلس اور بیسل میں اسی سبھا یا ایسوسی ایشن کے اجلاس منعقد ہوئے (۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۹ء) ان میں بھی مارکس نہایت نمایاں رہا کیونکہ کئی زبانوں سے واقف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس کا سسٹم ان ممالک میں بھی مقبول ہو چلا۔ ان اجلاس نے وہاں کے ملکوں کی گورنمنٹوں کو اور صنعتی اداروں کو بھی اس لیے خائف کر دیا کہ ان اجلاس میں ان کے خلاف نہایت نفرت، غصہ، استقلال اور قوت کا اظہار کیا گیا تھا غرض ایک عام اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں بہت جلد ایک سماجی انقلاب نہ پیدا ہو جائے۔

لیکن تین باتیں ایسی ہو گئیں جن کی بنا پر یہ بین الاقوامی سبھا اور مارکس کا پروپیگنڈا نہ صرف شکست کھا کر بلکہ فنا ہو کر رہ گیا۔ اول تو مارکس کی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف لوگوں نے بغاوت کی دوسرے اسی زمانہ میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ آپڑی جس کی بدولت سبھا میں دو قومی فرقے قائم ہو گئے تیسرے یہ شک پیدا ہو گیا کہ آیا مارکس کا سسٹم ٹھیک بھی ہے کہ نہیں اور یہ چل بھی سکے گا کہ نہیں۔ چنانچہ ان تفرقوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۲ء میں سبھا اور سبھا والے تتر بتر ہو گئے۔

جب یہ اشتراکیت اس طرح ختم ہو گئی اور اس کے اصولوں میں کچھ تبدیلیاں ہو گئیں تو کہا گیا کہ اشتراکیت پر نظر ثانی کی گئی ہے یا وہ نئے طریقہ پر ترتیب دی گئی ہے۔ اب جو اصول مرتب کیے گئے وہ ایڈورڈ برنسٹین کی تصنیف ''ارتقائی اشتراکیت'' (۱۸۹۹ء) میں نہایت واضح طور پر درج ہیں اس نے پہلی بات تو یہ کی کہ تاریخ کے مادی تصور سے انکار کیا دوسرے یہ کہ سوسائٹی کے طبقہ جاتی کشمکش والے نظریہ میں کچھ ترمیمات کیں مزدوری کی قدر مافوق قدر والے نظریہ سے قطعی انکار کیا کہ یہ باتیں ہمارے کام

سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ اقتصادی پیشین گوئی کا بطلان کیا اور سب سے آخر میں مارکس کے اس خیال کو رد کیا کہ غریبوں کا ایک انقلاب عظیم پیدا کیا جائے بلکہ اس طرح ترمیم کی کہ بتدریج ان میں اصلاحیں کی جائیں تاکہ آخر میں چل کر وہی مقصد حاصل ہو جائے۔ ان خیالات کو تحریک لاس وان مارکس کہا گیا۔

جب یہ تحریک جرمنی میں کام کر رہی تھی، اور عملی سیاست پر اثر ڈال رہی تھی اسی زمانہ میں انگلستان میں ۱۸۸۴ء میں ایک فیبان سوسائٹی قایم ہوئی۔ انگلستان میں اشتراکیت ۱۸۴۸ء میں فرقہ چارٹسٹ کے فنا ہونے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد انگلستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی اس قدر ہوئی کہ ایک متوسط مزدور کے لیے، انقلاب کن خیالات کی ضرورت باقی نہ رہی، اس لیے اس وقت تک کوئی پروپیگنڈا اشتراکی قسم کا مقبول نہ ہوا لیکن ۱۸۸۰ء کے انگلستان کے صنعت وکاروبار میں تنزل ہونے لگا وجہ یہ ہوئی کہ جرمنی اور امریکہ سے مقابلہ ہونے لگا۔ دوسرے ملکوں نے اپنے اپنے یہاں درآمد مال پر محصول بہت لگا دیا اس کے علاوہ زراعت میں بھی زوال آگیا کیونکہ انگلستان امریکہ کی نئی زمینوں کے مقابلہ میں پیداوار پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے دیگر مقبوضہ ممالک بھی زراعت میں بڑھے ہوئے تھے۔ جب ایسی تکلیف اور مصیبتوں کا سامنا ہونے لگا تو پھر اجتماعیت کا زور فلسفہ اور عقلیت میں ہوا اور ٹی۔ایچ گرین نے اسے بہت ابھارا اس کے بعد جان اسٹوارٹ مل نے اپنی سوانح عمری (۱۸۷۳ء) میں اجابیت انسانی اور کچھ کچھ اشتراکیت کے پہلو نکال دیے اور لوگوں نے مارکس کی، اصل زر، پڑھنا شروع کی تب تو شدومد سے اشتراکیت کا دور دورہ ہو گیا۔

فیبان سبھا نے مارکس کے کچھ اصول مانے کچھ مسترد کر دیے مختصراً یہ کہ (۱) لوگوں نے اس کی مادیت اور اقتصادی پیشین گوئی اور کشمکش طبقہ جات کے اصول رد کر دیے اور مزدوری کی قدر والے مسئلہ کو باطل قرار دیا (۲) اس کے ساتھ ہی انھوں نے مارکس سے اس بارے میں اختلاف کیا کہ مملکت ایک قایم ادارہ ہو اور غریبوں کی حکومت کا ذریعہ اور انقلاب کے نظریہ سے بھی اختلاف کیا تاکہ ظاہر میں یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اشتراکی پہلو مدنظر ہو بلکہ ظاہراً محض اجتماعیت ہی معلوم ہو اور یہ کہا کہ رفتہ رفتہ کل انفرادی باتوں پر قبضہ کر و یہاں تک کہ محکمہ خطوط رسانی وغیرہ کو ان کی گورنمنٹ نے لے لیا اس کے بجائے

مزدوروں کی بتدریج ترقی پر زور دیا (۳) لیکن انھوں نے اس کے نظریہ سرحاصل قدر کو مان لیا اور اس خیال کی حمایت کی کہ زمیندار اور سرمایہ دار کے پاس سے سرمایہ الگ کر دیا جائے اور اس لیے سوسائٹی کو ایک نئی ترتیب اور نئے نظام پر قایم کرنا چاہیئے۔

فیبان سبھا کی پالیسی یہ تھی کہ بجائے حملہ کرنے کے رفتہ رفتہ مارو چنانچہ مملکت نے محکمۂ خطوط رسانی اپنے قبضہ میں کر لیا اسی طرح تمام مملکت اور مینو سپلٹی کی ترکیبیں یہ ہونا چاہئیں کہ پیداوار کے تمام ذرائع اپنے قبضہ میں کر لیے جائیں اور ذاتی ارادوں کے لیے بہت کم میدان چھوڑ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی مملکت اور مینو سپلٹی کی طرف سے بچوں، بیماروں، بوڑھوں اور بیروزگاروں، غریبوں اور مفلسوں کی مدد کی جائے ٹیکس دینے کے متعلق تعلیم ایسی دی جائے کہ جو تکلیف لوگوں کو ہوتی ہے وہ مسرت سے بدل جائے اور یوں سمجھایا جائے کہ اس طرح سرمایہ کی تقسیم مناسب طور پر ہو جائے گی اور اس سے غریبوں کا بھلا ہوگا۔ اس سبھا کے عروج کے دن ۱۹۰۹ء میں تھے جبکہ اس نے ایک قانون غریبی کی رپورٹ شایع کی اس کے بعد اس کی مخالفت شروع ہوگئی اور اس کو ختم کر دیا گیا۔ دراصل یہ ایک قسم کی اجتماعیت تھی جسے بعض لوگ اشتراکیت بھی کہتے ہیں۔

<u>مخالفین اجتماعیت</u> | ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۹ء تک اجتماعیت کو بہت سے موقعے اپنے جوہر دکھانے کے ملے۔ بسمارک نے جرمنی میں۔ فرانس میں وزیر اعظموں نے اور انگلستان میں بہت سے کابینوں نے (جو فیبان خیالات کے تھے) گورنمنٹ اور مینو سپلٹیوں کے ذریعہ اپنے خیالات کو عمل کا جامہ پہنایا نتیجہ یہ ہوا کہ ریلوے، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، ڈاک خانے، بندرگاہیں، روشنی کا انتظام، پانی کے نلوں کا انتظام یہ سب شعبے گورنمنٹ اور مینو سپلٹیوں کے تحت میں آگئے۔ ان تجربات سے یہ معلوم ہو گیا کہ کن کن صنعت و حرفتوں کو کس حد تک گورنمنٹ اور مینو سپلٹیاں اپنے قبضہ میں کر سکتی ہیں۔ دوسری طرف وہ مزدور طبقہ جو اس سے زیادہ آزادی اور اس سے زیادہ بہتر صورتوں کی امیدیں لگائے بیٹھا تھا ناامید ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اجتماعیت کی مخالفت شروع ہوگئی اور فیبان سبھا محض ایک حکومتی سرمایہ داری کہی جانے لگی اور جو اس کی موافقت میں تھے ان کے متعلق کہا گیا کہ یہ بدمعاش ناہنجار ہیں جو آزادی سے نفرت رکھتے

ہیں اور نہایت ہی بیوقوف ہیں جو یہ سمجھتے ہی نہیں کہ آزادی کیا ہے۔ غرضکہ صنعت و حرفت و پیشہ ور طبقے کے دل میں یہ ہول سما گئی کہ کہیں گورنمنٹ ہر قسم کے کاروبار پر قبضہ نہ جا بیٹھے اور ہم کہیں کے نہ رہیں اس لیے ایک نئے قسم کی آزادی کی پکار پیدا ہوئی (آزادی ہمیشہ انفرادیت کے ساتھ وابستہ رہی ہے اور مساوات اشتراکیت کے ساتھ) لیکن یہ آزادی افراد نہ تھی بلکہ صنعت و حرفت کے پیشہ ور طبقوں نے یہ صدائے احتجاج بلند کی۔ سب سے پہلے یہ تحریک فرانس میں اٹھی اور اس کا نام رکھا گیا اتحادیت۔

انیسویں صدی کے اختتام کا زمانہ تھا کہ یہ تحریک یکایک فرانس کی انجمن ہائے اتحاد مزدوراں میں پیدا ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مزدوروں اور پیشہ وروں کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا اس لیے ان کی انجمنوں کے نام پر اتحادیت کہلائی گئی۔ یہ تحریک دراصل گورنمنٹ اور طریقۂ گورنمنٹ کے خلاف ایک بغاوت سی تھی کیونکہ اس زمانہ کی گورنمنٹ مزدوروں کے ساتھ ایمانداری اور خوش معاملگی کا برتاؤ نہیں کرتی تھی دوسرے یہ کہ اشتراکیت نے جو وعدے کیے تھے وہ پورے نہیں کیے تیسرے یہ کہ صنعت و حرفت کے کاروبار میں نہایت سختی برتی جانے لگی تھی۔

اس اتحادیت کے اعتقادات یہ تھے کہ مملکت کی قطعی خلاف ورزی کی جائے۔ اتحادیت میں کسی کو لیڈر نہ بنایا جائے عقل کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ ضبط و صبر کے مقولوں کو چھوڑ دیا جائے اور ان سب کے بجائے کیا ہو؟ شدید انقلاب، نہایت تیزی کے ساتھ عمل، سب ایک دم کر دیا۔ عقل کے بجائے فطری جبلت رہنما بنائی جائے اور نہایت ہی شدید جوش اور سرگرمی کی حالت پیدا کر دی جائے اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ طبقات سوسائٹی میں نہایت خونریز جنگ ہو۔ عام ہڑتالیں خوب کی جائیں کیونکہ اسی ہتھیار کے ذریعہ سرمایہ داروں کے دماغ ٹھیک ہو سکتے ہیں سرمایہ دار اور زمیندار کے پاس روپیہ کسی حالت میں نہ رہنے دیا جائے اور جب ہر طرف گڑبڑ پیدا ہو جائے تو سوسائٹی کی نئے سرے سے تعمیریں کی جائے کہ کاروباری اتحادیوں کا ایک وفاق بنا دیا جائے یوں سمجھ لیجئے کہ اگر یہ آخری مقصد بھی تعمیری نہ ہوتا تو یہ آگ لگا کے تماشہ ہی دیکھنا تھا۔ اس سے بالکل نراجی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لیکن مقصد تعمیر تھا نہ کہ تخریب۔

اتحادیت محض خیال ہی کی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ فوراً عمل میں لائی جانے لگی ۱۹۰۲ء میں مزدوروں کی جماعت عامہ میں یہ اعتقادات مروج ہو گئے اور ۱۹۰۶ء اور اس کے بعد خوب خوب ہڑتالیں ہونے لگیں۔ سویڈن میں بھی ۱۹۰۹ء میں اس کا تجربہ کیا گیا جو وہاں ناکامیاب رہا۔ اسی زمانہ میں یہ تحریک انگلستان پہنچی۔ ایک شخص مسمی ٹام مین اس کا خاص واعظ ہو گیا اور ۱۹۱۱-۱۲ء میں کوئلہ کی کانوں اور محکمہ ریل میں خوب خوب ہڑتالیں ہوئیں ایک کان کھودنے والوں کی ایک وفاق بھی قائم ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ اطالیہ کو بالکل تباہ کر ڈالا تھا کہ فاسزم نے ۱۹۲۲ء میں اس کو روکا۔ امریکہ میں یہ اب بھی دنیا کے صنعتی مزدور کے نام سے باقی ہے۔

چونکہ اتحادیت مملکت کے قطعی خلاف تھی اور سیاست کی ہر صورت و شکل سے قطعی منحرف اس لیے فرانس سے باہر دوسرے ملکوں میں کم مقبول ہوئی۔ انگلستان میں خصوصاً یہ لوگوں کے اشتراکی مزاج اور طبائع کے قطعی خلاف ٹھہری چونکہ ہر مزدور کو حق رائے دہندگی حاصل تھا اس لیے میونسپل اور پارلیمنٹ کے انتخابات میں بھی اس کی آواز تھی پھر وہ کیوں اور خواہ مخواہ کے جھنجھٹوں میں پڑتا چنانچہ انگلستان میں اجتماعیت کے اس ہولناک پروپیگنڈے نے بہ نسبت فرانس کے بہت کم اثر کیا پھر بھی جو اشتراکی مملکت کے خلاف باغی پیدا ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو نہ اتحادی کہا نہ نراجی بلکہ انجمنی فیبان اور انجمنیوں کے تصور مملکت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اول الذکر کا مقصد یہ تھا کہ مملکت تمام زر و زمین کی مالک ہو جائے ہر پیداوار، تقسیم پیداوار، تبادلہ سب مملکت کے تحت میں ہو۔ انجمنیوں کے تصور میں مملکت کو صنعت و حرفت میں کسی قسم کا حصہ نہ لینا چاہیے۔

انجمنیوں کی پالیسی اصل میں دوہری تھی ایک طرف تو یہ کہ صنعتی و حرفتی پیشہ وروں کی ایک تنظیم ہو۔ تمام قومی انجمنوں یا اتحادِ مزدوراں کی ایک وفاق ہو جو ملک کے تمام اقتصادی معاملوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے دوسری طرف یہ کہ غیر اقتصادی کام کرنے والوں کی ایک دوسری تنظیم ہو جو مملکت اور دیگر سیاسی اُمور کی دیکھ بھال کرے یعنی جو اقتصادی نہیں ہیں لیکن اگر انجمنی لوگ کامیاب ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ملک کا ہر ایک شعبہ ایسی ہی آرزوئیں پیش کرے گا مذہبی لوگ یہ کہیں گے

کہ ایک مذہبی وفاق بنا دیا جائے جو سوائے مذہب کے اور کسی معاملات میں دخل نہ دے اور دوسری تنظیم غیر مذہبی جماعت کی تمام امور غیر مذہبی کی نگرانی کرے۔ اسی طرح یونیورسٹیاں، اسکول، سوسائٹیاں کلب وغیرہ قسم کی تنظیمی اسکیمیں بنانے لگیں گی۔

نئی انفرادیت اشتراکیت اب بھی مزدور پارٹیوں اور انجمن ہائے اتحادِ مزدوراں میں موجود ہے اور یہ میدان سیاست میں لڑائی تو لڑ رہی ہے لیکن اپنے بچاؤ پر سے حملہ نہیں کر پاتی۔ اس کے خاص دشمن وہی ہیں جن کو اس نے خود ہی پالا پوسا ہے۔ مارکس کے سسٹم کو ثانوی نظریت والے لوگوں نے تباہ کیا۔ فیبیان کا نقشہ اتحادیت اور انجمنیت نے بگاڑ دیا جن کو خود اسی نے پالا تھا رہی اتحادیت و انجمنیت یہ نراجی لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہے جن کو خود اسی نے اپنے مقاصد کے لیے تیار کیا تھا۔ مثلاً برٹنارڈ رسل (موجودہ مشہور فلاسفر) اپنی تصانیف 'اصول تعمیر نو' (۱۹۱۶ء) آزادی کے راستے' (۱۹۱۸ء) وصنعتی تہذیب کے مواقع' (۱۹۲۳ء) میں اپنی تعمیری طاقتوں کے خلاف کسی قسم کی رکاوٹ کو نہایت حقارت وغصہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور قطعی کسی قسم کا جبر برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ خالص طور پر نراجی فرد کہا جا سکتا ہے پروفیسر آئج۔ جے لاسکی اپنی تصانیف 'مسئلہ حکومت' (۱۹۱۷ء) تحکم موجودہ مملکت میں' (۱۹۱۹ء) اور قواعد سیاست (۱۹۲۵ء) میں بھی انھیں قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ اس قدر انتہا پسند نہیں ہے جتنا کہ برٹنارڈ رسل مملکت کی حکومت کی وہ قطعی مخالفت کرتا ہے (بادین، ہابس بنتھم اور آسٹن نے طے کیا تھا) کہ یہ اصول انفرادی آزادی کے متضاد ہیں (اجتماعی اور اشتراکی اس کو منظور نہیں کرتے) اور فرد کے فطری حقوق کو حقیقت اصلی تصور کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ سزا اور حکم دینے کی طاقت تقسیم کر دی جائے۔ سیاسی صنعتی اور مذہبی اداروں میں کیونکہ ذاتی آزادی کے لیے یہ ضروری ہے اور ذات کی بھلائی، بہبودی اور بہتری ہر ادارے کا فرض ہے جیسا بھی ہو۔ قریب قریب یہی اصول گاڈوین نے اپنی 'عدل سیاسی' میں پیش کیے تھے۔

لیکن یہ محض نراجی لوگ ہی (جو اشتراکیت، اتحادیت اور انجمنیت سے بچ گئے ہیں) انفرادیت کا راگ نہیں گاتے بلکہ وہ آزاد خیال طبقہ بھی جو بنتھم اور مل کے فلسفہ کو اپنا ملجا و ماوا بناتے ہیں ان میں

سب سے زیادہ مشہور پروفیسر ہابؔ ہاؤس ہو جس نے سماجیات پر چار ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور ہیگل کے نظریہ مملکت کے خلاف نہایت قابلیت سے خامہ فرسائی کی ہو (۱) مملکت کا مابعد الطبیعاتی نظریہ ۱۹۱۸ء (۲) خیر و بہبودی عقل کے مطابق ۱۹۲۱ء (۳) عدل سماجی ۱۹۲۲ء (۴) سماجی ترقی ۱۹۲۴ء ان کتابوں میں یہ بتلایا گیا ہو کہ صرف ذات ہی میں شخصیت ہوتی ہو نہ کہ مملکت میں جیسا کہ ہیگل کے پیرؤوں کا خیال ہے اور سماج کی بنیاد اخلاقیات پر قایم ہو اخلاق سے ماوراء نہیں۔ دوسرے یہ کہ مملکت مشین کی طرح ایک ادارہ ہی جو رواجاً قایم ہو گیا ہے یہ ایک جاندار عضو نہیں جیسا کہ ہیگل کے پیرؤوں کا خیال ہو اور مملکت کے افعال وہ ہونا چاہئیں جن سے عوام کا بھلا ہو اور سب سے عمدہ بھلائی فرد کی شخصی آزادی ہے۔

لارڈ سیسل نے اپنی تصانیف "آزادی و محکومیت ۱۹۱۰ء۔ قدیم پرستی ۱۹۱۲ء حب وطن و آزادی خیال۔ صاف دلی ۱۹۱۸ء" میں بھی اسی انفرادیت کا پہلو لیا ہو جس طرح کہ پروفیسر لاسکی کہتا ہو کہ گاڈوین کے اصولوں پر چلو اور پروفیسر ہابؔ ہاؤس اور بینتھم کے اصولوں کو مانو اسی طرح سیسل کہتا ہو کہ برک کے اصول اختیار کرو سیسل کہتا ہو کہ سوسائٹی اور مملکت کی بنیاد دراصل پہلے مذہبی ہوئی انسان کے ذاتی ضمیر کو بلند مانتا ہو آزادی اور شخصی ملکیت کی حمایت کرتا ہو کہ یہ ہمارے پیدائشی حقوق ہیں اور انفرادی کردار کی ترقی کے لیے آزادی کو لازمی قرار دیتا ہو۔

غرضکہ بیسویں صدی میں انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہونے والی اجتماعیت اور اشتراکیت کے خلاف شدید احتجاج ہوا اور ہر طرف سے سخت مخالفت ہو رہی ہو۔ یہ مخالفت اور باہمی بحثا بحثی آج کل بڑے گل کھلا رہی ہو؟ اس سے کیا نئے تفکرات آیندہ پیدا ہوں گے اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس کے کہ یہ غالباً بنی نوع انسان کو سیاست کے بے انتہا بلند زینہ پر یا ایک زینہ اور اوپر لے جائے لیکن اگر ابھی نہیں تو کبھی نہ کبھی تو ضرور آپس میں ضد رکھنے والے سیاست کے مسائل مثلاً قانون و آزادی، انتظام و ترقی ضمیر و محکومیت، ذات اور قوم فرد واحد اور مملکت حل ہو کر ایک ہو جائیں گے۔

موجودہ زمانہ

جنگ عظیم ۱۹۱۸ء نے تمام سیاسی نظریوں کو پرکھا تھا لیکن کچھ کسر رہ گئی تھی۔ جرمنی اپنی زبوں حالی کا داغ دل پر لیے تھا۔ اٹلی کو حصہ کم ملا تھا اس لیے وہ بھی حاسدانہ طور پر بے چین تھا اس لیے ضرورتاً ان ممالک میں ایسے آمر پیدا ہو گئے جنھوں نے ایک نئے سیاسی طرزِ تفکر کی بنیاد ڈالی لیکن اس کے ذکر سے قبل اشتراکیت پر ایک سرسری نظر ڈالیے ۱۸۶۵ء میں مارکس نے مزدوروں کی ایک بین الاقوامی انجمن منعقد کی تھی جس کو بعد میں پہلی بین الاقوامی سبھا کہا گیا۔ اس کے صرف چند ہزار ممبر تھے اور کوئی پارٹیاں نہ تھیں اور اس کا جھگڑا محض نراجیت سے تھا ۱۸۷۶ء میں یہ سبھا اس جھگڑے کی بدولت ختم ہو گئی۔ مارکس ۱۸۸۳ء میں وفات پا گیا لیکن اینجلس ۱۸۹۵ء تک اس کا کام سنبھالتا رہا۔ ۱۸۸۹ء میں دوسری بین الاقوامی سبھا کا اجلاس ہوا اور خیال تھا کہ یہ سبھا تمام دنیا میں انقلاب برپا کر دے گی لیکن اب کی اصلاحی اور انقلابی آپس میں جھگڑنے لگے۔ انقلابی یک دم پُرزور انقلاب چاہتے تھے اور اصلاحی امن پسندی کے ساتھ بتدریج انقلاب کے حامی تھے۔ ۱۹۱۲ء میں مزدوروں نے جنگ کے خلاف ایک متحدہ فیصلہ دیا کہ وہ ہر جنگ کرنے والے ملک کے خلاف ہو جائیں گے لیکن جب ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑ گئی تو ہر مزدور اپنے اپنے ملک کو بچانے کی خاطر لڑا۔ انقلابیوں نے اس حرکت کو نظرِ حقارت سے دیکھا اور ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی اور روس میں لینن کی قیادت میں برسرِ اقتدار آ گئے۔ جرمنی میں لیبناخ کی قیادت میں انقلابیوں نے اسپارٹیکس لیگ کی بنیاد ڈالی جس نے نومبر ۱۹۱۸ء میں وہ انقلاب برپا کیا جس کی بدولت جنگِ عظیم ختم ہو سکی لیکن اب اصلاحی اقتدار میں آ گئے اور انقلابی انقلاب کو مزید آگے نہ بڑھا سکے۔ لیبناخ اور روزا لکسمبرگ جو انقلابیوں کے سرغنہ تھے، مار ڈالے گئے اور انقلابیوں کی اسپارٹیکس لیگ و کمیونسٹ پارٹی ختم کر دی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں تیسری بین الاقوامی سبھا کا انعقاد ہوا اور اشتراکیت میں یہ تمام جھگڑے جو پیدا ہو گئے تھے اس طور پر ختم ہو گئے کہ بڑی بڑی کمیونسٹ پارٹیوں نے یورپ کے بیشتر ممالک میں اپنے کو اشتراکیوں سے الگ کر لیا اور بہت سے ملکوں میں دیگر اشتراکیوں

نے حکومت سے مصالحت کرکے اس کے ملازم ہو گئے اور یہ کہا کہ جب تک اشتراکیوں کی اکثریت نہ ہو جائے گی ہم کوئی اپنی گورنمنٹ علیحدہ نہ بنائیں گے۔ دوسری طرف ٹراٹسکی اور اسٹالن میں اس مسئلہ پر جھگڑا ہوا کہ اشتراکیت کا پروپیگنڈا ہر ملک میں کرنا چاہیے تاکہ دشمنوں کی تعداد کم ہو اور دوستوں کی بڑھے تاکہ روس کو بالواسطہ مدد مل سکے۔ اسٹالن اس کے خلاف تھا اور وہ پہلے اپنے ملک کو مضبوط کرنا اور نمونہ بنانا چاہتا تھا اور دوسروں کو دوسروں کی سمجھ پر چھوڑتا تھا۔ چنانچہ ٹراٹسکی جلا وطن کر دیا گیا روسی سراغرساں اس کے پیچھے لگے رہے آخرکار ۱۹۲۹ء میں میکسیکو میں اسے ختم کر دیا گیا وہ وصیت کر گیا کہ اس کے رفقا چوتھی سبھا کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ اشتراکی الخیال وطن پرستوں نے اٹلی میں ایک نئی تحریک پیش کی جس کا قائد مسولینی تھا اور اسی طرح جرمنی میں بھی ایک نئی انجمن تعمیر ہوئی جس کا بانی ہٹلر ہوا اگرچہ یہ دونوں تحریکیں کوئی خاص نظریہ تفکر نہیں رکھتیں اور یہ بتانا دشوار ہے کہ دراصل فاشستی مسلک کیا ہے؟ لیکن اس کے رویہ سے ہم ایک فاشستی رویے کا خاکہ تیار کر سکتے ہیں۔ فاشزم کا سب سے پہلا عقیدہ یہ ہے کہ ریاست کا اعلیٰ نمونہ قومی ریاست ہے کامل ترین ہم آہنگی صرف اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب قومی اتحاد ایک متحد الروایات جمعیت پر ہو سیاسی اتحاد سے منطبق ہو جائے لیکن قومی مملکت کا فاشستی تصور اس کے جمہوری تصور سے بالکل مختلف ہے اس لیے کہ جمہوری قومیت اصولاً پُرامن اتحاد کی طرف چلتی ہے۔ اس کے برعکس فاشسٹ اس بین الاقوامی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے وہ اس کے سوا دنیا کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ دنیا باہمی جنگ میں مبتلا قومیتوں کا ایک مجموعہ ہے ان کے لیے قومیت کا نظریہ آپ ہی اپنا مقصود ہے عملی صورت میں فاشستی نظریہ اقتصادی شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور تمامتر خود غرض، خود پسند اور جنگجو ہے۔ فاشستوں کے نزدیک قومی ریاست حقیقی طور پر ایک متحد سماج ہے جس نے ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے۔ فاشستی مسلک کا اصل اصول یہ عقیدہ ہے کہ ہر قومی جماعت قوت و اقتدار حاصل کرنے کے لیے آزادانہ اقدام عمل کا مطلق حق رکھتی ہے۔ خود پروری کی زبردست خواہش، اپنی عظمت کا ایک باطنی احساس اور اپنے دعووں کے جواز کا (خواہ وہ کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں) مطلق اعتقاد فاشستی قومی جماعتوں کی متاع

خصوصیات ہیں۔ مسلکِ فاشستی کے نزدیک ریاست کی تنظیم کا اولین مقصد یہ ہو کہ پوری سیاسی عمارت اس طرح قایم کی جائے کہ ملک کے تمام عناصر (غریب و امیر، کمزور و مضبوط) اس کو تقویت دینے میں حصہ لیں۔ آجروں اور مزدوروں کے درمیان جماعتوں کی داخلی جنگ میں فاشزم کوئی جگہ نہیں رکھتی اس لیے کہ یہ تصادم ملک کو کمزور کر دیتا ہو۔ انفرادی آسودہ حالی یا انفرادی شخصیت کو فاشزم میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں اس لیے کہ فاشستی عقیدہ کے مطابق فرد کی آسودہ حالی ریاست کے وجود سے علیحدہ وجود نہیں رکھتی۔ فاشستی کے نزدیک فرد کا تصور اور اس سماج کا تصور جس سے وہ تعلق رکھتا ہو ایک دوسرے کا تکملہ اور ایک حقیقی ہیئت اجتماعیہ کے اجزا ہیں جن کا جدا ہونا ممکن نہیں۔ حقیقت میں یہ ایک تحکمانہ حکومت ہو جس میں فرد کی شخصیت اصولاً قاید اور حکومت کی پورے طور پر محکوم ہے یہ مملکت پارلیمنٹی جمہوریت اور شوریٰ پر قطعاً اعتماد نہیں رکھتی وہ ایک قاید ڈیوچ یا فیوہرر اور سیاسی اقدام عمل کی قائل ہو۔ فاشسزم اور نازی ازم یہ دونوں تحریکیں کسی خاص جماعتی بنیاد پر ادنیٰ یا اعلیٰ اور متوسط طبقہ تک محدود نہیں بلکہ عوام الناس سے تعلق رکھتی ہیں اگرچہ ان عوام کو روس کے مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت سے مشابہ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ سرمایہ داروں کی پیدا کی ہوئی بھی نہیں اگرچہ یہ درست ہو کہ ان تحریکوں کے وجود میں آنے کے بعد سرمایہ داران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور فاشسزم کے اصول کے مطابق وہی قابض ہو سکتے تھے فاشستی کہتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی مخفی قوتیں جماعتوں کے درمیان جنگ کا سبب ہیں اس لیے فاشسزم کا مقصد ان دونوں عناصر کو اس طرح قابو میں لاکر کہ وہ جماعتوں کی باہمی جنگ کا سبب نہ بن سکیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا ہو۔ چنانچہ فاشستی ریاست کے امتیازی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) مصائعت یعنی فرد اور ریاست کی ایک دوسرے سے موافقت۔

(۲) ادغام یعنی ریاست کی زندگی میں فرد کا شامل اور مدغم ہو جانا۔

(۳) اتحاد کلی یعنی فرد اور ریاست کا متحد ہو کر ایک ہو جانا۔

مناسب اداروں کو قایم کرکے ان اصولوں کو عمل میں لانے کی کوشش کی جاتی ہو اطالیہ میں ان اداروں کو مجموعی طور ریاست کی ہیئت اجتماعیہ کہتے ہیں۔ جرمنی میں بھی نازی پارٹی کے ۲۵ اصول یہ تھے

(۱) تمام المانیوں کا اتحاد۔

(۲) ورسائی کی صلح کا بطلان

(۳) نوآبادیات کا حصول

(۴) یہودیوں اور غیر جرمنوں کا اخراج

(۵) غیر نازیوں کا اخراج

(۶) ملازمتوں کے لیے سیرت وقابلیت کا خیال

(۷) ریاست سب کی فلاح کا خیال کرے۔

(۸) غیر ملک والوں کی آمد کا سدباب

(۹) تمام شہری حقوق و فرایض میں برابر ہیں

(۱۰) ہر شخص کو ریاست کی بہبودی کی کوشش کرنا چاہیے

(۱۱) رشوت کا سدباب

(۱۲) جنگ کے زمانہ میں فایدہ اٹھانے کی روک۔

(۱۳) جتنے اوقاف ہیں ان کا بحق حکومت الحاق

(۱۴) سٹوک تجارتوں کا سدباب

(۱۵) بڑھاپے میں پنشن اور بیموں کا رواج۔

(۱۶) خوردہ فروشی کا رواج

(۱۷) ملک کے سیاسی مجرموں اور ناجائز تجارتی فایدہ اٹھانے والوں کا قلع قمع۔

(۱۸) اصلاح زمین۔

(۱۹) رومن قانون کی بجائے جرمن قانون کا نفاذ۔

(۲۰) قومی تعلیم

(۲۱) قومی صحت کی بہتری

(۲۲) جبری فوج

(۲۳) پریس پر قبضہ

(۲۴) تمام مذاہب کو عام آزادی اگر وہ حکومت میں دخیل نہ ہوں۔

(۲۵) مرکز پر طاقتور قوت۔

ان اصولوں سے بھی فرد کا ریاست میں مدغم ہو جانا عیاں ہو۔

اصولاً فاشزم کا مقصد ان معاشرتی اور سیاسی اصولوں کی تجدید کرنا ہو جو انفرادیت کی کامیابی سے پہلے (جو نشاۃ الثانیہ کے فلسفیانہ تفکر کا نتیجہ ہو) مہذب دنیا میں کارفرما تھے۔ اس صورت میں فاشزم کوئی نیا عقیدہ نہیں بلکہ محض ایک طرز خیال ہو جو نیا معلوم ہوتا ہو۔ نازیت نے

قومی تصور کو اطالوی فاشزم سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اطالوی فاشزم قومیت کو ریاست میں بالکل جذب کرنا چاہتا ہے۔ فاشستی ریاست قومیت کا اولین اظہار ہے لیکن جرمن نازیت ریاست کو قوم کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت دیتی ہے۔ اطالیہ میں ریاست کی معاشی ہیئت اجتماعیہ اس اصول پر قایم کی گئی ہے کہ مزدور اور آجر دونوں ایک حد تک ریاست کے خادم بن جائیں۔ تیرہ ایسی انجمنیں بنائی گئی ہیں جن کے نظام میں مزدوروں اور آجروں کو برابر کی قوت حاصل ہے ایسی انجمنی نظام سے مجلس مقننہ منتخب کی جاتی ہے۔ ہر بڑی انجمنوں سے ایک ہزار نمایندے منتخب کیے جاتے ہیں جن میں سے فاشستی مجلس عالیہ چار سو کا انتخاب کرتی ہے اور آخر میں عام رائے دہندگی کے ذریعہ سے ان ہی کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ جرمنی میں معاشی نگرانی کی اسکیم اطالیہ سے مختلف ہے۔ جماعتی تنظیمات قایم کرنے کے بجائے نازیوں نے معاشی طریق عمل معین کرنے کا تمام تر اختیار مرکزی سیاسی حکام کو دیدیا ہے اور نفاذ کے لیے سرکاری دفاتر کا ایک مکمل نظام قایم ہے۔

فاشزم گو بظاہر ایک مکمل نظام معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے بنیادی نقایص یہ ہیں کہ اول تو مطلق العنان قیادت ناقابل پذیرائی ہے قوم کو صرف قاید کا محکوم ہو کر رہنا پڑتا ہے۔ عوام کی جماعت قوت و اقتدار کا ماخذ نہیں بلکہ خود ایک قاید ہے جس کو جماعت بھی برطرف نہیں کر سکتی۔ اتفاقاً ایک عمدہ قیادت کے بعد یہ ضروری نہیں کہ یہ سلسلہ کامیابی کے ساتھ جاری رہ سکے پیدایشی جانشینی عبث ہے دوسرے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر طاقت بدعمل ہو جاتی ہے اور تمام تر خود اختیاری کی قوت بدعملی کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً ہٹلر کی سامیت دشمنی کا طریق عمل اور نسل کی پاکیزگی کا اصول ذاتی وہم نہیں تو کیا ہے؛ تیسرے یہ کہ جرمنی اور اطالیہ دونوں جگہ درحقیقت فاشستی مختار کل ریاست سرمایہ داروں کی اجارہ دار ڈکٹیٹر شپ بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی دیکھا جائے تو فاشستی مسلک کا نصب العین محض قومی طاقت ہے لیکن اس قومی طاقت کا آخری مقصد کیا ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں انفرادی آسودہ حالی اور آزادی کے لیے اس میں کسی دوسرے تصور کی گنجایش نہیں۔

اب تک فاشستی لائحہ عمل کو حقیقتاً جنگ کے بعد جوش کی بدولت اتفاق رائے حاصل

رہا ہے۔ فاشستیوں نے اب تک اشتراکیوں اور اشتمالیوں کے غیر وطن پرست اور انقلابی اثر کے خلاف وطن پرستی کے ردّ عمل سے فائدہ اٹھایا لیکن ایک منفی جذبہ ایک نظام حکومت کی مستقل بنیاد نہیں بن سکتا۔ ہٹلر اور مسولینی کے پاس جرمن اور اطالوی قوم کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی قطعی اور معین مقصد نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ انھیں ایک مختار کل ریاست کے ماتحت متحد کر سکیں۔ تشدد محض ایک قلیل مدت تک فرمانرواؤں کا اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تشدد کسی مستحکم اور مستقل نظام حکومت کا ممتاز عنصر بن سکتا ہے۔

غرضکہ آج کل فاستزم، جمہوریت اور اشتراکیت میں جنگ عظیم برپا ہے وہ سیاسی نظریے جو عقل و فراست سے طے نہیں ہوئے اب قتل و خوں ریزی سے طے کیے جا رہے ہیں۔ اس جنگ کے بعد کیا نئے نظریے پیدا ہوں گے؛ اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فاشزم کی حقیقت

۔ورپ کی موجودہ فاشستی ریاست کی ماہیت کے متعلق جب بھی تحقیق کی جائے تو اُس نظریہ ظیم کا مطالعہ کرنا چاہیے جس پر اطالیہ کی فاشستی اور جرمنی کی نازی ریاست قایم ہو اس لیے کہ دونوں ریاستوں کی اصولی بنیاد ایک ہی نظریہ پر ہو۔

زم یا فاشستی مسلک کیا ہے؟ | یہ بتانا کہ فاشستی مسلک کیا ہو بہت دشوار ہو اس کے مقصد کی صحیح حد بندی ی کی جاسکتی ہو اس لیے کہ اس مسلک نے یقینی اور قطعی طور پر اصول اور عقاید کے کسی مخصوص سلسلے، لائحہ عمل ظیم ادارت کی صورت اختیار نہیں کی اطالیہ اور جرمنی کی حکومتیں بڑی حد تک ایک تجربی اور التی ن حالت میں ہیں تاہم اس تغیر پذیر صورت حال کی تہہ میں ایک مستقل اور مستقیم رویہ بھی موجود ہے، سے ہمیں فاشستی ریاست کا ایک خاکہ تیار کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔

فاشزم کا سب سے پہلا عقیدہ یہ ہو کہ ریاست کا اعلیٰ نمونہ قومی ریاست ہے کامل ترین آہنگی صرف اُس وقت حاصل ہو سکتی ہو جب قومی اتحاد جس کی بنیاد ایک متحد الروایات جمعیت سیاسی اتحاد سے منطبق ہو جائے لیکن قومی مملکت کا فاشستی تصور اس کے جمہوری تصور سے بالکل ف ہو اس لیے کہ جمہوری قومیت اصولاً پُر امن بین الاقوامی اتحاد کی طرف جھکتی ہو اس کے برعکس شست اس بین الاقوامی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے وہ اس کے سوا دنیا کا تصور ہی نہیں سکتے کہ وہ باہمی جنگ میں مبتلا قومیتوں کا ایک مجموعہ ہو ان کے لیے قومیت کا نظریہ آپ ہی اپنا ہو رہی گی صورت میں قومیت کا فاشستی نظریہ اقتصادی شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لیتا ہو اور خود غرض، خود پسند اور جنگجو ہو۔ فاشستوں کے نزدیک قومی ریاست ایک حقیقی طور پر متحد سماج ہے نے ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہو مسلک فاشستی کا اصل اصول یہ عقیدہ ہو کہ ہر قومی جماعت ند اقتدار حاصل کرنے کے لیے آزادانہ اقدام عمل کا مطلق حق رکھتی ہو۔ خود پروری کی زبردست

خواہش، اپنی عظمت کا ایک باطنی احساس اور اپنے دعووں کے جواز کا (خواہ وہ کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں) مطلق اعتقاد فاشستی قومی جماعتوں کی ممتاز خصوصیات ہیں یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ فاشزم شکست خوردہ قوموں کا مسلک ہے۔

فاشستی عقیدہ کے مطابق اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے وہ جماعتی اختلافات کی بنا پر افراد کے باہمی جھگڑوں کو رفع کرنا نہیں ہے بلکہ ان ہی اختلافات کی وجہ سے جو جنگ و جدال کا بازار مختلف قوموں کے درمیان گرم ہے ان کا خاتمہ کرنا ہے آج غریب یا مزدور قومیں دولتمند یا سرمایہ دار قوموں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں اس لیے مسلک فاشستی کے پیروؤں کے نزدیک ریاست کی تنظیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ پوری سیاسی عمارت اس طرح قایم کی جائے کہ مملکت کے تمام عناصر اس کو تقویت دینے میں حصہ لیں۔ آجروں اور مزدوروں کے درمیان جماعتوں کی داخلی جنگ میں فاشزم کوئی جگہ نہیں رکھتی اس لیے کہ یہ تصادم مملکت کو کمزور کرتا ہے اس کی پستی، درکمتری کی حالت کو مستقل کرتا ہے۔ انفرادی آسودہ حالی یا انفرادی شخصیت کو فاشزم میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں اس لئے کہ فاشستی عقیدہ کے مطابق فرد کی حقیقی آسودہ حالی ریاست کے وجود سے علیحدہ وجود نہیں رکھتی۔ فاشستی کے نزدیک فرد کا تصور اور اس سماج کا تصور جس سے وہ تعلق رکھتا ہے ایک دوسرے کا تکملہ اور ایک حقیقی ہیئت اجتماعیہ کے اجزا ہیں جن کا ایک دوسرے سے جدا ہونا صرف ذہن میں ممکن ہے۔

چونکہ فاشستی ریاست کا اولین مقصد ملک کی طاقت بڑھانا اور اسے مستحکم کرنا ہے اس لیے فاشستی حکومت کی تنظیم عمودی طریق پر واقع ہوی ہے یہ حقیقت میں ایک تحکمانہ حکومت ہے جس میں فرد کی شخصیت اصولاً قاید اور حکومت کی پورے طور پر محکوم ہے یہ مملکت پارلیمنٹی جمہوریت اور شورئی پر قطعاً اعتماد نہیں رکھتی وہ ایک قاید، ڈیوچ یا فیوہرر اور سیاسی اقدام عمل کی قائل ہے۔ یہ امر معرض بحث میں ہے کہ فاشزم متوسط طبقہ کی تحریک تو نہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ زوال پذیر متوسط طبقہ کا آخری سیاسی سانس ہے۔ دراصل جنگ کے بعد سے متوسط طبقہ کا زوال تحکم پسندی کے عروج کے اہم ترین اسباب میں سے ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ نظریہ درست ہے۔ فاشزم اور نازیت کے متعلق جتنی کتابیں لکھی گئیں ہیں

ان سب میں تمام قوم کو مخاطب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں تحریکیں کسی خاص جماعتی بنیاد پر ادنیٰ یا اعلیٰ متوسط طبقہ تک محدود نہیں بلکہ عوام الناس سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ فاشستی اور نازی تحریکوں کو جمہوری تحریکوں کے نقطۂ نظر سے روس کے مزدوروں اور کسانوں کی جمہوریت سے مشابہ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ سرمایہ داروں کی پیدا کی ہوئی بھی ہرگز نہیں ہیں اگرچہ یہ درست ہے کہ ان تحریکوں کے وجود میں آنے کے بعد سرمایہ داران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ان کی فلسفیانہ بنیاد بالکل مختلف ہے۔

فاشستی کہتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کی مخفی قوتیں جماعتوں کے درمیان جنگ کا سبب ہیں اس لیے فاشزم کا مقصد ان دونوں عناصر کو اس طرح قابو میں لاکر کہ وہ جماعتوں کی باہمی جنگ کا سبب نہ بن سکیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا ہے چنانچہ فاشستی ریاست کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں :-

۱- مصالحت یعنی فرد اور ریاست کی ایک دوسرے سے موافقت۔

۲- ادغام یعنی ریاست کی زندگی میں فرد کا شامل اور مدغم ہو جانا۔

۳- اتحادِ کلی یعنی فرد اور ریاست کا متحد ہو کر ایک ہو جانا۔

مناسب اداروں کو قائم کر کے ان اصولوں کو عمل میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اطالیہ میں ان اداروں کو مجموعی حیثیت سے ریاست کی ہیئت اجتماعیہ کہتے ہیں۔

فاشستی عقیدہ میں خاص زور تمام تر فرد اور ریاست کے باہمی تعلق پر دیا جاتا ہے جو ایک نئی بات ہے ایک مرتبہ مسولینی نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "فاشزم کیا ہے" کہا "اس زمانہ میں فاشزم ایک انجمنی تحریک ہے جو قوم کی تمام بار آور قوتوں کو اپنے قانون اور خیالات کا مطیع بنا کر اپنے ساتھ لے لیتی ہے یہ ایک سیاسی تحریک ہے جس کے حامی اور پیرو لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور اپنے سیاسی عقیدہ کے پکے اور سخت فرض شناس ہیں۔ یہ ایک فوجی تحریک ہے جس میں ایسے سیاہ پوشوں کا ایک کثیر لشکر شامل ہے جن کے دلوں میں وطن کی پرستش ایک مذہبی جذبہ کی مانند موجزن ہے صحیح معنوں میں فاشستی وہ ہے

جو خاموش، جفاکش اور اطاعت شعار ہو ہر فاشستی سے یہ عہد لیا جاتا ہے: "میں خدا اور اطالیہ کی قسم کھا کر عہد کرتا ہوں کہ بلا چون وچرا ڈیوچے (قائد) کے احکام کی تعمیل کروں گا اور فاشستی انقلاب کی تحریک میں اپنی تمام قوت کے ساتھ شرکت کروں گا اور ضرورت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کر دوں گا اس میں اختلاف کے لیے کوئی پہلو نہیں چھوڑا گیا۔

فاشستی عقیدہ میں فرد ریاست کا بالکل محکوم ہے اس عقیدہ کے مطابق ریاست مختارِ کل ہے جو شہریوں کے انفرادی عمل اور ذاتی مفاد کو قوم کے مفاد کا تابع رکھتی ہے۔ فرد کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ علیحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ از روئے اقتضا اور از روئے فطرت جماعت کا ایک رکن ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو عام قومی مفاد سے ملا دے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سماج کے نظام کو اس طرح ترتیب دے کہ انفرادی مفاد کے حصول کی کوشش جہاں تک ممکن ہو سکے عام قومی مفاد کے مطابق رہے۔ اس طرح انفرادی آسودہ حالی کی ترقی کو بالواسطہ ریاست کا مقصد سمجھا جا سکتا ہے لیکن کسی فرد کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی آسودہ حالی حاصل کرنے کی اس طرح کوشش کرے کہ وہ مفادِ عامہ کے مخالف اور منافی ہو۔

اس لیے اگر فاشستی اصول قبول کر لیا جائے تو اصول عدم مداخلت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک مختارِ کل استبدادی ڈکٹیٹر شپ (آمریت) کا قیام لازم آتا ہے جو خود مختارانہ فیصلہ کن اقدام عمل کے ذریعہ اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور جس کی بنیاد مجلس مقننہ کی قوت پر نہیں بلکہ درحقیقت جماعت عاملہ کے اقتدار پر ہو۔

فاشسزم کی اصل | فاشزم کوئی بالکل نیا مسلک نہیں ہے مختلف زمانوں میں اس کے داعی ہوئے ہیں مثلاً میکیاولی جس کا اصول تھا کہ قہر و غلبہ رکھنے والا آدمی ہی مطلق العنان حاکم ہونا چاہیے ٹریٹشکے کا عقیدہ تھا کہ قوت اور تسلط رکھنے والی ہستیاں ہی تاریخ بناتی ہیں۔ کارلائل کا قول تھا کہ عوام کو رہنمائی کے لیے ایک قائد کی ضرورت ہے جو ان کے نزدیک قابل مدح ہو نیٹشے قوت و طاقت کو خود ایک مقصود سمجھتے ہوئے اس کا مداح تھا۔

اصولاً بھی فاشزم کا مقصد اُن معاشرتی اور سیاسی اصولوں کی تجدید کرنا ہے جو انفرادیت کی کامیابی سے پہلے (جو نشاۃ ثانیہ کے فلسفیانہ تفکر کا نتیجہ ہے) مہذب دنیا میں کارفرما تھے۔ یہ قدیم اصول اصلاً دو بتائے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ انسان مدنی الطبع ہے اور سماجی زندگی اس کی فطری حالت ہے دوسرے یہ کہ چونکہ تحکم ہی ایک ایسا عنصر ہے جو مستقل طور پر سماج کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے لہذا ریاست کے متعلق صحیح نظریہ یہ ہے کہ اس کی تنظیم تحکم پر مبنی ہو۔ فاشستی بیان کے مطابق نشاۃ ثانیہ نے ان اصولوں کو مٹا کر انسان کو انفرادیت پسند اور تمام کائنات کا مرکز بنا دیا۔ ریفارمیشن یعنی تجدید مسیحیت کے اصلاحی انقلاب نے ہر فرد کو خدا اور فیضان حاصل کر سکنے کا یقین دلا دیا۔ اس کے بعد انقلاب فرانس نے آکر تمام افراد کی مساوات کا اعلان کر دیا اور ان تمام تحریکوں نے قدیم پیشہ ور انجمنوں کو مٹانے میں مدد دی اور اہل حرفہ کی جماعتوں کی تشکیل نہ ہونے دی۔ ان تحریکوں نے فرد اور ریاست کے درمیان متوسط تنظیمات کی ضرورت تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

ان خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیابی حکومت وجود میں آگئی جس کی بنیاد افراد کے حق رائے دہندگی اور اس عقیدہ پر تھی کہ ریاست کا کاروبار افراد اور افراد کی جماعتوں کے درمیان مسلسل مطابقت اور مصالحت سے انجام پایا کرے۔ ان میں سے ہر فرد کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اُسے اس کی موج کے مطابق آزادانہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا فطری حق حاصل ہے اس نئے تخیل کا خلاصہ یہ تھا کہ فرد کو محض اپنی ذاتی خواہشوں کے متعلق اپنی فلاح و بہبود کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سبب سے سماج کا شیرازہ بکھرنے لگا اور جماعتوں میں خوفناک باہمی تصادم شروع ہوا اور قومی تنظیم میں کمزوری نمودار ہوئی۔ یہ امر کہ کچھ مغربی طاقتیں مثلاً انگلستان، فرانس اور امریکہ ان حالات کے باوجود اپنی قوت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئیں دوسرے اسباب پر مبنی ہے مثلاً صنعت و حرفت کے میدان میں ان کی سبقت اور خام پیداوار کے وسیع علاقوں پر ان کا قبضہ۔ لیکن نیابی اور پارلیمنٹی ادارے ان ملکوں کو جو دولت اور شہنشاہیت کے میدان میں کسی قدر دیر میں داخل ہوئے ہیں کوئی ممکن امداد نہیں دے سکے بلکہ برخلاف اس کے وہ ان کی ترقی میں

سدراہ ثابت ہوئے۔ اس لیے فاشستی عقیدہ اس امر پر زور دیتا ہو کہ ریاست کو وہ قدیم ہیئت اجتماعی اور استحکام پھر حاصل ہو جائے جسے آزادانہ طرز عمل رفتہ رفتہ مٹانا چاہتا تھا۔

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فاشزم کوئی نئی اختراع نہیں ہو بلکہ ایک طرز خیال ہی جو ایک نظام یا سلسلہ کو اس مقصد کی روشنی میں جس کے لیے وہ وجود میں آیا ہو جانچنے کا ایک حقیقی طریقہ ہو جس کی بنیاد اس اعتقاد پر ہو کہ تمام نظام مجموعی حیثیت سے اپنے مقصود کی طرف حرکت کرتا ہو یہ نہیں کہ اس کے اجزا اپنے اپنے مفاد کے لیے عمل کرتے ہوں یہ نظریہ یقیناً حقیقی نظریہ ہو اور یورپ کے فلسفیانہ تفکر کے ارتقا میں اس کے وجود کا اکثر ثبوت ملتا ہو صنعت وحرفت کی اشتراکی تنظیم کی تحریک ایک معنے میں فاشستی ہو۔

بعض ممالک میں یہ کیفیت بہ نسبت دوسرے مقامات کے زیادہ نمایاں ہو ایک حد تک تاریخی اسباب کی بنا پر مثلاً قریبی زمانہ تک فیض رساں استبداد کے رواج کے باعث اور ایک حد تک اس بنا پر کہ لوگوں کے دماغ کی نفسیاتی ساخت ایک خاص طرح کی تھی مشرقی یورپ کی تمام نہاد پست اقوام میں جہاں حکومت خود اختیاری اور پارلیمنٹی آئین کی روایات محدود رہی ہیں یہ طرز خیال زیادہ معقول سمجھا گیا ہو اس مقام پر مسٹر ایچ اے ای. گوڈ کے بیان سے اتفاق کرنا پڑتا ہو کہ اگر یورپ میں جنگ نہ ہوتی اور کوئی بالشوکی انقلاب نہ ہوا ہوتا تو بھی فاشستی تحریک جلد یا دیر میں اطالیہ میں پیدا ہوتی اگرچہ یہ ضرور ہو کہ کم مقبول کم ہنگامہ خیز اور کم تباہ کن ہوتی اس لیے کہ اسے متخالف خیالات سے جنگ نہ کرنی پڑتی۔

جنگ عظیم نے یقیناً بات کو بڑھا دیا حریت پسندانہ طرز حکومت کی ناکامیابی اور دنیا کی حقیقی فطرت کا یوں ظاہر ہونا گویا وہ اقتصادی شہنشاہیت اور محارب قومیت کے رقیبانہ اور برسرپیکار عناصر کا مجموعہ ہو یہ تمام باتیں اس کا باعث ہوئیں کہ رائے عامہ ایک طاقتور عاملہ کی حمایت کرنے لگی جو قوموں کو اقتصادی تباہی سے بچانے اور نسبتاً کمزور ملکوں کی نعمتمندی اور آسودہ حالی کی شاہراہ پر رہنمائی کرنے کے قابل ہو نتیجہ یہ ہوا کہ فاشستی عقیدہ یورپ میں ایک زبردست عملی قوت بن کر

دفعتاً منظر عام پر آگیا۔

فاشزم کی چند کامیابیاں | دس برس سے بھی کم عرصہ میں فاشزم نے دو امتیازی نتیجے حاصل کیے ہیں

۱: اطالیہ اور جرمنی دونوں ملکوں میں فاشزم نے لوگوں کے دلوں میں امید اور یقین کا وہ جذبہ پھر زندہ کر دیا جسے وہ جنگ عظیم کے دوران میں کھو بیٹھے تھے اس عقیدہ نے لوگوں میں خودداری اور خودی کے احساس کو بیدار کر دیا انھیں ایک نئی قوت ارادی اور نیا ضمیر عطا کیا جس کا ایک نئے انداز سے مظاہرہ ہوا۔ اس عقیدہ کے آئین میں حقیقتاً ایک جلال اور ہیبت موجود ہے جو قوم کو وہ فتح حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے جس کی وہ قوم داخلی تنظیم اور بین الاقوامی وقار حاصل کرنے کے لیے ضرورت مند ہے یہ نتیجہ حاصل کرکے فاشزم نے یقیناً جمہور کے وطن پرستی اور فرض شناسی کے جذبوں کو بیدار کیا ہے وطن پرستی کا جذبہ ایک خاص ساحرانہ تاثیر رکھتا ہے جو ایک قوم کے تمام وجود میں سرایت کر جاتا ہے اور جس کی جوش آفرینی سے زبردست قربانیاں ہو سکتی ہیں۔ فاشزم نے اس عقیدہ پر بہت زور دیا ہے کہ قوم کی عظمت قایم کرنے میں حصہ لینا۔ اس کے قایم رکھنے میں عملی جد وجہد کرنا اور قوت کے مقابلہ میں اس کا تحفظ کرنا قومی ضرورت بھی ہے اور قومی فرض بھی۔ اس عقیدہ کے پروپیگنڈے سے بہ نسبت اطالیہ کے جرمنی میں زیادہ جوش پیدا ہوا اس لیے کہ جرمنی کی قومی اشتراکیت یعنی نازیت نے قوم کے تصور کو اطالوی فاشزم سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے۔ اطالوی فاشزم قومیت کو ریاست میں بالکل جذب کرنا چاہتا ہے۔ فاشستی ریاست قومیت کا اولین اظہار ہے لیکن جرمن نازیت ریاست کو قوم کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت دیتی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا جوش عارضی اور مصنوعی ہے اور انجام کار قابل نفرت اس لیے کہ وہ محض جنگ و جدل کی طرف رہبری کرتا ہے نیز یہ کہ وہ قطعی طور پر نتیجہ خیز اور فیصلہ کن ہیں لیکن یہ اعتراض ایسا ہے جو پورے فاشستی عقیدے پر وارد ہوتا ہے۔

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ فاشزم کا پہلا اثر جرمن اور اطالوی قوم کی ذہنیت میں ایک بڑے ملاقی اور روحانی تغیر کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور چونکہ یہ تغیر اس یاس اور شکست کے جذبہ کے بعد پیدا ہوا جو جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں پر طاری ہو گیا تھا اس لیے اسے اچھا سمجھا گیا۔

یہ جوش جو جنگ عظیم کے فوراً بعد پیدا ہوا، اگر مناسب و صحیح طریقہ پر عمل کرتا تو ممکن تھا کہ ان غریب ممالک کی ترقی اور تنظیم کا قوی ترین سبب ثابت ہوتا۔

(۴) فاشزم نے اطالیہ اور جرمنی دونوں ملکوں میں سیاسی اداروں کے ایسے سلسلے ناقص طریقہ ہی پر سہی، قایم کرنے کی کوشش کی ہے جو ریاست اور فرد کے باہمی ربط کے متعلق اس عقیدہ کے نئے خیالات کو عملی صورت دے سکیں۔ اس عقیدہ نے قومی پیداوار اور قوم کی دو بڑی حقیقی ہستیوں میں مطابقت پیدا کرنے اور تمام جماعتی مفادات کو ترک کر کے اپنے شہریوں کی زندگی میں قومی اصول کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ قومی پیداوار حتی المقدور انتہائی ترقی حاصل کرے۔

اطالیہ میں ریاست کی معاشی ہیئت اجتماعیہ اس اصول پر قایم کی گئی ہے کہ مزدور اور آجر کے باہمی تعلقات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ جہاں اب تک یہ دونوں محض ایک معاشرتی جدوجہد میں شامل تھے۔ اب ایک حد تک ریاست کے خادم بن جائیں۔ یہ مقصد ایسی انجمنوں کے قیام سے حاصل کیا گیا ہے جن کے نظام میں مزدوروں کو اتنی ہی قوی اور ناطق رائے حاصل ہے جتنی آجروں کو۔ انجمنوں کے نظام میں تیرہ شاخیں شامل ہیں اور اسی انجمنی نظام سے مجلس مقننہ منتخب کی جاتی ہے بڑی انجمنوں سے ایک ہزار نمایندے منتخب کیے جاتے ہیں جن میں سے فاشستی مجلس عالیہ (فاشسٹ گرانڈ کاؤنسل) چار سو کا انتخاب کرتی ہے اور آخر میں عام رائے دہندگی کے ذریعہ سے ان ہی کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ پس ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی اور مجلس مقننہ ان تیرہ انجمنوں سے مرکب ہے خود وہ فریق جن کا سرمایہ داروں اور مزدوروں سے تعلق ہے ان کے درمیان ہم آہنگی قایم کرتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ صرف اصولی طور پر یہ اسکیم عمدہ طریق پر ترتیب دی گئی ہے۔

جرمنی میں معاشی نگرانی کی اسکیم اطالیہ سے مختلف ہے جماعتی تنظیمات قایم کرنے کے بجائے نازیوں نے معاشی طریق عمل معین کرنے کا تمام تر اختیار مرکزی سیاسی حکام کو دے دیا ہے اور نفاذ کے لیے سرکاری دفاتر کا ایک مکمل نظام قایم کر دیا ہے اس مرکزی سیاسی ادارے کا یہ کام ہے کہ زراعت کے کاروبار

کو ایک خاص طریقہ پر ترتیب دے سے مزدوروں کی تنظیم بھی مقررہ اصولوں پر کرے اور صنعت و حرفت میں ہم آہنگی اور ہم آہنگی و موافقت پیدا کرے حکومت کے اس انتظام سے دو نتیجے حاصل ہیں۔

اول یہ کہ جماعتوں کے باہمی تصادم کی قوت کم از کم ظاہری طور پر گھٹ گئی ہے اور اب اس تصادم کی وہ کیفیت نہیں ہے جو عام طور پر حریت پسند ریاست میں نظر آتی ہے اور جس حد تک اتحاد کی محض ظاہری صورت حقیقی تصادم کو کم کرنے میں ہو سکتی ہے یہ طریقہ مفید ثابت ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ اقتصادی پالیسی پر حکومت کا تصرف ہو جانے کی وجہ سے امن و امان کے زمانہ میں بھی وہ اقتصادی تنظیم رائج کی جا سکتی ہے جس کی دوران جنگ میں ضرورت پڑتی ہے اور جب تک بین الاقوامی مطالبوں کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوتا رہے گا اس انتظام سے نمایاں فائدے حاصل ہوں گے

<u>فاشزم پر اعتراضات اور تنقید</u> | فاشستی ریاست کے اصول اور تنظیم پر تین خاص اعتراض وارد ہوتے ہیں

(۱) سب سے پہلا اور سخت اعتراض جو فاشستی ریاست پر کیا جا سکتا ہے وہ مطلق العنان قیادت کے اصول پر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پارلیمنٹی ملکوں مثلاً انگلستان اور فرانس میں بھی اس زمانہ میں ایک نمایاں رجحان اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ قوت و اختیار تمام تر ایک فردِ واحد یا حکومت کی مختصر چیدہ سری جماعت کے قبضہ میں آجائے لیکن فاشزم جس قیادت کا حامی ہے وہ اپنی ماہیت میں اس سے بالکل مختلف ہے اس لیے کہ یہ ایک مختلف نظریہ کا نتیجہ ہے۔ پارلیمنٹی ملکوں میں ایسی طاقت جب پیدا ہوتی بھی ہے تو اس مسلمہ پر ہوتی ہے کہ قوت و اختیار کا آخری ماخذ خود قوم ہے لیکن قیادت کے فاشستی اصول کے مطابق افراد حکومت کے قابل نہیں اور صرف محکوم ہو کر رہ سکتے ہیں۔ فاشستی عقیدہ کے مطابق مرکزی تسلط سماج کی ایک لازمی حالت ہے اور اس لیے قائد کے احکام کی جو قوت و اختیار کا مطلق مالک ہے فوری اور غیر محدود اطاعت تمام فاشستیوں کے فریضۂ زندگی کا لازمی جزو ہے اس طرح فاشستی عقیدہ نے قائد کی قوت و اختیار کو صرف ایک ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ ایک مقصد کے درجہ تک بلند کر دیا ہے۔ فاشستی کے نزدیک ایسی قوت و اختیار کا ماخذ جماعت نہیں ہے اور اس لیے جماعت کو اس کے برطرف کرنے کا بھی کوئی حق نہیں۔

گزشتہ زمانہ میں بھی اکثر مطلق العنان شخصی حکومت استبدادیت اور ڈکٹیٹرشپ قایم ہوئی ہے اوّل اوّل یہ مطلق العنان حکومتیں مذہبی بنیاد پر قایم ہوتی تھیں یعنی اس عقیدہ کی بنا پر کہ دنیوی فرمانروا کو حکومت کا حق خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ میکیاولی کے زمانہ سے جس نے موروثی مطلق العنان فرمانروائی کے اصول کی تعلیم دی اس قسم کی حکومتوں نے مذہبی نہیں بلکہ دنیوی حیثیت حاصل کر لی لیکن یہ حکومتیں ہمیشہ تغیر و تبدل کے زمانہ میں قایم ہوئیں اور ایسے انتشار کے دنوں میں وجود میں آئیں جب قایم شدہ حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا ہو یا وہ کمزور ہوگئی ہوں تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک اس قسم کی حکومتیں کسی ملک میں بھی مستقل طور پر قایم نہیں رہ سکی ہیں۔ ان قدیم استبدادی حکومتوں اور موجودہ فاسستی اور نازی قیادت کے درمیان بہت کم فرق ہے جسے فاسستیوں نے بہت بڑھا چڑھا کر دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن جو درحقیقت محض طریق عمل کا فرق ہے فیض رساں مستبد فرمانرواؤں کی موروثی ڈکٹیٹرشپ (آمریت) میں خود ریاست ہوں کے اصول پر مبنی تھی اس دور کی ڈکٹیٹرشپ کی بنیاد ریاست کی خدمت کے اصول پر رکھی گئی ہے اس فرق کا سبب بڑی حد تک موجودہ زندگی کی پیچیدگی اور موجودہ حکومت کی نئی شکل ہے لیکن صرف اس فرق کی بنا پر استبدادی فرمانروائی پر جو اعتراضات ہیں وہ اٹھارویں صدی کی فیض رساں استبدادیت کی بہ نسبت موجودہ دور کی آمریت پر زیادہ قوت سے وارد ہوتے ہیں۔

و۔ پہلا اعتراض فاسستی آمریت پر یہ ہے کہ عمدہ قیادت کے بعد اس سلسلہ کا اس عمدگی اور کامیابی سے جاری رہنا بہت مشکل ہے۔ قایدکا جانشین مقرر کرنے کے لیے کوئی واقعی کامیاب طریقہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ پیدایشی جانشینی کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ضعیف العقل ہیچ کارہ شخص قیادت کا مالک بن جائے انتخاب کے ذریعہ جانشینی کا نتیجہ مسلسل تصادم ہوگا اور اس صورت میں زیادہ امکان یہ ہے کہ ایک شورہ پشت مقرر یا بازاری لیڈر موقع پاکر قاید نہ بن بیٹھے۔

ب۔ غرض کسی حالت میں اس دائمی الجھن سے بچاؤ کی صورت یا پھر اس اطمینان قلب کا حاصل ہونا جس کو قایم کرنے کا آمریت دعویٰ کرتی ہے یقینی نہیں فاشزم کی حمایت میں ایک دلیل یہ ہے کہ وہ معمولی

دماغ کے فرد کو اس الجھن میں پڑنے سے بچاتا ہے کہ مخالف سیاسی فریقوں اور مسلکوں میں کس کی طرفداری کرے اور یہ دائمی کشاکش جمہوری نظام کا لازمہ ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بابرکت اطمینان و فراغ مستقل نہیں ہو سکتا۔ جوں ہی قیادت کا جادو ختم ہوتا ہے اور اس کے وعدے پورے ہوتے نظر نہیں آتے بلکہ ناقابل ایفا معلوم ہوتے ہیں تو فیصلہ کی ذمہ داری دوبارہ فرد کی گردن پر پڑتی ہے۔

ج۔ دوسرا زبردست اعتراض فاشزم پر یہ ہے کہ ممکن ہے ڈکٹیٹر (آمر) غلط اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرے گزشتہ دس برس اطالیہ کی فاسستی آمریت اور گزشتہ چھ سال میں جرمنی کی نازی آمریت کی تاریخ اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ بہر حال لارڈ ایکٹن کا مشہور قول کچھ نہ کچھ صداقت ضرور رکھتا ہے کہ "ہر طاقت بدعمل ہو جاتی ہے پورے طور پر آزاد طاقت پورے طور پر بدعملی کا باعث ہوتی ہے"۔ ہٹلر کی سامیت دشمنی کا طریق عمل اور نسل کی پاکیزگی کا اصول ڈکٹیٹر کا ذاتی وہم نہیں تو کیا ہے۔

د۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی آمر اس قدر فوق البشر شخصیت نہیں ہو سکتا جتنا کہ فاشستی عقیدہ اُسے فرض کرتا ہے۔ فاشزم قائد کے احکام کی بلا تامل اور بغیر چون و چرا کے تعمیل کرنے کی تعلیم دیتا ہے جس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ ڈیوچ یا فیوہرر حقیقتاً سب انسانوں سے زیادہ ایسی قوتوں کا مالک ہے جن کے ذریعہ سے وہ قوم کے بہترین مفاد کا علم رکھتا ہے اور اس کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہے اور کسی خاص جماعت یا طبقہ کے مفاد کے بجائے مفاد عامہ کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ڈکٹیٹروں کا جو اپنی جماعت یا طبقہ کی جنبداری اور حمایت سے بالاتر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں یکے بعد دیگرے مسلسل پیدا ہونا اگر بالکل ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔

- دوسرا اعتراض یہ ہے کہ فاشستی ریاست کا حقیقی طرز حکومت فاشستی عقیدہ کی کمزوری ظاہر کرتا ہے جرمنی اور اطالیہ دونوں ملکوں میں حکومت کرنے والی جماعت بڑے بڑے سرمایہ داروں پر مشتمل ہے اور ان کے زیر ہدایت عمل کرتی ہے درحقیقت فاشستی مختار کل ریاست سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ بن گئی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ یہ صورت حال اس نظام کے عمل درآمد کا نتیجہ ہے اور فاشستی اصول سے اسے کوئی تعلق نہیں اس حقیقت سے ملتا ہے کہ فاشستی ریاست نے عام متوسط طبقہ کے

مفاد کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ صنعت و حرفت کے بڑے بڑے مالکوں اور باقی افراد کے درمیان امتیاز برتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے پاس بہ نسبت چھوٹے سرمایہ داروں کے حکومت کے حکام پر اثر ڈالنے کے لیے بہتر سہولتیں اور وسیع تر ذرائع موجود رہتے ہیں۔

تاہم یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ فاشزم ترقی کر کے آج ایک قسم کی اجارہ دارانہ سرمایہ داری بن گیا ہے مزدور اور سرمایہ داری کے درمیان صحیح توازن کے متعلق فاشزم کا معاشرتی تصور سرمایہ داروں کے جذباتی ردعمل اور تخیل سے قریبی طور پر مربوط رہا ہے۔ ریاست کی ہیئت اجتماعیہ کا فاشسٹی اصول جس کی بنیاد تمام معاشی جماعتوں کے مساویانہ انضباط پر ہے عملاً سرمایہ داروں کے حق میں استعمال کیا گیا ہے مزدوروں کی انجمنوں کے مٹانے اور ان کی تنظیم کو ممنوع قرار دینے کے ساتھ ساتھ مملکت نے پیداوار اور اس کی تقسیم پر وہ تصرف نہیں رکھا جس کے ذریعہ پیدایش کے ذرایع کے مالک فیصلے کی آزادی اور منافع سے محروم ہو جاتے ہیں ساہوکاروں، کارخانہ داروں اور زمیندار ؛ دولتمندوں کی برابر وہی معاشی اور معاشرتی حیثیت قایم ہے لیکن مزدور طبقہ کو پورے طور سے مغلوب کر لیا گیا ہے۔

سرمایہ داری کا ظاہر ہونا اور مستقل اقتدار پانا حریت پسند جمہوریت کی ایک امتیازی خصوصیت ہے لیکن وہاں کم از کم دونوں طرف عمل کی آزادی ہے۔ ایک حریت پسندانہ جمہوری ریاست میں مزدور یا متوسط طبقہ کم از کم اپنی سیاسی قوت عمل کو استعمال کر سکتا ہے۔ ان کے ووٹ کی کچھ نہ کچھ طاقت ضرور ہے جب ان کے باہمی مفاد ایک ہی ہوں تو وہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے ایک خود پرست چند سری مختار کل ریاست میں جہاں ووٹ کا کوئی وجود اور کوئی وقعت نہیں سرمایہ داروں کے زبردست اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے پُرامن طریقے موجود نہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فاشزم نے محض یہ ممکن کر دکھایا کہ سرمایہ دار طبقہ جب ایک دفعہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو اس کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ اپنے اس تسلط کے ذریعہ جو اسے حکومت کے منصب داروں پر حاصل ہے اپنے حقوق مستقل طور پر قایم کرے۔

فاشستی فلسفہ پر ایک تیسرا اعتراض اور ہے جس کا فاشزم کے پاس کوئی جواب نہیں اور وہ یہ ہے کہ فاشستی عقیدہ ملکی تنظیم کے ایک اصول کی حیثیت سے بالکل بے نتیجہ اور غیر فیصلہ کن ہے یہ کوئی خاص مقصد یا علت غائی ظاہر نہیں کرتا۔ فاشستی استدلال میں ایک عجیب چکر ہے جس کے باہر نہیں نکل سکتے فاشستی نظریہ کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ قومی زندگی کے مختلف عناصر میں اتحاد، اتفاق اور استحکام پیدا ہو لیکن اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس امتزاج اور اتحاد کی غرض کیا ہے؟ جواب یہ ملتا ہے کہ اس کا مقصد قومی طاقت ہے لیکن پھر اس قومی طاقت کا کیا مقصد ہے؟ دراصل اتحاد اور طاقت کے علاوہ مسلک فاشستی میں انفرادی آسودہ حالی کے لیے کسی دوسرے تصور کی گنجایش ہی نہیں۔ فاشستی اپنے فلسفہ کے نقص کو یہ کہکر دور کرنا چاہتے ہیں کہ فرد اپنی شخصیت کو بہترین طور پر ریاست ہی کے وجود کی بدولت قایم کر سکتا ہے اور ریاست کے باہر اس کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا ریاست کو جس قدر اقتدار حاصل ہوگا اسی قدر فرد کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ نظریہ اصولاً بالکل ناقص ہے۔ قومی عظمت پر فخر کا جذبہ بیشک فرد کی آسودہ حالی کا ایک اہم جزو ہے لیکن صرف یہی سب کچھ نہیں ہے۔ یہ بات قطعاً سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک غریب فاقہ کش مزدور جو اپنا معاملہ خود طے کرنے کی آزادی کو خواہ وہ کتنی ہی کم قیمت رکھتی ہو بغیر کسی منفعت بخش معاوضہ کے پامال پاکر صرف اپنے ملک کی طاقت کے خیال پر کس طرح حقیقی خوشی اور آسودہ حالی محسوس کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کا سیاسی فلسفہ بالکل غیر اطمینان بخش، غیر معقول اور ناقابل تسلیم ہے۔

حقیقتاً فاشزم میں ملک داری کا قطعاً کوئی فلسفہ نہیں یہ دراصل حصول قوت کا ایک فن ہے سیاسی تخیل کے ایک طرز کی حیثیت سے اس کا تعلق محض عملی سیاست کے فن سے ہے یہ عقیدہ ریاست کی علت غائی اور اس حقیقت پر کہ اس کے وجود کا مقصد انسان کی آسودہ حالی، آزادی یا مساوات ہے قطعاً غور نہیں کرتا اس کا مقصد محض یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بین الاقوامی تصادم میں ایک خاص جماعت کو عملی اقتدار اور عروج حاصل ہو جائے۔ اس لیے مسلک فاشستی تصادم کے دوران میں ایک ذریعہ یا طریق عمل کی حیثیت سے شاید اس سے موزوں طریقہ ثابت ہو جو ایک حریت پسند ریاست اختیار کر سکتی

ہو اس لیے کہ یہ مسلک تشدد کا قایل ہو لیکن انجام کار ایک ایسا طریق کار ہو جو سیاسی ذمہ داری کی علت غائی سے کوسوں دور ہو۔

فاشستی مختار کل ریاست کا مستقبل

فاشستی استبدادی ریاست اس کوشش کی مظہر ہو کہ قوم تمام سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور معاشی قوتیں منظم ہو ایک واحد ہیئت اجتماعیہ کی صورت اختیار کرلیں جسے ریاست کہا جاسے۔ اس ریاست کی بنیاد اس عزم پر ہو کہ اس اجتماعی قوت ارادی کی پھر تعمیر کی جائے جسے حریت پسندی کا سیاسی اور معاشی تصادم فنا کر رہا تھا اسی سبب سے شہریوں کے تمام قومی اور ذاتی اعمال ایک قاید کی مطلق العنان استبداد کے مطیع بنا دیے گئے ہیں۔ قوم پر اس کو وہی تحکم حاصل ہو جو سالار اعظم کو اپنے لشکر پر حاصل ہوتا ہو۔ ریاست کے شہری سب کے سب سپاہی شہری ہیں اور قومی مقصود حاصل کرنے کے لیے قاید کے ہاتھوں میں ایک آلہ کا کام دیتے ہیں۔

لیکن ریاست کا یہ قوی اور موثر تصور جو اسے سیاسی سپاہیوں کا ایک تیز رفتار لشکر فرض کرتا ہو اس کا مقتضی ہو کہ اس کے پیش نظر ہمیشہ ایک ایسا مقصود ہو جس کی طرف قاید اپنے اس لشکر کی رہنمائی کرے اس لیے کہ جب تک کوی مقصود نہ ہوگا اس لشکر میں ہم آہنگی اور رضامندی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اطالیہ کی فاشستی جماعت اور جرمنی کی نازی جماعت اس اصطلاح کے قدیم حریت پسندانہ مفہوم کے لحاظ سے جماعتیں نہیں ہیں۔ رضامندی کے علاوہ ان کی شیرازہ بندی قہر و غلبہ کے موثر آلہ سے ہوی ہو۔ ان جماعتوں کی تشکیل میں قہر و غلبہ کا عنصر ہر شخص کو صاف نظر آتا ہو لیکن پھر بھی اس کے تحت اتفاق رائے کا ایک حقیقی عنصر بھی موجود ہو جس پر اتنی توجہ نہیں کی گئی جتنی کہ ہونی چاہیے کسی سیاسی تحریک کا وجود میں آنا ممکن نہیں جب تک وہ ایک حد تک اتفاق رائے حاصل نہ کرے۔

اب تک فاشستی لائحہ عمل کو حقیقتاً جنگ کے بعد کے جوش کی بدولت اتفاق رائے حاصل رہا ہو۔ فاشزم نے اب تک اشتراکیوں اور اشتمالیوں کے غیر وطن پرست اور انقلابی اثر کے خلاف وطن پرستی کے رد عمل سے فایدہ اٹھایا لیکن ایک منفی جذبہ ایک نظام حکومت کی مستقل بنیاد نہیں بن سکتا ہٹلر اور مسولینی کے پاس اطالوی اور جرمن قوم کے سامنے پیش کرنے کے لیے کونسا قطعی اور معین مقصود ہو

جس کے ذریعہ وہ انھیں ایک مختار کل ریاست کے ماتحت متحد کر سکیں۔ یہ صحیح ہو کہ تشدد طویل مدتوں تک فرمانرداؤں کا اقتدار برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا ہو لیکن یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تشدد کبھی مستحکم اور مستقل نظام حکومت کا ممتاز عنصر بن سکتا ہو۔

فاشزم کے چند سالہ فاتحانہ دور کی کامیابی پر نظر ڈالتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مختصر سی معاشی تنظیم کے علاوہ فاشستی آمریت ان معاشرتی مسائل میں سے جو سیاسی پیچیدگی کا سبب ہوئے ہیں کسی ایک کو بھی حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ فاشستی آمریت نے اقتصادی تباہی کے چند بدترین نتائج مثلاً بیروزگاری اور زرعی افلاس کا تدارک ضرور کیا ہو لیکن ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو ذرایع استعمال کیے اُن سے نئی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ دوسرے یہ کہ بنیادی معاشرتی مسئلہ جس سے مراد نئے طریقہ سے دولت تقسیم کرنے کا مسئلہ ہو اپنی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ جرمنی اور اطالیہ دونوں ملکوں میں برابر موجود ہو۔ فاشزم اب تک معاشرتی اور اقتصادی کشمکش اور ہنگامہ آرائی دور نہ کر سکا ہو۔ اس نے محض اُس وسائل اور ذرائع کو بدل دیا ہو جن کی بدولت مختلف معاشی اور معاشرتی جماعتوں میں کھینچ تان جاری تھی اور جن کے ذریعہ معاشرتی اور معاشی مخالفت اور تصادم کو دور کر سکتے ہیں۔ اس پرانے طریق کار کے بجائے جس میں سیاسی انتخابات، پارلیمنٹی مباحثوں اور معاملات کے ذریعہ اس قسم کے قضیوں کو نبٹاتے تھے فاشزم نے ایک نیا طریقہ قایم کر دیا ہو جس کے ذریعہ قاید تمام معاشرتی جماعتوں کے درمیان ایک ثالث یا پنچ کی حیثیت سے فیصلے کرتا ہو۔ حکومت معاشی معاملات کے متعلق احکام جاری کرتی ہو جن کی پابندی کارخانہ داروں پر اسی طرح عاید ہوتی ہو جس طرح مزدوروں اور کاشتکاروں پر۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ حکومت کس کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاشرتی جھگڑوں کو چکاتی ہو نیز یہ کہ لفظ قوم کے کیا معنی ہیں۔ یہ سوالات ہیں جن کا اب تک کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں ملا ہو۔ اس صورت میں یہ واضح ہو کہ فاشستی ریاست خود بخود چلنے والی اور ناقابل تغیر نہیں ہو اور اس کے مستقل طور پر قایم رہنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

مترجمہ وزیر الحسن عابدی ایم۔ اے۔ ڈاکٹر بول چند ایم اے۔ پی، ایچ، ڈی (لندن)

فرائیڈ اور اس کا فلسفہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

"خواب"

زمانہ قدیم سے خواب کو اہمیت حاصل ہے اور لوگ اس کی اہمیت اور ماہیت دریافت کرنے میں کوشاں رہے ہیں بعض لوگ متعجب ہو کر سوچتے ہیں کہ کیا خواب میں کوئی حقیقت بھی ہو سکتی ہے؟ یہ انمل بے جوڑ باتیں جو ہم خواب میں دیکھتے ہیں کیا یہ بے معنی ہیں؟ ان کا محدود سطحی دماغ اس قسم کے سوال کرکے اور کوئی حل نہ پاکے تھک جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ اس خیال ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں باوجود اس شکست خوردہ ذہنیت کے یہ سوال ہر مذہب و ملت کی توجہ کا مرکز رہا۔ چنانچہ ہر مذہب میں کم وبیش خواب کو اہمیت حاصل ہے۔ ہندوؤں میں اس کو مذہبی روایات کے اعتبار سے ایک اہم جزو مانا گیا ہے چنانچہ ان کی مقدس کتاب رامائن میں کئی مقامات پر اس کا تذکرہ ملتا ہے عیسائیوں کے یہاں بھی خواب ایک اہم جزو اور ضروری باب ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یوحنا نیز دیگر حواریوں کے خواب تفصیلاً مذکور ہیں۔ چنانچہ آسمان پر جانے والا خواب تو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے یہودیوں کے یہاں بھی اسے ایک ممتاز اور قابل اعتنا چیز سمجھا جاتا ہے چنانچہ توریت میں فرعون کے خواب اور اس کی تعبیر کا متعدد جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ اسلام میں یوسف علیہ السلام کے خواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ غرضکہ ہر مذہب و ملت میں اس کا ذکر موجود ہے خواب کی یہ اہمیت اور انسان کی اس کی حقیقت جاننے کی ہزارہا سال سے کوشش اس بات کی شاہد ہے کہ خواب میں انسانی فطرت کا کوئی گوہر ضرور پوشیدہ ہے جو کہ باوجود تلاش کے ہاتھ نہیں آتا۔

ہر انسان اپنے ذہنی ارتقاء اور تمدنی ماحول کے زیر اثر ہر سوال کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے زمانہ قدیم میں لوگ توہم پرست اور فطرت پرست تھے وہ ہر اس شے کو جو کہ ان کی فہم کے لیے نارسا ہوتی

ربانیت کا رتبہ دیتے سورج، چاند اور تارے سب دیوتا تھے اس ماحول اور ذہنی ارتقا میں خواب کے سوال کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے خیال میں یہ سب باتیں جن کا ظہور خواب میں ہوتا ہے آسانی میں، منجانب اللہ ہیں، ربوبیت کا مظہر ہیں اور آیندہ ہونے واقعات کی خبر دیتے ہیں وہ اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ اس لیے اس سے آگے نہیں جا سکے۔

تعبیر خواب کے قواعد | جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا انسان کا نقطۂ خیال وسیع تر اور دقیق تر ہوتا گیا خواب کی اہمیت بھی بڑھتی گئی۔ مختلف طریقوں سے اور خیال کے مختلف گوشوں سے اس کی تعبیریں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ کچھ غیر سائنٹفک تعبیر کے قواعد بھی تخلیق ہوتے گئے۔ ان میں سے دو قاعدے زیادہ اہم ہیں جن کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے۔

پہلا قاعدہ خواب کے مافیہ کو ایک شے کلی سمجھنا ہے اور اس کے نعم البدل کو بامعنی اور کسی حد تک ہم معنی مطلب لانے کی کوشش کرتا ہے یہ اشارتی تعبیر خواب ہے۔ مثال کے طور پر انجیل میں حضرت یوسف نے فرعون کے خواب کے معنی نکالے ہیں۔ اسے اشارتی تعبیر خواب کا ایک نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ فرعون نے خواب میں سات گائیں دیکھیں جن کے بعد دبلی پتلی سات گائیں آئیں اور پہلی ساتوں کو نگل گئیں اس کی تعبیریوں کی گئی کہ مصر میں ایسا قحط آئے گا کہ سات سال کے جمع کیے ہوئے اناج بھی اس کی کمی کو پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح سے ذرا ذرا سی تبدیلی سے ایک ہی چیز کے کئی معنی لیے جاتے ہیں۔ کبھی سمندر سے بادشاہ مراد لیا جاتا ہے۔ کبھی رنج و مصیبت اور غیض و غضب وغیرہ اسی طرح سانپ سے کسی دشمن کا مفہوم نکلتا ہے۔ کبھی اس سے درازیٔ عمر، کبھی راز وار۔ غرضکہ معبر کو کچھ تو قواعد کلیہ معلوم ہوتے ہیں اور کچھ قرائن دیکھنا سب سے۔ اس کے بعد بھی اپنی ذہانت اور استعداد ی ملکہ سے رائے قائم کر کے خواب کی تعبیر بیان کرنی پڑتی ہے اس لیے تعبیر خواب ایک ایسا بلند آرٹ ہو کر رہ گیا جس کی تعبیر کے لیے غیر معمولی خصوصیات کا حامل ہونا لازمی ہے۔

دوسرے طریقۂ خواب کو ہم علاماتی طریقہ کے نام سے یاد کرتے ہیں اس قاعدہ کے مطابق خواب میں جو واقعات ہوتے ہیں اس کی بھی چند علامات ہیں۔ مثلاً اگر خواب میں خط دیکھیں اس کا

مطلب پریشانی سے لیا جاتا ہے اگر جائزہ دیکھیں تو مستگی کی پیشین گوئی خیال کی جاتی ہے۔

یہ دونوں قواعد اتنے نامکمل، ناقص اور غیر سائنٹفک ہیں کہ ان پر بحث و تمحیص کرنا بھی بیکار ہے۔

فرائیڈ کا طریقۂ تعبیر خواب | فرائیڈ کو ہسٹریا کے مریضوں سے زیادہ سابقہ پڑنے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ بہت خواب دیکھتے ہیں تو اس کو کچھ دلچسپی سی ہوئی اور ان کی تعبیر کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اس کا طریقۂ تعبیر گزشتہ تمام طریقوں سے نرالا اور سائنٹفک ہے۔

دوسرے قواعد تعبیر میں صحیح تعبیر کا دارومدار معبّر کی علمیت اور ذہانت پر ہوتا ہے لیکن فرائیڈ کے قاعدہ کے مطابق صحیح تعبیر کا دارمدار بہت حد تک خواب دیکھنے والے پر ہوتا ہے کیونکہ اس سے کہا جاتا ہے کہ اپنے خیالات کو ہو بہو جیسے وہ ذہن میں آئیں بیان کرتا چلا جائے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اپنے ہر خیال کو انسان دوسرے شخص پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے اسے آرام دہ حالت میں بٹھا کر اور آنکھیں بند کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس پر اس قسم کی نفسیاتی حالت طاری ہو جائے جو سونے سے پہلے طاری ہوتی ہے جسے خمار کہتے ہیں کیونکہ ایسی حالت میں تنقیدی قوت بہت کمزور ہو جاتی ہے اور ناپسندیدہ خیالات بغیر روک ٹوک کے ابھر آتے ہیں اور اسے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ خیالات خواہ مہمل ہوں، اخلاق سوز ہوں، بے جوڑ ہوں سب کچھ بلا کم و کاست بیان کر دے اور کسی خیال کو دبانے کی کوشش نہ کرے اس طریقۂ تعبیر میں نمایاں فرق دوسرے تاریخی اور روایتی طریقۂ تعبیر سے یہ ہے کہ یہ خواب کو مختلف عناصر کا مرکب سمجھتا ہے اور اسے شئے کلی خیال نہیں کرتا۔ اس لیے خواب دیکھنے والے سے یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ وہ اس خواب کے متعلق جو خیالات آتے ہوں بیان کرے بلکہ خواب کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر ایک حصہ کے متعلق الگ الگ سوال کیے جاتے ہیں۔ پھر مختلف جوابات کو یکجا کر کے معنی نکالے جاتے ہیں۔

متذکرہ بالا تحریر میں صرف دوسرے طریقۂ تعبیر خواب اور فرائیڈ کے طریقۂ تعبیر خواب میں جو فرق ہے اس کو بتلانے کی کوشش کی گئی ہے اب تفصیلاً فرائیڈ کے طریقۂ تعبیر خواب پر بحث کی جاتی ہے۔

جب انسان سے لغزش زبان ہو جاتی ہے تو جس سے لغزش ہو وہ سوال کرنے پر کوئی عذر

یا دلیل اس لغزش کی پیش کرتا ہے اور یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا مقصد وہ نہیں تھا جو کہ لغزش زبان ظاہر کرتی ہے۔ اور جب ہم اس لغزش کی تاویل اور تشریح کرکے یہ بتلاتے ہیں کہ لغزش زبان اس کے نہفتہ اور دبے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے تو وہ بگڑ کر اس کی پرزور تردید کرتا ہے لیکن خواب میں ہم یہ طریقہ استعمال نہیں کرسکتے کیونکہ خواب دیکھنے والا سوال کرنے پر بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس نے خواب ہی دیکھا اور نہ ہماری تعبیر اور تاویل کی تردید ہی کرتا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی تعبیر ہی پیش نہیں کرسکتے یہ مسئلہ لاینحل سا معلوم دیتا ہے اور تنگ آکر انسان اس کو ترک کرنے کا ارادہ بھی کرلیتا ہے کیونکہ جب وہ کچھ نہیں جانتا ہم کچھ نہیں جانتے کوئی تیسرا شخص بھی اس سے آگاہ نہیں تو پھر یہ مسئلہ حل ہی کیسے ہو۔ لیکن یہ اتنا مشکل سوال نہیں جتنا بظاہر معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ صرف ممکنات ہی میں نہیں بلکہ امر یقینی ہے کہ وہ شخص خواب سے آگاہ ہے وہ صرف یہ نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے اور اس لیے خیال کرتا ہے کہ وہ نہیں جانتا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہاں اور کن حالات میں یہ ثابت ہو کہ آدمی کسی بات کا علم ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا کہ اس کو علم ہے یقینی طور پر اس سوال کا جواب نہایت حیرکن اور عجیب ہوگا جو کہ ہماری ذہنی زندگی کے تصور کو بالکل بدل دے گا۔ اس مفروضہ کا ثبوت خواب آفرینی (ہپناٹزم) میں ملتا ہے۔

۱۸۸۹ء میں فرائیڈ کے سامنے لی لائی بواور ہربرائین اہم نے نانسی میں ایک مظاہرہ کیا ایک شخص پر نومیت کی حالت پیدا کردی گئی اس کے بعد ہر طرح کے وہمی (HALLUCINATORY) تجربات سے گزارا گیا جب وہ بیدار ہوا تو وہ پہلے بالکل لاعلمی ظاہر کرتا تھا ان باتوں کے متعلق جو کہ اس نے حالت نومیت میں کی تھیں۔ برائین اہم نے کئی مرتبہ اس سے کہا کہ جو کچھ اسے حالت نوم میں گزرا تھا وہ بے کم و کاست بیان کردے اس نے صاف صاف کہدیا کہ اسے کچھ علم نہیں۔ برائین اہم پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہا اور اسے یقین دلایا اُسے مجبور کیا کہ وہ ضرور جانتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص تھرتھرایا بڑبڑایا، کچھ غور کرنا شروع کیا اور نہایت مبہم طور پر وہ تمام واقعات یاد آنے لگے جس کی طرف حالت نومیت میں اسے متوجہ کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی یاد کے نقوش ابھرنے لگے اور نکھرنے شروع ہوئے

اور یہاں تک کہ تمام باتیں بغیر کسی واقعہ بھولنے کے بیان کردیں۔ اسی اثنا میں اسے کسی اور بیرونی ذریعہ سے ان باتوں کا علم نہیں ہوا تھا اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ ان واقعات کی یادداشت آغاز ہی سے اس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ان کا علم ہے درحقیقت یہ مثال خواب دیکھنے والے کے بالکل مشابہ ہے۔

حالت نومیت (Hypnotic State) اور حالت نیند میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ حالت نوم حقیقتاً مصنوعی نیند کہلاتی ہے۔ ہم ان اشخاص کو جن پر عمل تنویم کرنا چاہتے ہیں کہتے ہیں، سو جاؤ اور توجہ کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت ایسی ذہنی حالت پیدا ہو جاتی ہے جیسی کہ فطری نیند میں فطری میں ہم بیرون دنیا کی تمام کتاکشوں سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ نومیت کی نیند میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ہاں فرق صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ عامل کو معمول سے رابطہ ضرور رہتا ہے۔ صرف یہی ایک بیرونی دنیا سے تعلق ہے جو کہ حالت نومیت میں انسان رکھتا ہے۔ اس لیے مصنوعی نیند اور فطری نیند میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں کیونکہ فطری نیند مصنوعی نیند کی بہت سی خصوصیات لیے ہوئے ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

اب ہمیں اتنا معلوم ہو چکا کہ خواب دیکھنے والے کو اپنے سپنے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور علم ہوجاتا ہے لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ کس طرح اس کو خواب کی یاد تازہ کرائی جائے تاکہ وہ ہمیں بتلانے کے قابل ہو سکے ہمیں اس سے یہ امید استوار نہ کرنی چاہیے کہ وہ فوراً اپنے خواب کے معنی ہمیں بتلا دیگا لیکن ہمیں یہ امید ضرور کرنی چاہیے کہ وہ اس کا ماخذ معلوم کرنے کے قابل ہو سکے گا اور یہ بھی بتلا سکے گا کہ اس کا خواب کن خیالات اور دلچسپیوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم خواب دیکھنے والے سے استفسار کریں گے کہ اس کو یہ خواب کس طرح سے ہوا۔ اس کے جواب دینے کی اولین کوشش بہت سی مطلوبہ باتیں مہیا کر دے گی اگر وہ ہمارے استفسار کرنے پر یہ کہے کہ وہ خواب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تو اس کی تردید کرنے سے اور ترغیب دلانے سے کہ اسے خواب کا علم ہے ہماری کوشش آخر کار بارآور ثابت ہوگی اور وہ مطلوبہ معلومات بہم پہنچانے پر تیار ہوگا۔

وہ کچھ اس طرح کی باتیں کرے گا کہ "کچھ اسی طرح کا گزشتہ روز واقعہ ہوا تھا" یہ مجھے حال ہی کے واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح سے ہم کو علم ہوتا جائے گا کہ خواب اکثر گزشتہ روز کے تاثرات سے وابستہ ہوتا ہے آخرکار خواب کو نقطۂ آغاز خیال کرتے ہوئے اسے حال ہی کے واقعہ کی یاد تازہ ہو گی جس کے تلازم سے دور زمانہ بعید کی باتیں بھی تازہ ہو جائیں گی۔ خواب گزشتہ واقعہ کی یاد دلائے گا اور گزشتہ واقعہ کسی اور کی۔ اس طرح تلازم خیالات سے ہم اس نقطۂ آغاز تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم ان اجزا کا پتہ لگا سکیں گے جن کی ترکیب سے خواب مرکب ہے۔

خواب بذات خود کوئی حقیقت اور اہمیت نہیں رکھتا بلکہ یہ نعم البدل ہے ان خیالات کا جن سے وہ شخص لاعلم ہے۔ تعبیر خواب کا مقصد بھی ان پس پردہ بھولے ہوئے خیالات کو روز روشن میں لانا ہے تین اہم اصول خواب کی تعبیر کرنے میں مدنظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) ہمیں خواب کے سطحی معنی سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہیے کہ آیا یہ معقول ہے یا غیر معقول، واضح ہے یا مبہم خواہ وہ بظاہر کسی طرح سے بھی ان لاشعوری خیالات سے مشابہت نہ رکھتا ہو جن کی ہم کو تلاش ہے ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔

(۲) ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ نعم البدل خیالات جو کہ دور غیر شعور کی گہرائی میں پڑے ہوئے ہیں اُبھر کر سطح پہ آجائیں۔

(۳) ہمیں اس وقت تک کوشش جاری رکھنی چاہیے جب تک کہ خفیہ لاشعوری خیالات خود بخود ظاہر ہو جائیں جس کے ہم متلاشی ہیں۔

تو اب صاف ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ ہمیں خواب کا کتنا حصہ یاد رہتا ہے؟ اور جو یاد بھی رہتا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے؟ اس کے متعلق ہمیں کسی اہمیت کا اظہار نہ کرنا چاہیے خواب جو کہ یاد رہتا ہے حقیقی شے نہیں بلکہ مسخ شدہ نعم البدل ہے جس کے تلازم سے ہم اصلی خیالات تک پہنچ سکتے ہیں یہ (خواب) ایک ذریعہ ہے جس سے غیر شعوری خیالات شعور میں آتے ہیں جو کہ پس پردہ برسر عمل ہیں۔

لیکن تلازم خیالات کے اصول کے استعمال میں رکاوٹیں اور دقتیں حائل ہیں۔ تلازم تو ضرور

ہوتے ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم ان سب کے اظہار کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ یہ ہمیشہ اپنے خیالات پر کڑی تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں اور چیدہ چیدہ مناسب خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور باقی کو فضول، بے موقع سمجھ کر رد کر دیتے ہیں اس طرح ہم ستے سے خیالات کا آغاز ہی سے گلا گھونٹ دیتے ہیں انھیں ابھرنے کی اجازت ہی نہیں دیتے گویا آزاد تلازم کے عمل کے نتائج میں کمزوری پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ اس عمل کے مطابق ہر وہ خیال جو ذہن میں آئے بلا حیل و حجت بیان کر دینا چاہیے۔ جب ہم اپنے خواب کی تعبیر کریں تو ان سب باتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے اور اس بات کا عزم مصمم کر لینا چاہیے کہ ہم ان کمزوریوں کا شکار کبھی نہ بنیں گے۔ اگر کسی دوسرے شخص کے خواب کی تعبیر کرنی ہو تو یہ اصول اس کے سامنے رکھ دینا چاہیے کہ کسی حالت میں بھی کسی قسم کے خیالات کو جو خواب کے سلسلہ میں منسلک ہوں چھپانے کی کوشش نہ کرے اور ان کو فضول اور بیہودہ سمجھ کر دبانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ تجربات نے ہمیں یہ سبق سکھلا دیا ہے کہ اس قسم کے تمام خیالات جو کہ معمولی معلوم ہوتے ہیں اور جن کا ذکر بھی بظاہر فضول دکھائی دیتا ہے درحقیقت نہایت اہم ہیں اور لاشعوری خیالات کے انکشاف میں مدد دیتے ہیں۔

خواب خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں جوان یا عمر رسیدہ انسان کے خواب بہت پیچیدہ ہوتے ہیں ان کے معنی نکالنے مشکل ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم خواب کے سمجھنے کے لیے بچوں کے خواب کو لیتے ہیں جن میں بہت کم پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ اس سے خواب کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اس قسم کے خواب کی تعبیر کے لیے کسی خاص ترکیب طریقہ ضابطہ یا ترکیبہ کی ضرورت نہیں ہے اور نہ خواب دیکھنے والے بچے سے سوال کرنے کی حاجت ہے لیکن اس کی زندگی کے متعلق تھوڑا بہت علم ہمارے لیے لازمی ہے کیونکہ خواب گزشتہ روز کے تجربات اور واقعات کا ردعمل ہوتا ہے۔ اب ہم چند مثال غور کرنا چاہتے ہیں جن سے کوئی قاعدہ کلیہ تعبیر کر سکیں۔

(۱) ایک دو سال کے بچے کو مٹھائی کی ٹوکری کسی شخص کو بطور تحفہ اس کی پیدائش کے روز پیش کرنا تھی اس لیے بہت ہی ناخوشی سے وہ مٹھائی دی اگرچہ اس میں سے کچھ حصہ اس کو بھی دینے

وہ کیا گیا تھا، دوسری صبح اپنے خواب میں دیکھا کہ میں نے تمام مٹھائی کھالی ہے۔

(۲) ایک چار سال کے عمر کی لڑکی پہلی دفعہ کسی جھیل پر کشتی کی سیر کرنے کے لیے گئی۔ جب وہ اترنے لگی تو وہ اترنا نہیں چاہتی تھی اس لیے خوب چلائی اور روئی۔ دوسری صبح اس نے کہا "کہ میں گذشتہ شب جھیل میں کشتی کی سیر کر رہی تھی۔"

پہلی بات جو ان خوابوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ خواب بے معنی نہیں ہیں بلکہ جامع ہیں اور واضح ذہنی عمل ہیں۔ گو ان خوابوں میں بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہے جو بڑی عمر کے انسان کے خواب میں پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی ایک دم یہ خواب بھی اس عنصر سے خالی نہیں ہے دوسری چیز جو قابل غور ہے وہ یہ کہ خواب گذشتہ روز کے ایسے تجربات کا ردعمل ہیں جو کہ ایک طلب کی خواہش، افسوس کا احساس اور عدم تکمیل خواہش کی کسک پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس قسم کے خواب صاف طور پر خواہش کی تکمیل کا اظہار ہیں۔ یہ پہلی خواب کی خصوصیت ہے۔ دوسرا پہلو اس خواب کا جو کہ ہر وقت زیر نظر رہنا چاہیے یہ ہے کہ خواب صرف خواہشات کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ خواہشات کی تکمیل کرتا ہے "مجھے جھیل میں کشتی کی سیر کرنی چاہیے" یہی خواہش خواب کی تخلیق کا باعث ہوئی اور خواب کا نفس مضمون یہ ہوتا ہے کہ "میں جھیل میں سیر کر رہی ہوں" بہت سے خواب کی اقسام ایسی بھی ہیں جو کہ بچوں کے خواب سے مشابہت رکھتے ہیں۔ جن میں تعقید اور پیچیدگی کا عنصر بہت کم ہوتا ہے اور جو ان کی طرح تکمیل آرزو کا اظہار ہوتے ہیں یہ وہ خواب ہیں جو کہ اشد جسمانی ضروریات کی وجہ سے زندگی میں عموماً رونما ہوتے ہیں مثلاً بھوک تشنگی جنسی خواہش۔

ایک بوڑھی عورت جو بیماری کی وجہ سے گذشتہ روز فاقہ کشی پر مجبور تھی اس نے رات کو خواب میں دیکھا کہ اسے دعوت میں بلایا گیا ہے اور اس کی خاطر تواضع بڑے لذیذ کھانوں سے کی گئی قیدی اور وہ لوگ جو سفر میں یا مہم میں کھانے سے محروم رہتے ہیں اور فاقہ پر مجبور ہوتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات میں وہ مسلسل خواب میں اپنی خواہشات کی تکمیل ہوتے دیکھتے ہیں۔ جو شخص رات کو مرغن غذا کھا کر سوتا ہے اسے پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے اور جاگ

اُٹھتا ہو لیکن جاگنے کے قبل وہ ضرور خواب دیکھتا ہے اور خواب صرف ایک ہی مطلب کا ہوگا کہ وہ ٹھنڈا پانی پی رہا ہے۔ اس خواب کا سبب پیاس ہے اس کی سنسناہٹ سے پانی پینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور خواب اس خواہش کی تکمیل ہوتے ہوئے ظاہر کرتا ہے۔ ایک شخص مسٹر ح کرایہ کے مکان میں رہا کرتا تھا۔ مالک مکان روز صبح کو جگانے آجاتا۔ ایک روز جبکہ وہ میٹھی نیند سو رہا تھا مالک مکان نے کہا "مسٹر ح اٹھو تم کو ہسپتال جانا ہے" اس نیند کے ماتے نے یہ خواب دیکھا کہ وہ ہسپتال میں بستر پر پڑا ہوا ہے اور اس کے سرہانے چارٹ لٹکا ہے جس پر درج تھا کہ "مسٹر ح میڈیکل اسٹوڈنٹ عمر ۲۲ سال" اس نے خواب ہی میں خود سے کہا کہ "جب میں ہسپتال ہی میں ہوں تو مجھے جانے کی ضرورت کیسی؟" اس کے بعد کروٹ لی اور گہری نیند میں سو گیا۔

ایک مریضہ جس نے جبڑوں پر آپریشن کروایا تھا۔ دن رات ایک ٹھنڈک پہنچانے والا آپریٹس منھ پر باندھے رہتی تھی لیکن اس کی ایک عجیب عادت یہ تھی کہ وہ نیند میں اس آپریٹس کو نوچ کر پھینک دیتی۔ ایک مرتبہ جب اس نے ایسا کیا تو اس کے رشتہ داروں نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا اس نے جواب دیا کہ "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے میں نے خواب دیکھا کہ میں سنیما ہال میں بیٹھی ہوئی ہوں اور میری سہیلی بھی میرے پاس بیٹھی ہے۔ اس کے جبڑوں میں سخت درد شروع ہو گیا۔ میں نے خیال کیا کہ جب مجھے کوئی درد نہیں تو کیوں نہ یہ آپریٹس اسے ہی دیدوں۔ اس لیے میں نے اسے پھینکدیا

یہ سب خواب خواہشات کی تکمیل کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں پرانے دانا لوگ قرنوں سے اسی بات پر زور دیتے آئے ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تکمیل خواہش کے خواب کے سوا اور کوئی خواب نہیں ہٹ دھرمی اور ضد ہے کیونکہ خواب ڈراؤنے ہیبتناک بھی ہوتے ہیں جس سے انسان کا دل دہل جاتا ہے اور کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ خواب دیکھنے والا چیخ مار کر جاگ اٹھتا ہے اور بہت عرصہ تک تو دل کی دھڑکن ہی کم نہیں ہوتی کئی دفعہ سپنے کسی عزیز دوست، ماں، باپ بہن، بھائی یا رشتہ دار کو مردہ دیکھتے ہیں۔ کیا انسان ایسی ناخوشگوار باتوں کی خواہش کر سکتا ہے؟ بظاہر یہ اعتراض صحیح معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ایسے نہیں ہیں کہ ان کا

تسلی بخش جواب آسانی سے نہ دیا جا سکے۔ اس ضمن میں پہلی بات جو یاد رکھنے کے قابل ہو یہ ہے کہ اصل مشمولِ خواب کے ظاہری معنی نہیں ہیں بلکہ وہ خیالات ہیں جو کہ پس پردہ برسرِ عمل ہیں اور جو مسخ شدہ صورت میں خواب کی ظاہری صورت میں پیش ہوتے ہیں۔ فرائیڈ کا یہ دعویٰ کہ یہ ڈراؤنے یا ناخوشگوار خواب بھی تکمیل خواہش کا اظہار ہیں۔ اس کا ثبوت آئندہ سطور میں ملے گا۔ فرائیڈ نے جب ایک عورت کے سامنے اس کا ذکر کیا کہ خواب تکمیل خواہش کا اظہار ہو تو اس نے بڑے شد و مد سے اس کی تردید کی اور اپنی لیاقت کے مطابق دلائل اور براہین سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ دوسری رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنی ساس کے ساتھ اس جگہ جا رہی ہو جہاں انھیں موسم گرما بسر کرنا تھا۔ فرائیڈ کو یہ علم تھا کہ اس عورت کی یہ خواہش تھی کہ جہاں اس کی ساس رہے وہ اس کے گرد و نواح سے بھی دور رہے وہ اس کے ساتھ رہنے کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کر چکی تھی اور ایک مکان لینے میں کامیاب ہو چکی تھی جو ساس کے مکان سے بہت دور تھا لیکن خواب یہ ظاہر کرتا ہو کہ وہ ساس کے ساتھ اکٹھے رہنے کے لیے جا رہی ہو جو کہ اس کی خواہش کے بالکل برعکس ہو تو پھر سوال یہ ہو کہ کیا یہ صحیح ہو کہ خواب خواہش کی تکمیل کرتا ہو؟ ذرا سے غور کے بعد اور تعصب کی عینک اتارنے کے بعد حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہو۔ خواب یہ ظاہر کرتا ہو کہ فرائیڈ کا نظریہ بالکل غلط ہو لیکن یہ اس عورت ہی کی خواہش تھی کہ وہ غلطی پر ہو۔ اور خواب نے اس کی خواہش کو پورا کر دیا۔

ایک اور خواب سنیے۔ ایک عورت فرائیڈ کے اس نظریے کو جھٹلانے کے لیے کہنے لگی کہ اس کی بہن کے پاس صرف ایک لڑکا ہے رہ گیا تھا جن دنوں وہ اپنی بہن کے ساتھ رہا کرتی تھی اس کا بڑا لڑکا فوت ہو گیا تھا وہ اس کو بہت عزیز تھا اور بہت محبت سے اس نے اس کو پالا تھا اسے چھوٹے بچے سے بھی محبت تھی لیکن اتنی نہیں جتنی کہ × کے ساتھ تھی۔ پھر اس نے خواب سنایا خواب یہ تھا۔ اس کے چھوٹے بھتیجے ح کی نعش تابوت میں پڑی ہوئی ہو اور اس کے چاروں طرف شمعیں جل رہی تھیں یہ موقع بالکل اس کے بڑے بھتیجے کے تابوت کا تھا خواب سنانے کے بعد عورت گویا ہوئی کہ کیا اس خواب کا یہ مطلب ہو کہ اس کا بھتیجا ح مر جائے وہ اتنی سنگدل نہیں ہو اور شاید ہی کوئی ایسا سنگدل ہو جو

معصوم پھول جیسے بچے کے خون کا پیاسا ہو فرائیڈ اس عورت کے حالات سے بخوبی واقف تھا تعبیر سے قبل حالات بتلا دینے ضروری ہیں کیونکہ خواب گزشتہ واقعات ہی کے بازگشت ہوتے ہیں

وہ عورت بچپن ہی میں یتیم ہوگئی اور بڑی بہن کے گھر میں رہنے لگی بہن کے ملاقاتی جو اس کے گھر آیا کرتے تھے ان میں سے ایک سے محبت ہو گئی۔ محبت کی تکمیل شادی کی صورت میں ہو جاتی لیکن بڑی بہن کی مداخلت کی وجہ سے یہ سلسلہ درہم ہو گیا۔ اس ناکامی کے بعد اس آدمی نے اس کے گھر آنا ترک کر دیا۔ اس کی خودداری مجبور کر رہی تھی کہ اس شخص سے احتراز کرے لیکن پھر بھی محبت کی چنگاری اس کے دل میں سلگتی رہی وہ شخص پروفیسر تھا اور عموماً ادبی جلسوں میں تقریریں کیا کرتا تھا یہ اس کے ہر جلسہ میں جاتی لیکن کسی ایسی جگہ بیٹھتی جہاں کہ اس پروفیسر کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ صرف ایک مرتبہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے جب اس کا بڑا بھتیجا فوت ہوا تھا جس سے اس کو بہت محبت تھی وہ پروفیسر بھی بہت مدت کے بعد تعزیت کے لیے آیا تھا جب عورت نے اسے دیکھا تو وہ پروفیسر تابوت کے پاس کھڑا تھا۔

فرائیڈ نے خواب کی تعبیر یوں کی اگر اس کی بہن کا دوسرا بچہ مر جائے تو وہی بات ہو گی جو پہلے ہوئی تھی یعنی وہ عورت اپنی بہن کے ساتھ اظہار افسوس کے لیے ہو گی۔ پروفیسر چونکہ اس کی بڑی بہن کا ملاقاتی ہے اس لیے تعزیت کے لیے ضرور آئے گا اس طرح وہ اسے دیکھ سکے گی۔ خواب کا درحقیقت مقصد بچہ کی موت سے نہیں تھا بلکہ محبوب کا دیدار تھا عورت نے بھی تعبیر کی تائید کی۔

اور خواب سنیے۔ خواب دیکھنے سے ایک روز قبل کسی ڈاکٹر نے اپنی آمدنی کی فہرست گورنمنٹ کو انکم ٹیکس کے لیے پیش کی، عموماً اس قسم کے معاملوں میں اپنی آمدنی کم دکھلاتے ہیں تاکہ انکم ٹیکس کم لگے لیکن بچارے ڈاکٹر کی اتنی آمدنی ہی نہیں تھی جس کو وہ کم دکھلائے۔ اس لیے اس نے صحیح آمدنی بتا دی اس نے دوسرے دن خواب دیکھا کہ اس کا ایک دوست ٹیکس کمیشن کی میٹنگ سے آیا ہے اور اس نے اطلاع دی کہ اوروں کی فہرست کو بغیر کسی رد و قدح کے پاس کر دیا گیا لیکن اس کی فہرست پر آفیسروں کا شک و شبہ ہے کہ آمدنی ضرور کم دکھلائی گئی ہے۔ اس لیے اغلباً جرمانہ ہو گا۔

ہر ڈاکٹر کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی پریکٹس کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کو دکھلائے کیونکہ پریکٹس اسی کی زیادہ ہوگی جو لایق ہوگا اور ہر ڈاکٹر اپنے کو مسیحائے وقت سے کم نہیں سمجھتا اس لیے یہ خواب بھی ڈاکٹر کی خواہش کا آئینہ دار ہے کیونکہ خواب میں ڈاکٹر کی آمدنی زیادہ ظاہر کرتا ہے اور یہی اس کی خواہش تھی۔

ان تمام مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خواب بھی جو بظاہر ناخوشگوار ہوتے ہیں خواہش کی تکمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر انسان اپنے خیالات وخواہشات کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ دبا دیتا ہے۔ جب وہ سوتا ہے تو یہ بندش جو نفس شعور ان محبوس شدہ جذبات پر رکھے ہوئے ہے ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور خواہشات مسخ شدہ صورت میں خواب کی حالت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خواہشات اپنی اصلی صورت میں کیوں ظاہر نہیں ہوتیں اور یہ مسخ کیوں ہو جاتی ہیں۔ کونسی ایسی قوت ہے جو کہ ان کے خد وخال اور حلیہ تک کو تبدیل کر دیتی ہے۔ اس عمل کو احتساب (Censor) کہتے ہیں۔

احتساب | آج کل اخبارات میں کہیں جگہ خالی چھوٹی ہوئی نظر آتی ہیں نیچے نوٹ ہوتا ہے کہ یہ خبر سنسر کی نذر ہوگئی۔ وہ خبر یا آرٹیکل چونکہ گورنمنٹ کی پالیسی کے موافق اور مطابق نہیں تھا اس لیے گورنمنٹ نے اسے شائع ہونے سے روک دیا۔ بعض سیاسی نامہ نگار اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اور ملک کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ کی پالیسی پر اپنے خیالات کا اظہار کریں لیکن اگر وہ صاف صاف کہہ دیں کہ گورنمنٹ عوام کو دھوکا دے رہی ہے تو ایسا کرنے سے جیل جانے کا ڈر ہے اس لیے وہ ذرا سمجھ سے کام لیتے ہیں خیالات کو الفاظ کے قانونی سانچے میں ایسا ڈھالتے ہیں کہ قانون کی گرفت میں نہیں آسکتے اور ساتھ ہی ان کے اصلی خیالات بھی عوام تک پہنچ جاتے ہیں یعنی سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ بعض تو اس آرٹ میں اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ اپنے خیالات کو واضح طور پر کہہ بھی جاتے ہیں اور قانون کے استبدادی پنجے سے اس طرح نکل جاتے ہیں جس طرح مداری لوہے کے تنگ چھلے سے سانس کو بند کرکے کمر اور تمام جسم کو سکیڑ کر اور لٹو کی طرح چکر کھا کے نکل جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کی قوت خواب میں بھی کام کرتی ہے۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے لیکن جو کچھ وہ سوچتا ہے لب پر نہیں آتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے خیالات اخلاق سوز ہوں، تمسخر انگیز ہوں، سوسائٹی اور تہذیب ان کے خلاف ہو اس لیے

وہ الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکے۔ وہ ایسے پھول ہیں جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں اس لیے یہ خیالات دب کر نفس لاشعور میں پناہ لیتے ہیں۔ دن کو حالت بیداری میں نفس شعور خیالات کے اظہار سے پہلے اس کا جائزہ لیتا ہے ان کا محاسبہ کرتا ہے ان کو ہر پہلو سے جانچتا ہے ہر طرح تسلی تشفی کر کے ان الفاظ کے قالب میں جانے کی اجازت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نفس شعور خیالات کے جنادمیں بیرونی حالات، سوسائٹی اور قانون وغیرہ کو بھی مدنظر رکھتا ہے لیکن جب انسان سوجاتا ہے تو وہ اس وقت نیم مردہ ہوتا ہے نفس شعور کی بندشیں ڈھیلی پڑجاتی ہیں مجبوس شدہ جذبات وخیالات زندگی کیلیے جدوجہد کرتے ہیں وہ بندشوں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتے ہیں لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے وجود کی جھلک دکھلانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اس نکتہ کو ہم مثال سے واضح کرتے ہیں کسی ملک میں جابر اور قاہر بادشاہ حکمراں ہوتا ہے تو پبلک اس سے بہت تنگ آئی ہوئی ہوتی ہے لیکن اس کی جباری اور قہاری کی وجہ سے دم نہیں مارسکتی لیکن جب بادشاہ بوڑھا ہوجاتا ہے یا اس کا اختیار حکومت کی باگ ڈور پر کم ہوجاتا ہے تو یہ دبے ہوئے عوام بھی سر اٹھانے لگتے ہیں اپنی خواہشات کو مطالبات کی صورت پیش کرتے ہیں اور ان کے منوانے کے لیے خون تک بہادینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں جب تک شاہان مغلیہ طاقتور رہے ہندوستان کی تمام ریاستیں اور صوبے مطیع تھے۔ ان کی مرضی کے خلاف سر نہیں اٹھا سکتے تھے جب ذرا سی کمزوری ان میں پیدا ہوئی تو کہیں مرہٹوں نے شورش برپا کر دی کہیں اس صوبے نے بغاوت کا علم بلند کر دیا کبھی اس صوبے میں شورش ہوگئی۔ جہاں جس صوبے کے گورنر کو موقع ملا خودمختار بن بیٹھا۔ بالکل اسی طرح انسان کی نفسی مملکت کی حالت ہے جب انسان خواب راحت کے مزے لوٹتا ہے تو اس وقت شعور کی پابندیاں کمزور ہوجاتی ہیں اس لیے باغی عوام کی طرح یہ محبوس شدہ جذبات بھی جہد للبقا کی مہم شروع کر دیتے ہیں رکاوٹیں کم ہوتی ہیں اور جو ہوتی بھی ہیں وہ بھی ناقص اور کمزور اس لیے بند شدہ جذبات ایک برقی حملہ کرتی ہیں اور ان بندشوں کے توڑنے اور رکاوٹوں کے عبور کرنے میں تھوڑی سی کامیابی بھی ضرور حاصل کر لیتے ہیں اپنا وجود خواب کی صورت میں پیش کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعور کی قوت نہیں ہوتی وہ ہوتی تو ضرور ہے لیکن کمزور حالت میں اس لیے اصلی خیالات جو ظاہر ہونے کے لیے تڑپتے ہیں وہ اپنی اصلی صورت و شکل کو کھودیتے

ہیں مسخ شدہ حالت میں خواب میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ شعور کی ہم خفتہ قوتیں ان کی ترمیم کرتی ہیں۔ اس خواب میں جو پیچیدگی ہوتی ہے وہ اسی سنسرشپ کی مرہون منت ہے۔

اشاریت (Symbolism) اب ہم جانتے ہیں کہ خواب میں جو پیچیدگی ہوتی ہے اس کا باعث احتساب کا عمل ہے جس سے خواب کے مسئلہ میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس الجھاؤ کا ایک اور بھی باعث ہے وہ ہے اشاریت جو بھی سنسرشپ کے عمل سے ظہور میں آئی ہے۔ اس کو اختصاراً بیان کیا جاتا ہے۔

اشاریت انسان کی خصوصاً جنسیاتی خواہشات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح شارٹ ہینڈ کی علامات ہیں اور ہر علامت کے مختلف معنی ہیں اسی طرح سے خواب میں بھی پنہاں خیالات کی علامات ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مستقل معنی کا اظہار نہیں کرتے؟ لیکن اس باب میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اشاریت کا تعلق خواب کے ظاہری مافیہ سے نہیں ہے بلکہ خواب کے پنہاں خیالات کی تلمیح ہے اس کی زیادہ ترقی یافتہ شکل کہاوتوں، روایتوں، محاوروں اور ضرب الامثال میں ملتی ہے۔ اس لیے اشاریت پر عبور حاصل کرنے کے لیے اور ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں خواب کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی استعمال میں لانے پڑیں گے یہ پیچیدہ طریقوں اور ٹیڑھے ترچھے راستوں سے پنہاں خیالات کا اظہار کرتا ہے اب ہم اشارات بتلاتے ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح جنسیاتی خواہشات کو ظاہر کرتا ہے۔ ان اشیاء کی تعداد جو خواب میں کنایہ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں زیادہ نہیں ہیں۔

خواب میں مکان انسان کا جسم، والدین، بچے، بھائی، بہن ہر ایک کو عریاں صورت میں ظاہر کرتا ہے لوگوں نے خواب میں مکان کے سامنے والے حصہ پر چڑھتے اور اترتے ہوئے دیکھا ہے اور اس کے ساتھ مسرت اور خوف کے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں جب دیواریں ہموار ہوں تو گھر کا مطلب آدمی سے ہوتا ہے جب اس میں روشندان ہوں یا سوراخ ہوں جو کہ گرفت میں آسکیں تو اس کا مطلب عورت سے ہوتا ہے والدین خواب میں شہنشاہ، ملکہ، بادشاہ، شاہزادی یا اور کسی عالی مرتبہ ہستی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بھائی اور بہن چھوٹے حیوان اور کیڑے مکوڑے کی صورت میں پیش ہوتے ہیں پانی ہمیشہ پیدائش کو ظاہر کرتا ہے بعض اوقات ہم پانی میں گرتے ہیں یا اس میں سے کسی کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یہ ماں اور بچے کے

تعلقات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سفر خواب میں مرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسری بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مرد کی جنسیاتی زندگی ظاہر کرنے کے لیے خواب میں کنایات کی بہت فراوانی ہے اور خواب میں اشیا کی بہت سی تعداد جنسیاتی کنایوں پر مشتمل ہے۔ مرد کا اعضائے تناسل ظاہر کرنے کے لیے اشارات وہ شے استعمال کرتا ہے جو کہ طوالت اور استادگی کی صفات رکھتے ہوں جیسے چھتری، چھاتا۔ درخت اور اسی قبیل کی اشیا یا وہ ہتھیار جو کہ چھیدنے اور جسم کے زخمی کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں مثلاً چاقو، خنجر، بندوق، پستول وغیرہ۔ گڑھا، غار، بوتلیں، مرتبان، صندوق، جیبیں، کتاب، کشتی، عورت کی جائے مخصوص کو ظاہر کرتے ہیں۔ خواب میں کمرہ خصوصاً عورت کو ظاہر کرتا ہے اس کی ایک مثال سنیے ایک شخص جو کہ بورڈنگ میں رہتا تھا اس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی ملازمہ سے ملتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تمھارا نمبر کیا ہے اس ملازمہ نے جواب دیا کہ نمبر ۱۴ ہے۔ تعبیر یوں ہے حقیقت میں اس شخص کے ملازمہ سے ناجائز تعلقات تھے اور کئی مرتبہ وہ اسے اپنی خوابگاہ میں لایا تھا ملازمہ کو ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں اس کی مالکہ نہ دیکھ پائے اس لیے خواب کے ایک روز قبل اس نے مشورہ دیا تھا کہ انھیں کسی اور خالی کمرہ میں ملنا چاہیے جس کمرہ کی طرف اس کا مطلب تھا اس کا نمبر ۱۴ تھا اس طرح کمرہ عورت ظاہر کرتا ہے۔

اشاریت بھی خواب کے ایک طریقۂ تعبیر میں سے ہے دوسرا طریقہ تلازم خیالات کا ہے جس پر اوپر بحث کی جا چکی ہے اگر ہم صرف اشاریت ہی سے خواب کی تعبیر نکالنے کی کوشش کریں تو یہ طریقہ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوگا۔ ہاں اگر دونوں طریقوں کی مدد سے تعبیر کرنے کی کوشش کریں تو نتائج تسلی بخش ہوں گے

خواب کا عمل | خواب دو اجزا سے مرکب ہے خواب کے ظاہری خیالات (Manifest Content) اور پنہاں خیالات (Latent Content)۔ جو کچھ خواب دیکھنے والا بیان کرتا ہے وہ ایک معمہ ہوتا ہے جسے ہمیں حل کرنا ہوتا ہے جس کی ہمیں تعبیر کرنی ہوتی ہے ہمارا تعبیر سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ خواب کے ظاہری معنی کے پس پردہ جو خیالات برسرِ فعال ہیں ان تک پہنچا جائے ان کو آشکارا کیا جائے کیونکہ وہی ظاہری خیالات کے خالق ہوتے ہیں اور انھیں کی تحریک سے وہ عالم وجود میں آتے ہیں جس طرح سے معمہ کے الگ الگ بے معنی الفاظ کے پس پردہ اور معنی ہوتے ہیں اسی طرح خواب کے بھی پنہاں خیالات ہوتے ہیں جن کا جاننا نفسیاتی

گتھیوں کے سلجھانے میں مددگار اور معاون ہوگا کیونکہ جب تک وہ نگاہ سے اوجھل رہیں گے اور جب تک ہم ان کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوں گے خواب کی الجھن سے نہیں نکل سکتے اس لیے خواب کے پنہاں خیالات کا سمجھنا خواب کا سمجھنا ہے اور خواب کا سمجھنا انسان کی نفسیات کا سمجھنا ہے یہی گوہر مراد ہے یہی وہ مرکز ہے جس کے گرد انسان کی نفسیاتی زندگی گردش کرتی ہے۔

خواب کے خیالات ظاہری بہت مختصر ہوتے ہیں! یوں کہیے کہ بہت جامع ہوتے ہیں جب ہم ان کی تشریح و تعبیر کرتے ہیں تو ایک لفظ کی شرح کے لیے ایک صفحہ درکار ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک لفظ اپنے ساتھ **ایک داستان گذشتہ** کا سلسلہ منسلک رکھتا ہے ہر لفظ معنی خیز ہوتا ہے اور کسی گزشتہ واقعات کی نمائندگی کرتا ہے اس طرح بہت سے واقعات سکڑ کر خواب کے چند ذہنی تصورات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس عمل کو انجماد کہتے ہیں۔ واضح تر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ظاہری خیالات مختصر ترجمہ ہوتے ہیں پنہاں خیالات کا۔ یہ انجماد کا عمل ہر خواب میں پایا جاتا ہے یہ ان طریقوں سے وجود میں آتا ہے۔

(۱) پنہاں خیالات کے چند اجزا ترک کیے جاتے ہیں۔

(۲) پنہاں خیالات کی بہت سی پیچیدگیاں صرف چند ظاہری خیالات میں ظاہر ہوتی ہیں اس لیے اور بھی لاینحل سی معلوم ہوتی ہیں۔

(۳) پنہاں خیالات میں جو اجزا کچھ مماثلت رکھتے ہیں یا پہلو ہم رنگ رکھتے ہیں۔

خواب کے ظاہری خیالات میں مل جل کر ایک ہی رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ انجماد کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے ہم خواب میں ایک شخص کو دیکھتے ہیں جس کی شکل الف سے ملتی جلتی ہے لیکن لباس ب کا پہنے ہوئے ہے اور پیشہ جو اختیار کیا ہوا ہے وہ ج کی یاد دلاتا ہے خواب کے اس مخلوط شخص میں تینوں اشخاص کی نمایاں خصوصیات یکجا کر دی گئی ہیں۔

ایک عورت نے خواب دیکھا کہ ایک خوبصورت ڈاڑھی والا آدمی ہے جس کی آنکھیں سنہری اور جھکی ہوئی تھیں۔ اور ایک سکتے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھ رہی تھیں جس پر لکھا تھا۔ تو جب تلازم خیالات کا عمل کیا گیا تو مندرجہ ذیل حالات روشنی میں آئے۔ خواب میں جس شخص کو دیکھا تھا وہ بہت بارعب تھا

اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اسے ایک پوپ کی تصویر کی یاد دلاتی تھیں جسے روم کے گرجا میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مزید تلازم خیالات سے معلوم ہوا کہ اس خواب والے آدمی کا ڈیل ڈول اس کے شہر کے پادری سے بہت ملتا جلتا تھا۔ خوبصورت ڈاڑھی اسے ڈاکٹر کی یاد دلاتی تھی جس کے وہ زیر علاج رہا کرتی تھی اس شخص کا قد اس کے باپ کے قامت سے بہت ملتا جلتا تھا لفظ تر، خشک کا اُلٹ ہے۔ یہ لفظ اس شخص کی یاد دلاتا ہے جس سے اس کی شادی ہوجاتی اگر وہ بہت شراب خور نہ ہوتا۔ اس کا نام تھا خشک اس طرح انجماد کے عمل سے بہت سے اشخاص کی نمایاں خصوصیات مجتمع ہوتی ہیں یہ ہے عمل انجماد -

ابدال | خواب کے ظاہری خیالات میں بہت سے اجزا اتنے نمایاں اور ابھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ یہی پنہاں خیالات کی کلید ہیں تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ضروری نہیں کہ اس قسم کے نمایاں اجزا پنہاں خیالات کا ایک حصہ ہوں یا اس کے آئینہ دار ہوں مثال کے طور پر اس خواب میں جہاں عورت نے اپنے بھتیجے کی نعش کو تابوت میں دیکھا جس کے گرد شمع روشن تھیں جب اس خواب کی تعبیر کی گئی یہ خواب محبوب کی ملاقات کی خواہش پوری کرتا ہے (اس خواب کا مفصل ذکر اوپر ہوچکا ہے) تو اس نے اس کا اقبال کیا اور تعبیر کی تائید کی۔

عورت کی خواہش تھی کہ اپنے محبوب کو دیکھے اور یہ خواہش متذکرہ بالا خواب کی محرک ہوئی لیکن اس خواب کا کوئی جزو ایسا نہیں ہے جو کہ یہ ظاہر کرے کہ وہ محبوب کی ملاقات چاہتی ہے کہاں بھتیجے کی نعش اور کہاں محبوب کی ملاقات۔ کتنے مختلف اور متضاد خیالات ہیں لیکن کتنا تعجب ہے کہ یہ صحیح ہیں۔ اس عمل کو ابدال کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خواب ہمارے غیر شعوری خیالات کا اظہار کرتا ہے اور یہ غیر شعوری خیالات ہیں جن کے ہاتھ میں ہمارے عمل کی باگ ڈور ہوتی ہے اس لیے خواب سے ہمارے غیر شعوری خیالات کا پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کس قسم کے ہیں اور ان کا رجحان کیا ہے۔ ان کے مطابق ہم عمل پیرا ہوسکتے ہیں۔

رشید الدین بی۔ اے

دورِ جدید اور اس کی تعلیمی ضروریات

(یہ تقریر لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کی گئی تھی)

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ اس نئے زمانے میں ہماری طرزِ زندگی بھی بہت کچھ بدل گئی ہے۔ دورِ حاضر نے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں ہر ایک چیز میں تغیر واقع ہو رہا ہے اور پرانے اصولوں اور عقیدوں کی از سرِ نو جانچ پڑتال ہو رہی ہے نہ صرف قدیم رسوم و رواج بلکہ مذہب تک پر مختلف طریقوں سے حملے ہو رہے ہیں اور اس طرح سوسائٹی کی بنیادیں ہل رہی ہیں ہر ایک اپنی ضمیر کی آزادی کا راگ الاپتا ہے اور آزادیٔ عمل کے حاصل ہونے پر خود کو ایک بالکل نئی دنیا میں پاتا ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو بڑی بڑی توقعات اور امکانات سے پر ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جو اس کی ہر ایک قابلیت کی نشو و نما کے لیے پوری پوری سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ وہ ترقی کی ہر ایک منزل طے کرنا چاہتا ہے اور اگر کوئی چیز اس کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے تو وہ اس کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اس وقت تک چین نہیں لیتا جب تک کہ وہ اس کو تباہ و برباد نہ کر ڈالے۔

سماج کے اکثر ادارے ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں اور ان میں سے بعضوں میں بہت ہی تیزی سے تبدیلیاں کی جا رہی ہیں تاکہ وہ موجودہ حالات کے مطابق بن سکیں اور یہ بہت ضروری بھی ہے اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہو تو مستقبل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

ہر طرف آزادی کی ہوا چل رہی ہے اور تقریباً ہر شخص اپنے حقوق سے واقف ہو گیا ہے اور ان پر اگر کسی جانب سے حملہ ہو جائے تو وہ ان کی حفاظت ہر ممکن طریقے سے کرنے کے لیے آمادہ ہے۔

آج کل جبکہ آمریت اور جمہوریت میں سخت تصادم ہو گیا ہے اور اول الذکر بعد الذکر کا گلا گھونٹنا اور آزادی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے یہ خیالات مبالغہ آمیز معلوم ہوں لیکن ہمیں [illegible] نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ موجودہ عالمگیر جنگ سے پیدا شدہ حالات کی نوعیت

محض عارضی ہی سخت غلطی ہوگی اگر ان کو دائمی یا مستقل سمجھ کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ امر کہ برطانیہ عظمیٰ اور ممالک متحدہ امریکہ جمہوریت اور وطنی اور انفرادی آزادی کے برقرار رکھنے کے لیے ہر قسم کی تکالیف خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے ہیں اور اول الذکر اور روس کو ایک خطرناک خونی ہولی کھیلنے پر مجبور ہونا پڑا ہے مگر سب کے سب بہر قیمت فاسطائیت اور ہٹلریت کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں نے اپنے وطن اور آزادی کی خاطر بہادری سے لڑنا اور مرمٹنا گوارا کیا مگر حملہ آور کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اپنے حقوق و آزادی کے برقرار رکھنے کے لیے انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

انفرادی اور اجتماعی آقائی کا دور ختم ہوگیا اور اس کی جگہ خدمت اور اشتراک عمل نے لی ہے۔ اب محنت و مشقت اپنا صحیح مرتبہ حاصل کر رہی ہیں اور کوئی صحیح الدماغ شخص کسی مزدور کو نیچی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ مزدوری اور خدمت کے متعلق یہ جدید تخیل ہی موجودہ تہذیب کی بہت سی برائیوں کا ایک کارگر علاج سمجھا جاتا ہے۔ وہ زمانہ گیا جبکہ مزدور تنگ و تاریک کارخانوں میں صبر آزما اور عرق ریز مشقت کرنے کے باوجود صرف برائے نام ہی معاوضہ حاصل کر سکتے تھے۔ سرمایہ دار اب ان کی محنت سے ناجائز فایدہ نہیں اٹھا سکتا اپنے منافع میں اب اس کو انھیں اپنا شریک بنانا پڑے گا۔

سائنس نے نظروں کے سامنے ایک نیا مرقع پیش کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے ایسے عجائبات ظہور میں آ رہے ہیں جن کا پہلے خیال تک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ زمانہ ہے ایجادات اور مشینوں کا شوق تجسس ہر ایک میں سرایت کر گیا ہے اور ہر ایک شخص ہر شے کی اصل وجہ معلوم کرنا چاہتا ہے اور اس لیے تلاش حق میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ فاصلہ پر پوری فتح حاصل ہوگئی ہے اور دنیا کے بعید ترین حصے ہوائی جہاز اور لاسلکی کی بدولت اب قریب ترین ہوگئے ہیں۔

صنعت و حرفت نے ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے اور اب اس کو نہ صرف کسی ملک کے تمول اور ترقی میں ایک فیصلہ کن عنصر سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کی قسمت کے بنانے میں بھی اور یہ نہ صرف

دو ممالک کے مابین دوستی اور خلوص کے روابط بڑھانے کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ ان کے درمیان منافرت اور دشمنی کے بیج بھی بو سکتی ہے اور اس طرح اکثر اوقات جنگ کا ایک اہم سبب بن جاتی ہے۔

اس طرح موجودہ زندگی ایک بہت ہی پیچیدہ شئے بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے نئے اور مشکل مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور ان کا صحیح حل اس وقت تک ناممکن معلوم ہوتا ہے جب تک کہ قومی طریقۂ تعلیم کو جس کا اعلیٰ مقصد آئندہ نسلوں کو ان مسائل سے کامیاب طور نپٹنے کے لیے تیار کرنا ہے اس طرح نہ ڈھالا جائے کہ وہ ان جدید ضروریات اور مقاصد کو نہایت ہی عمدہ طریقہ سے پورا کر سکے۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مقاصد اور طریقہائے تعلیم کو بالکل ہی بدل دیں۔

قدیم طرز تعلیم کا مقصد ایک ایسی مقتدر جماعت کو تیار کرنا تھا جس کے افراد محض آقا اور لیڈر بن سکیں یہ تعلیم محض ان فارغ البال اور بے فکر افراد کے لیے تھی جن کے پاس کافی فرصت کا وقت تھا اور جو فلسفہ اور تفکر کو ثقافت یا کلچر کا جزو اعظم اور ایک مہذب شخص کے لوازمات میں سے سمجھتے تھے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں حقیقی معنوں میں اب کوئی آقا اور کوئی نوکر نہیں رہا بلکہ سب مل کر ایک مشترکہ مقصد کے لیے کام کرتے ہیں اور ہر ایک کو اپنی جماعت یا سماج کی ترقی کے لیے اپنے سے جو کچھ ہو سکے کرنا پڑتا ہے۔ اس زمانہ میں اپنی زندگی کو معمولی طور پر بھی کامیاب بنانے کے لیے اس قدر معلومات حاصل کرنا اور کام کرنا پڑتا ہے کہ محض خیالی پل تیار کرنے کا کسی کو بھی موقع نہیں ملتا۔ اگر کوئی شخص محض نظریوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے اور اپنے خیالات کو ہر ممکن طریقے سے عملی جامہ پہنا سکے تو یہ اس کے لیے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ اور غور و فکر بھی اپنی خاص جگہ رکھتے ہیں لیکن ان کو حد سے متجاوز ہونے نہیں دیا جا سکتا اور اکثر صورتوں میں ان کو سیکھنے اور ان کے نتائج کا ایک معروض (concrete) شکل میں علم الیقان حاصل کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ زندگی کی روزمرہ کی مشقت ہی ہوا کرتی ہے۔ اس طرح اب دور قدیم نے دور جدید کے لیے جگہ خالی کر دی ہے ضرورت ہے کہ حالات کے لحاظ سے مقاصد اور طریقہائے تعلیم میں بھی تبدیلی کی جائے۔

علم نفسیات کی تحقیقات نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ بچے کے مدرسے آنے کا مقصد

سیکھنا نہیں بلکہ عمل کرنا ہے اور جو کچھ بھی معلومات وہ یہاں حاصل کرے ان کو عمل ہی کا نتیجہ ہونا چاہیے محض کسی چیز کو رٹ لینا اور جو کچھ کتاب میں لکھا ہو اس پر بے چون وچرا یقین کر لینا کوئی زیادہ مفید نہیں ہوتا جب تک کہ اس کو عمل کے ذریعہ ذہن نشیں نہ کیا جائے یا بالفاظ دیگر ان معلومات کا طالب علم کے روزمرہ کے تجربوں سے تعلق یا ارتباط قایم کیا جانا چاہیے علاوہ ازیں چونکہ طلبا کو آیندہ چل کر مختلف حیثیتوں سے عملی کام اور محنت ومشقت کرنی پڑے گی اور انھیں ان ہی کے ذریعہ اپنی ترقی کی راہیں نکالنی ہوں گی اس لیے اُن کو ان کا کسی نہ کسی شکل میں عادی بنانا چاہیے اور اُن کو ان کی اس طریقے سے اور اس قدر عادت ڈالنی چاہیے کہ وہ ان سے محبت کرنے لگیں۔ اس لیے قدیم طرز کے کتابی مدارس اب مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ محض آقا بننے کی تعلیم کی اب چنداں ضرورت نہیں اور یہی چیزیں ہیں جن کا جدید نظام تعلیم میں خاص طور پر خیال رکھنے کی ضرورت ہے یہ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جس میں ہر ایک کو آزادی سے نشوونما پانے کا نہ صرف موقع ملے بلکہ اس کی ان اعلیٰ مگر پوشیدہ قابلیتوں کے اظہار کے ذرائع بھی فراہم کیے جائیں جو قدرت نے خاص طور سے اسے عطا کی ہیں۔

جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا کہ آج کل زندگی کا نقطۂ نظر ہی بدلا ہوا ہے اور ہر ایک شخص خواہ وہ ایک معمولی کسان ہو یا کان میں کام کرنے والا مزدور ایک آزاد شہری کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کے حقوق و فرائض بھی ہیں اور جب تک کہ اس میں قبل الذکر کے پہچاننے اور بعد الذکر کی انجام دہی کی کافی صلاحیت نہ پیدا کی جائے سوسائٹی کا وجود ہی خطرہ میں ہے اس لیے کہ اگر اس میں یہ صلاحیت نہ ہو تو اس کے افعال غیر ذمہ دارانہ ہوں گے اور وہ سمجھ اور دوراندیشی سے کام نہ لیگا ان وجوہات کی بنا پر ایسی تربیت کا انتظام ضروری ہے جو ہر ایک کو اپنی آزادی کا صحیح استعمال سکھائے اور اس میں اپنے فرائض اور اہم ذمہ داریوں کا پورا احساس پیدا کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عام معمولی نصاب کے علاوہ ہر ایک کے لیے بلدی معلومات، موجودہ سماجی اور بین الاقوامی حالات سے واقفیت اور غیر ممالک میں عمال اور دیگر ہم پیشہ لوگوں کے حالات سے باخبری بھی ضروری ہے اور اس امر کا احساس بھی ضروری ہے کہ کس طرح ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض کے

انجام دہی سے وہ نہ صرف اپنی جماعت اور اپنے ملک کی ترقی کی راہیں ہموار کرتا ہے بلکہ بنی نوع انسان کے فلاح اور بہبود کی بھی۔ کس طرح دوسروں کی محنت و مشقت سے وہ مستفید ہوتا اور کس طرح اس کا کام دوسروں کے لیے فایدہ مند ہوتا ہے۔ اس طرح اپنے ملک کے اور باہر کے حالات سے متعلق ضروری معلومات حاصل کر کے اپنے اندر کافی وسعتِ نظر پیدا کرنے کے بعد وہ اس امر کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا اس کے کام کا مقصد دوسروں سے مقابلہ اور مسابقت ہونا چاہیے یا اس میں حسن و خوبی کا پیدا کرنا۔ آیا اس کو دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنا چاہیے یا اس کام کو عمدہ طریقہ سے انجام دینے کے لیے ان کے ساتھ اشتراک عمل۔

مستقبل کے شہری کی حیثیت سے ہر طالب علم کو اپنے حقوق و فرائض کے پہچاننے کی تربیت دینے کے علاوہ نظام تعلیم میں اس کی آیندہ خانگی زندگی اور اوقات فرصت کا خیال رکھنا بھی از بس ضروری ہے اس لیے کہ دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد ہر ایک کو آرام اور فرصت کے چند گھنٹے بھی ملتے ہیں اور اس کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ان کو کس طرح عمدگی سے کام میں لایا جا سکتا ہے تاکہ وہ زندگی کی مسرتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کو ایسے مشاغل کی طرف عملی طور پر متوجہ کرنا ضروری ہے جو اس کے لیے کافی دلچسپ اور مسرت بخش ہوں اور ساتھ ہی بے ضرر بھی۔

اس کے جمالیاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ورنہ وہ اپنی زندگی کی مسرتوں سے پوری طرح بہرہ ور نہ ہو سکے گا اس کے مذاق کی ایسی تربیت ہونی چاہیے کہ وہ ہر وقت ایک عمدہ اور اعلیٰ معیار ہی کی چیز کا طالب ہو اور اس سے لطف اندوز ہو سکے اور معمولی اور بازاری چیزیں جو معیار سے گری ہوئی ہوں اس کی نظروں میں نہ جچیں۔

مختصر طور پر یہ ہیں ضروریات دور جدید کی اور کوئی نظام تعلیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان میں سے ہر ایک کی طرف پوری توجہ نہ کرے یا بالفاظ دیگر جدید نظام تعلیم کی کامیابی ان مسائل کے قابل اطمینان حل پر ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے مقاصد اور طریقہائے تعلیم میں تبدیلی لازمی ہوگی اور جب یہ تبدیلی بھی لازمی ٹھہری تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جدید

نظام تعلیم کے اغراض و مقاصد کیا ہونے چاہئیں کیا ہم تعلیم کا قدیم نصب العین یعنی ایسے نصاب کے ذریعہ تعلیم دینا جس میں بہت سے اور مختلف النوع مضامین شریک ہوں اور جس کا مقصد انسان کو اعلیٰ خیال اور وسیع النظر بنانا ہو نظر انداز کر دیں اور اس کی جگہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو اپنا مقصد بنا لیں کیا ہم ادب اور فنون لطیفہ کو نظر انداز کر دیں اور ان کی جگہ ایسی چیزوں کو شریک کر لیں جو عملی قسم کی ہوں اور ہمارے لیے فوری اور وقتی طور پر کار آمد۔ اگر ہم ان میں سے محض ایک کو اختیار کر لیں اور دوسرے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو یہ ہماری بڑی غلطی ہو گی اس لیے کہ اس سے سماج کی تمام ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ قدیم مقاصد و طرز تعلیم کی شکل و صورت میں اگر تبدیلی ہوتی ہے تو ہوا کرے اس کی روح کو فنا نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ اس لیے بہتر صورت یہ ہے کہ اس میں ضروری ترمیم کی جائے مستقبل کی بنیاد کو ماضی اور حال کے مسلسل تجربوں ہی پر قایم ہونا چاہیے نہ کہ ان سے بالکل الگ تھلگ

خواجہ محمد یوسف الدین ایم اے۔ ایل ایل بی

سرگزشت

مرغزاروں میں، چمن زاروں میں، کہساروں میں — چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شبِ تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں — شبِ مہتاب کی مہکی ہوئی رعنائی میں
شفقِ شام کی رنگینی و سرشاری میں — صبحِ پُرکیف کے انوار کی بیداری میں
حسنِ معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے

دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی — نہ گئی دل کی تپش شعلہ فشانی نہ گئی
تیر پر تیر برستے رہے مجھ پر برسوں — سنگدل دور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
پرسشِ غم بھی سہی، رنج و محن بھی دیکھے — رہِ الفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے

بزمِ امکاں میں رہا ظلمتِ باطل کا ہجوم — چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم
ہیبتِ اہرمنی چار طرف طاری تھی — مردِ حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لیے خنجرِ خونخوار کہیں — زہر کا جام کہیں، نار کہیں، دار کہیں
پرچمِ حق و صداقت کو اٹھایا میں نے

اثر صہبائی

سولھویں سالگرہ

ہر نقشِ پا ہے غیرتِ صد لالہ زار آج!
قدموں میں اُس کے لوٹ رہی ہے بہار آج

طرزِ خرام دیکھ کے اُس مستِ ناز کا!
کھاتی ہے غش نسیمِ چمن بار بار آج

ہر ذرۂ حقیر ہے دلکش بجائے خود!
لیلائے دہر پر ہے غضب کا نکھار آج

چھایا ہوا ہے فرش سے تا عرش اک سکوں!
ٹھہری ہوئی ہے گردشِ لیل و نہار آج

آیا ہے گھر کے ابرِ سیہ سوئے میکدہ!
اُمڈی ہوئی ہے رحمتِ پروردگار آج

سرشار ہیں حباب تو گرداب رقص میں
بہکی ہوئی ہے موجِ لبِ جوئبار آج

مستی بھری ہوا میں اثر ہے شراب کا
ہر چیز کائنات کی ہے بادہ خوار آج

ساقی کی چشمِ مست کو تے ریز دیکھ کر
بدلی ہوئی ہے نیتِ توبہ شکار آج

چلمن سے جیسے جھانک رہی ہو کوئی پری
یوں خار و خس سے پھوٹ رہی ہے بہار آج

بادِ چمن ہی کیا ہے گل افشان، عطر بیز!
موجِ ہوائے دشت بھی ہے کیف بار آج

جشنِ طلوعِ صبح نہیں اک ترانہ خیز!
بزمِ سکوتِ شام بھی ہے نغمہ زار آج

ایک ایک رگ سے خونِ بہاراں اُبل پڑے
پھولوں سے ہو نسیم اگر ہم کنار آج

ہے ہر نگاہ حسن کا پہلو لیے ہوئے
خود اک دلہن بنا ہوا ہے انتظار آج

جیسے کنول میں روپ دکھاتی ہے لکشمی
یوں ڈبڈبائی آنکھ میں ہے حسنِ یار آج

وہ عشق جس کی شان تھی آشفتہ خاطری
مشاطگی کو حسن کی ہے بے قرار آج

طغریٰ کشِ جمال ہیں قرآں کی آیتیں
یا دوش پر ہے سلسلۂ مشکبار آج

حل کر دیا ہے عنبر سارا شراب میں
یا مست انکھڑیوں میں رچا ہے خمار آج

حوریں ہیں محو دید جھروکوں سے خلد کے
اُس نقطۂ عروج پہ ہے حسنِ یار آج

اک نغمۂ نشاط سے مملو ہے کائنات
شورِ طیور وہ ہے سرِ شاخسار آج

اک ماہوش کے جشنِ جوانی کا زور ہے!!
پورے کیے ہیں عمر نے سولہ سنگھار آج!!

سروش عسکری طباطبائی لکھنوی

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز راں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی، کراچی اور کلکتہ سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

گذشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی

بمبئی اور کراچی سے عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔

تفصیلات کے لئے خط وکتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں. ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سوسال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے۔ وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اسکے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر جنا بلڈنگ لکھنؤ

اشتہار حاضری مدعی علیہ مرتبہ عدالت دیوانی منصفی تعلقہ کلم ضلع عثمان آباد واقع امرداد ۱۳۵۱ف
نمبر مقدمہ (۵۵/۱) بابتہ ۱۳۵۱ف یا جلاس مولوی حفظ الکبیر خانصاحب ایم اے ایل ایل بی
ایچ سی ایس منصف

مدعیان۔ بھگوانداس وکشن لال ولدان فتح چند مارواڑی ساکنہ کلم تعلقہ کلم۔
بنام مدعی علیہا پھولا بائی زوجہ بالمکند قوم مارواڑی عمر ۴۰ سال ساکنہ کلم تعلقہ کلم
دعوے۔ زرنقد (ما ۱۲۵) روپیہ سکہ عثمانیہ

بنام پھولا بائی زوجہ بالمکند قوم مارواڑی عمر ۴۰ سال پیشہ خانہ داری ساکن کلم تعلقہ کلم ضلع عثمان آباد
ہرگاہ مقدمہ ہذا میں تمہارے نام متعدد مرتبہ سمن اجرا کئے گئے لیکن تمہارا پتہ وصحیح سکونت نہ ہونے سے سمن بلا تعمیل واپس ہوتے لہذا فذریعہ اشتہار ہذا تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تم بتاریخ ۱۳ مہر ۱۳۵۱ف یوم چہارشنبہ بوقت دس بجے اصالتاً یا وکالتاً اجلاس عدالت ہذا حاضر ہوکر جوابدہی وپیروی کرو ورنہ کارروائی تمہارے خلاف ہوگی پھر کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۱ امرداد ۱۳۵۱ف میری دستخط اور مہر عدالت کے جاری کیا گیا۔ فقط

دستخط صیغہ دار — دستخط سررشتہ دار

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

ترجمان سرحد (پشاور)

۱- جنوری ۱۹۱۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے شائع ہوتا ہے۔

۲- آزادیٔ وطن کا داعی اور اسلامی حکومت کا نگہبان ہے

۳- صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاست کا آئینہ ہے

۴- سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد اور ہندوستان کی قومی تحریکات کا ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔

سرحدی مقامات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بنکر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد و افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار پسندوں کے لئے تشہیر کا بہترین ذریعہ ہے۔ چندہ سالانہ (للعہ ر) ششماہی (چار) ۔ منیجر ترجمان سرحد پشاور

دنیا بھر میں اسلامی خدمت بجا لانیوالا ماہوار میگزین

ریویو آف ریلیجنز (انگ)

جو ۱۹۰۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور ہر ماہ کی دس تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور جو غلطیاں اور غلط فہمیاں دیگر مذاہب نے اسلام کے متعلق پھیلائی ہیں ان کو دور کر کے اس عالمگیر مذہب کو اصلی رنگ میں پیش کرنا اور دیگر مذاہب پر تحقیقی تبصرہ اور موجودہ زمانے کے فلسفیانہ اور مذہبی رجحانات پر نظر رکھنا ہے۔

چندہ سالانہ صرف چار روپے (للعہ)

نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہے۔

دفتر ریویو آف ریلیجنز انگریزی

قادیان (پنجاب)

خالد کشمیر

اخبار خالد کشمیر میں واحد پرچہ ہے جو وسیع ترین اشاعت رکھتا ہے۔ اس پرچہ کی سنجیدگی اور مقبولیت کی وجہ سے تمام اور اہل علم لوگ اس کے ناظرین کی فہرست میں شامل ہیں۔ ریاست کے تمام جج منصف، کلکٹر اور دیگر بڑے بڑے عہدہ دار "خالد" کا مطالعہ پابندی سے کرتے ہیں۔ "خالد" کی گوناگوں خصوصیات کے باعث اس پرچہ کو ریاست کے محکمہ تعلیم کے صاحب نے ریاست کے تمام اسکولوں۔ لائبریریوں کے لئے منظور فرمایا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں خالد تجارتی مال و اشیاء کے لئے بہترین ذریعہ تشہیر ہے۔ ریاست میں تجارت کو فروغ دینے کیلئے خالد سے بہتر ذریعہ ممکن نہیں۔ اجرت اشتہار بہت کم اور واجبی ہے۔ اس لئے آپ سے التماس ہے کہ آپ اپنی فرموں اور تجارتی مال و اشیاء کا اشتہار سری نگر میں دیکر اپنی تجارت کو بڑھائیں۔ منیجر شعبہ اشتہارات "خالد" سرینگر کشمیر

"ندیم"

صوبۂ بہار کا سب سے دیرینہ سال ماہنامہ

ادبیات عالیہ کا مخزن

اُردوئے معلّٰی کی خدمت میں گیارہ سال سے مصروف!

زمانہ کی اچھی اصلاحوں کا حامی

ملک کے مایہ ناز اہل قلم کی بہترین نظم و نثر کا دیدہ زیب مجموعہ، ہر مہینہ کی پہلی کو باقاعدگی کے ساتھ شائع ہونیوالا مجلہ، مالیات کی طرف سے مستغنی! اس لئے اعتماد کا سزاوار رسالہ۔

مدیر:- سیّد حسن امام

قیمت سالانہ صرف چار روپئے (للعہ)

منیجر دفتر ندیم گیا۔ (صوبہ بہار)

خدمت سرینگر

ت کشمیر کا بہترین ہفتہ وار جریدہ ہے جس کا طریقہ کار اور لائحہ عمل نہایت ترقی پسندانہ ہے۔
ت سیاسیات کشمیر کا بیباک ترجمان اور ذمہ دار نظام حکومت کے قیام کا مبلغ ہے۔
ت، اردو زبان کی خدمت کرنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بلند پایہ ادیبوں کے رشحات قلم اشاعت پذیر ہوتے ہیں۔
یہ مطبوعات پر فاضلانہ تنقیدیں لکھی جاتی ہیں۔ خدمت کا حلقہ اشاعت بہت وسیع ہے اور ریاست جموں و کشمیر کے شہر و
ردور دراز دیہاتوں تک اسکی رسائی ہے۔ خدمت صلح کل پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور بودھوں وغیرہ
رقوں میں یکساں ہر دلعزیز اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ خدمت کو پڑھنے والوں کے زمرہ میں حکومت کے وزراء، ہائی کورٹ اور دیسری
ل کے جج تعلیمی مدارس کے ہیڈ ماسٹر۔ تجار، صناع۔ رہنمایان ملک، کارخانوں کے مزدور اور دیہات کے کسان بھی شامل ہیں۔
ت میں اشتہار دینا تجارتی مال کی شہرت کو چمکانے کا بہترین ذریعہ ہے اشتہارات کے نرخ نامہ کی تفصیلات چٹھی لکھکر منگائیے۔

ہفتہ وار خدمت امیرا کدل سرینگر


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس ۳ قیمت سو گولیاں بڑا بکس ۱۰
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک منشن دہلی گیٹ دہلی

اگست کی مطبوعات

ماہ اگست میں حسب ذیل کتابیں شائع ہو رہی ہیں :-

تعلیمی خطبات ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کے خطبوں اور مضامین کا مجموعہ موجودہ تعلیم کے عام نقائص، مفید تجاویز، جدید تعلیمی رجحانات اور تعلیم و تربیت کے جدید اصول معلوم کرنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

طریقۂ تعلیم عام اسے ٹریننگ اور نارمل اسکولوں کے زیر تربیت اساتذہ کی ضروریات کو مدنظر رکھکر لکھا گیا ہے۔ پڑھانے کے عام طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ بچوں کی نفسیات، ہندوستان کے مخصوص حالات اور اُستادوں کی عام دشواریوں کو تصنیف کے وقت پیش نظر رکھا گیا ہے۔

ابتدائی معلومات کا سلسلہ ابتدائی اسکول کے بچوں کی عام معلومات کے لیے مکتبہ نے ابتدائی معلومات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ذیل کی چار کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی ہیں :-

۱۔ بجلی اور مقناطیس کے کھیل۔ ۲۔ بجلی کی کہانی۔ ۳۔ مقناطیس کی کہانی۔ ۴۔ صحت صفائی (حصہ دوم)

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

شعلۂ طور

ہجوم تجلّی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

حضرت جگر کا مجموعۂ کلام شعلۂ طور، عرصہ سے ختم ہو گیا تھا۔ اب مکتبہ نے اس کا چوتھا ایڈیشن نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

"ہم میں سے جن لوگوں نے جگر کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا عام نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جگر عشق و محبت کی نہایت دلکش اور لطیف کیفیات کا ترجمان ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر عمومیت سے دیکھا جائے تو جگر کی شاعری کو حیات اور حقائق حیات سے گہرا تعلق ہے۔ ...... جگر کی شاعری نغمۂ و نشاط کی دنیائے امروز کا مستقل نصب العین بن چکی ہے۔ ان کے اشعار میں وجدان، وجدان کے ساتھ حقیقت کی نمود اور حقیقت بھی بہ انداز نغمہ خاص طور پر نمایاں ہے۔ ...... جگر صاحب کی شاعری کا امتیاز انداز بیان کی رنگینی بانکپن شوخی، سرمستی اور تنوع سے ہے۔" (مدینہ یکم فروری ۱۹۳۶ء)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

ادبیاتِ عالیہ

دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) غالب کا گمشدہ دیوان۔ مرزا غالب مرحوم کے اردو دیوان کا یہ جدید قلمی نسخہ سو برس کے بعد ملک کے سامنے آیا۔ اس میں ان کے وہ شہ پارے بھی ہیں جنھیں انھوں نے حذف کر دیا تھا۔ قیمت بلا مقدمہ مجلّد للعہ ر۔ قیمت مع مقدمہ صہ ر

دیوانِ غالب۔ مطبوعہ مطبع کاویانی برلن۔ غالب کی سہ رنگی تصویر۔ قیمت قسم اول عہ ر
قیمت قسم دوم عا ر قسم سوم عہ ر

شعلۂ طور۔ حضرت جگر مرادآبادی کے مجموعۂ کلام کا چوتھا ایڈیشن۔ قیمت ےہ ر

گفتارِ بیخود۔ افتخار الملک مولانا بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ دہلوی کا مجموعۂ کلام۔ پرانی شراب نئے شیشوں میں بھری ہوئی۔ قیمت مجلّد ےہ ر

دیوانِ ثاقب۔ حضرت ثاقب لکھنوی کی مجموعۂ کلام کی رنگینی اور مضمون آفرینی کا بہترین تحفہ۔ عہ ر، عا ر

دیوانِ شیدا مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مطبع کاویانی برلن۔
قیمت قسم اول عہ ر قسم دوم عا ر

انتخابِ میر۔ باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا ÷ پڑھتے کسی کو سنیے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا۔ ۱ر

انتخابِ سودا۔ صبا سی ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے ÷ چمن میں آہ گلچیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا۔ ۱ر

انتخابِ حسرت۔ سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم ÷ ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم۔ ۱ر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی نمبر ۳

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۷ - نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

اُردو اکاڈمی

"جامعہ ملیہ دہلی کی "اُردو اکادمی" نے علمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ عام ضرورتوں کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور علاوہ علمی کتابوں کے عام دلچسپی کی کتابیں اور بچوں کے کام کی کتابیں اچھی تعداد میں سلیقے سے شائع کی ہیں اور اس طرح اُردو کے ادبی خزانے میں مفید اضافہ کیا ہے۔"

(ماخوذ از خطبۂ صدارت آل انڈیا اورینٹل کانفرنس شعبۂ اردو ۴۱ء)

مولانا محمد سورتی مرحوم

علی گڈھ سے خبر ملی ہے کہ جامعہ کے پرانے استاد اور عربی زبان کے مشہور ادیب مولانا سید محمد سورتی صاحب انتقال فرما گئے۔ موصوف کو ادھر چند برسوں سے استسقار کا عارضہ تھا۔ پچھلے دنوں معلوم ہوا تھا کہ اب ان کی صحت اچھی ہے لیکن پھر یکایک اطلاع آئی کہ مولانا نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔

مولانا محمد سورتی صاحب کے انتقال سے عربی علم و ادب کی دنیا کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ عربی ادب میں تو موصوف کے پایہ کا ہندوستان تو کیا شاید ساری عربی دنیا میں کوئی عالم نہ تھا۔ مرحوم کا مطالعہ وسیع تھا اور نظر بڑی دقیق۔ عربی زبان کی شاید ہی کوئی قابل لحاظ تصنیف ہوگی جو مولانا کی نظر سے نہ گذری ہو۔ موصوف صرف کتابی عالم نہ تھے بلکہ صاحب تحقیق بھی تھے۔ عربی ادب پر اس کو کلی احاطہ تھا جاہلی اور اسلامی دور کے تمام مشہور شعرار کے ہزارہا اشعار زبان زد تھے۔ مرحوم کا شعر کا مذاق بڑا پاکیزہ تھا اور ہمیشہ بڑے اصرار سے شاگردوں کو اپنی پسند کے شعرار کا کلام پڑھاتے۔ اور مطلق اس کی پروا نہ کرتے کہ مدرسے کے مجوزہ نصاب میں وہ حصہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ پڑھاتے پڑھاتے اگر کوئی غیر معمولی عمدہ شعر آجاتا تو مولانا اچھل پڑتے اور بار بار جھوم جھوم کر اسے دہراتے اور اتنے محظوظ ہوتے کہ طالبعلم بے ساختہ اس شعر کی داد دینے لگتے۔ مولانا کو علم حدیث سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ بخاری کے رجال پر بڑی بصیرت سے محاکمہ کیا کرتے تھے۔ موصوف مذہباً اہل حدیث تھے لیکن اصولِ فقہ پڑھنے کی بڑی تلقین فرمایا کرتے۔ اندلس کے مشہور ظاہری عالم ابن حزم سے مرحوم کو بڑی عقیدت تھی۔ اور ایک زمانے سے ان کے متعلق عربی میں ایک ضخیم کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ عام طور پر اور اہل حدیث علمار کے خلاف وہ ابن تیمیہ کے زیادہ کے معتقد نہ تھے۔ دراصل مولانا کا مسلک قدیم علمار اہل حدیث کا تھا۔ جو قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ تقلید و عدم تقلید اور فقہ و حدیث کی لفظی بحثوں سے ان کا دامن علم الگ رہا۔

سچ تو یہ ہے کہ حدیث اور علوم دینیہ سے مولانا کا شوق ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ موصوف کا اپنا مضمون تو عربی ادب تھا چنانچہ عربی ادب ساری عمر ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ادب میں مولانا کا اپنا ایک خاص مسلک تھا۔ خالص اور بے میل عربی زبان کے وہ عاشق تھے، شعر کو وہ شعر ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ شعر میں معمے اور پہیلیاں کہنے کے وہ سخت خلاف تھے اسی لئے عہد جاہلیت کے شعرا کا کلام ان کو سب سے زیادہ پسند تھا، اور ان میں بھی جو شاعر صحرائی اور بدویانہ زندگی میں زیادہ رچا ہوا ہوتا، مولنا کا ربط اس سے اور بھی زیادہ ہوتا۔ عہد امویہ کے شعرا کو بھی وہ غنیمت مانتے تھے، اور عباسیوں کے ابتدائی عہد کے شروع شروع کے شعرا بشار اور ابونواس وغیرہ کو بھی وہ پڑھنا منظور کر لیتے تھے لیکن بعد میں ادب کے تکلف و تصنع کے دور کے اہل علم اور ارباب شعر کی تصنیفات کو پڑھانا وہ کبھی گوارا نہ کرتے۔ صرف و نحو اور معانی و بلاغت کے علوم میں بھی ان کا نظریہ سادگی پسند تھا۔ وہ تکلف اور پیچیدگی کو خواہ وہ شعر میں ہو یا نثر میں، نحو کے قاعدوں میں ہو یا استعاروں اور تشبیہوں کی قسموں میں دل سے ناپسند کرتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ مولنا مرحوم کو عام طور پر رجعت پسند سمجھا جاتا تھا اور ان کا سارا ذخیرۂ علم بھی زیادہ تر قدیم طرز کا تھا۔ لیکن اس کے باوجود موصوف کا ادب و شعر کا مذاق عہد حاضر کے مصری اور شامی ارباب نقد سے بہت کچھ ملتا تھا۔

راقم الحروف کو دوران قیام مصر عربی زبان کے سب سے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین عمید جامعہ مصریہ کے لیکچروں کے سننے کا اتفاق ہوا جو وہ جامعہ اور بیرون جامعہ میں اکثر دیا کرتے تھے میری حیرت کی انتہا نہ پوچھئے جب میں نے تجدید و تفرنج کے اس امام کو جو پیرس یونیورسٹی کا ڈاکٹر ہے اور اپنی قدامت دشمنی کی وجہ سے بہت بدنام ہے، ادب و شعر اور علوم معانی و بلاغت اور صرف و نحو کے متعلق کم و بیش وہی باتیں کہتے سنا جو دو برس پہلے ہندوستان میں مولنا سورتی جیسے قدامت پسند اور بقول شخصے "کٹ ملا" سے جامعہ ملیہ کے درسوں میں سن چکا تھا۔

مولنا کا وطن سورت تھا۔ صغر سنی میں علم کی کشش انھیں دہلی کھینچ لائی۔ مرحوم کبھی کبھی شاگردوں کو اپنے بچپن کے حالات سنایا کرتے فرماتے تھے کہ "ہم توکل بخدا دہلی کے ارادے سے گھر سے

ئل پڑے۔ زادِ راہ ہمارے ساتھ صرف اللہ کا نام تھا۔ سورت سے دہلی تک کا اکثر راستہ پیدل پا
ے گیا۔ دہلی پہنچے تو ایک مدرسہ میں جگہ مل گئی۔ ان دنوں کتابیں خریدنا ہماری بساط میں نہ تھا ہم یہ کرتے
اُس کتاب کی ضرورت پڑتی اس کی نقل کر لیتے۔ اور اکثر تو کتابیں ہمیں ازبریاد ہو جاتی تھیں۔ اس
زمانہ میں چاندنی چوک میں سے نہر بہتی تھی۔ اور اسٹیشن کے پاس کی زمین میں سایہ دار درخت
کثرت سے تھے۔ ہم سارا سارا دن درختوں کے نیچے مطالعہ میں گزار دیتے۔ پڑھنے سے جی اکتا تا تو دریا
پر تیرنے چلے جاتے۔ چنانچہ تیرنے میں ہمیں اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ بھرے دریا میں تیرا کرتے تھے:
مولانا کہتے تھے کہ اوّل اوّل برسوں تک ہم پڑھا کئے۔ ہم محنت سے اپنے سبق بھی یاد کر لیتے۔
اور کتابیں کی کتابیں بھی ہمیں حفظ یاد ہو جاتیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم یہ سب ایک فرض سمجھ کر
کیا کرتے تھے، علم کی لذت جو ہمیں بعد میں حاصل ہوئی اس سے ہم شروع میں عرصہ تک بے بہرہ
رہے۔ بعد میں جب کامل استادوں سے پڑھا تو پھر محسوس ہوا کہ علم کی لذت کیا ہے اور
اس میں کیا لطف ہے۔"

مولانا نے دہلی، ٹونک اور رام پور کے مدرسوں سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن ان کے فضل و کمال
کا زیادہ تر حصہ ان کے اپنے ذاتی مطالعہ اور شب و روز کی محنت کا ہے۔ ایک زمانہ میں موصوف حکیم اجمل خاں
صاحب مرحوم کے ہم سبق بھی رہ چکے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم مولانا کی علمیت کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ
۱۹۲۰ء میں جب علی گڑھ میں جامعہ کی بنا رکھی گئی تو حکیم صاحب کے بلانے پر مولانا جامعہ میں تشریف
لائے اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم ان کے سپرد کی گئی۔ مولانا جامعہ میں سب کے مخدوم و محترم تھے۔ ان
کے شاگرد تو ان کی عزت کرتے ہی تھے لیکن دوسرے طلبا اور اساتذہ بھی ان کی بزرگی کا بڑا خیال رکھتے،
مولانا بڑے سخت متشرع تھے۔ اور عام نشست و برخاست اور وضع قطع میں ذرا سی بھی بے راہ روی
ان کو کھلتی تھی چنانچہ اکثر مولانا ایسی باتیں دیکھ کر بگڑ جاتے اور اپنا ڈنڈا اٹھا لیتے۔ جامعہ کے خورد و کلاں
ان کی طبیعت سے واقف تھے چنانچہ مولانا کے عتاب پر ان کی گردنیں جھک جاتیں۔ اور انھیں
آئندہ احتیاط کا وعدہ کرتے بنتی۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ سب کے سب مولانا کی باتوں کا برا نہیں

مانتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مولانا صاف دلی سے سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کردہات کو دل سے ناپسند کرتے ہیں اور چونکہ وہ سب جامعہ والوں کو اپنا سمجھتے ہیں اس لئے برملا اور بے دھڑک کہہ دیتے ہیں اس پر نخوت یا تکبر کی بو نہ ہوتی تھی، اور نہ کسی پندار زہد کا مظاہرہ، یوں بھی مولانا بڑے خوش طبع تھے، چھوٹے بڑوں سے گھل مل جاتے، ہر ایک سے اپنایت برتتے، اور جامعہ کی برادری میں وہ یوں معلوم ہوتے تھے کہ گویا وہ بزرگ خاندان ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ جامعہ والے ان کو یوں مانتے بھی تھے۔

جامعہ جب دہلی آئی تو کچھ عرصہ کے بعد بعض مجبوریوں کی بنا پر انھیں جامعہ سے الگ ہونا پڑا وہ مجبوریاں ایسی تھیں کہ ان کا مداوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مولانا دل سے نہیں چاہتے تھے کہ وہ جامعہ سے جائیں، اور نہ جامعہ والوں کو مولانا کی علیحدگی گوارا تھی لیکن حالات پر کسی کا زور نہیں ہوتا مولانا جامعہ سے چلے گئے۔ لیکن جامعہ کو بھولے کبھی نہیں، جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے جامعہ میں ضرور آتے، ہفتوں، مہینوں یہاں ٹھہرتے، اور ان کے آنے کے ساتھ جامعہ میں پھر پچھلی صحبتیں تازہ ہو جاتیں، مولانا کی وہی ڈانٹ، ڈپٹ، برہمی اور عتاب اور ان کے شاگردوں کا جواب خیر سے جامعہ میں استاد بن چکے ہیں نیازمندی میں آنکھیں نیچی کرلیتا اور گردن جھکا لیتا۔ مولانا کی ذات بڑی بابرکت ذات تھی، ان کے اٹھ جانے سے علم وادب کو جو صدمہ ہوا وہ تو ہوا لیکن جامعہ کی برادری کو بھی ان کے گزرنے سے کچھ کم نقصان نہیں پہنچا۔ مولانا کی ذات ایسی تھی جس کی ہم سب عزت کرتے تھے، ایسے شخص جماعت میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے کسی کے جانے کا صدمہ واقعی بڑا جانکاہ ہوتا ہے۔

مولانا نے کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں چھوڑی۔ وہ مطالعہ میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ تصنیف کے خیال کی انھیں کبھی فرصت نہ ملی۔ معلومات کا ذخیرہ اتنا وسیع تھا کہ اسے سمیٹنے کی اور اسے ترتیب دے کر کتاب کے قالب میں ڈھالنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ابن حزم پر انھوں نے کچھ لکھا تھا۔ لیکن شاید ہی اُسے کوئی شائع کرے، لیکن مولانا کا قابل فخر کارنامہ ان کی مشہور کتابوں کی تصحیح ہے جن میں سے بعض حیدرآباد سے چھپ چکی ہیں، مرحوم قدیم کتابوں کے

ے پرکھنے والے تھے۔ جامعہ میں آنے سے پہلے ان کا یہی مشغلہ تھا، پرانی کتابوں کی تلاش میں وہ
کتب خانوں کو چھانتے پھرتے اور اگر کہیں انھیں کوئی نادر چیز مل جاتی تو اسے حاصل کرتے، اسے
لکھے بھلتے، اس کی تصحیح کرتے، چنانچہ بڑے بڑے معاوضہ پر سرکاری کتب خانے ان سے یہ
نادر نسخے خریدتے تھے، مولانا کا اپنا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں امید ہے بڑی نایاب اور
نادر کتابوں کے نسخے ہوں گے۔ مولانا کو کتابوں سے عشق تھا، اچھی کتاب کے حاصل کرنے
میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

الغرض مولانا ایک خوش طبع اور زندہ دل بزرگ تھے۔ اور عربی کے ایک بے نظیر عالم اور
فن علم کے سچے عاشق اور قدیم اسلامی تصنیفات کے بہترین ناقد اور واقف کار۔ ان کمالات
کے حامل اب کہاں ملتے ہیں۔ اس لئے مولانا ایسے بزرگ اور عالم کا انتقال صحیح معنوں میں ایک
ناقابل تلافی نقصان ہے۔ کسی نے کتنا ٹھیک کہا ہے۔ موت العالِم موت العالَم (صاحب علم کی
موت ایک عالَم کی موت ہے)

محمد سرور، استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ

دیوانِ غالب (اُردو) کے ابتدائی مطبوعہ نسخے

رسالہ جامعہ کے مئی سنہ رواں کے شمارے میں ایک مضمون فریدآبادی صاحب کا بعنوان "دیوانِ غالب اردو کا ایک نایاب نسخہ" شایع ہوا ہے۔ صاحبِ مضمون نے بڑی کاوش اور جستجو سے اسے مرتب کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنے پیشروؤں کی ساری غلط فہمیوں کو دور کر دیں۔ مگر اس سلسلے میں خود موصوف کو بھی بعض غلط فہمیاں ہوئی ہیں جو واقعات کے قطعاً خلاف ہیں اور اس لیے ان کی بابت کچھ عرض کر دینا ضروری ہے تاکہ یہ مرض متعدی نہ ہو جائے۔

حقیر عرشی نے "انتخاب غالب" کے لیے ایک دیباچہ مرتب کیا تھا اور اس میں میرزا صاحب کے بیانوں کی روشنی میں ان کی شعر و شاعری سے متعلق مفصل و مکمل بحث کی تھی موجودہ جنگ کے برکات نے مجبور کیا کہ کاغذ دستیاب نہ ہونے کی باعث اس مقدمے کی طباعت کو ملتوی کر دیا جائے۔ اس مقدمے کا وہ حصہ جو طباعت دیوان سے متعلق ہے زیر بحث مسئلے پر برہانِ قاطع ہے اس لیے میں اسے معمولی تغیر کے ساتھ شایع کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

چونکہ اس مضمون کے پڑھنے سے فریدآبادی صاحب، مالک رام صاحب اور اکرام صاحب کے شکوک و شبہات کا از خود ازالہ ہو جاتا ہے اس لیے میں نے ان حضرات کے نام لینے اور ان کے اقوال نقل کر کے تردید کرنے سے احتراز کیا ہے امید ہے کہ یہ سب محققین اس جسارت کو معاف فرما دیں گے اور ناظرین فریدآبادی صاحب کے خلاصہ کو جو آخر مضمون میں انھوں نے لکھا ہے ذہن نشیں کر کے اس مضمون کو ملاحظہ کریں گے۔

آخر تمہید میں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ "انتخاب غالب" خود مرزا صاحب کا خود کردہ انتخاب کلام فارسی و اردو ہے۔ صورت یہ در پیش آئی تھی کہ نواب خلد آشیاں نے اساتذۂ فارسی و اردو کے منتخب اشعار کی بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا

تھا اور اسی سلسلے میں مرزا صاحب سے فرمایش کی تھی کہ وہ اپنے کلام کا خود انتخاب کرکے بھیج دیں۔ ستمبر ۱۸۶۶ء میں مرزا صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل میں دیوان فارسی اور دیوان اردو کا انتخاب کچھ خود لکھ کر اور زیادہ دوسروں سے نقل کرا کے ارسال کیا تھا جو کتاب خانے میں موجود تھا۔

مکاتیب غالب میں اس سلسلے کی پوری مراسلت شایع ہو چکی ہے۔ اس جگہ حاشیہ میں یہ خیال بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کہ عنقریب اس انتخاب کو چھاپا جائے گا چنانچہ اس ارادہ کی بحمد للہ تکمیل ہو چکی ہے اور زیادہ سے زیادہ آیندہ دو ماہ کے اندر یہ نسخہ بازار میں آ جائیگا چونکہ اس سے ہمیں یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ آخر عمر میں مرزا صاحب کا ذوق شعر کیا تھا اور وہ اپنے کون کون سے اشعار کو پسند کرتے تھے اسی بنا پر اس کتاب کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے لازم ہوگا جو مرزا صاحب پر کوئی کام کرنا چاہتا ہے یا مرزا صاحب کے خود چنے ہوئے اشعار کو پسند کرنے کی طرف مائل ہو۔

امتیاز علی عرشی

طباعت دیوانِ اردو

جس طرح مرزا صاحب کی شعرگوئی کا آغاز ریختہ سے ہوا ہے اسی طرح طباعتِ دواوین میں بھی دیوان ریختہ کو تقدم حاصل ہے یہی دیوان ان کی زندگی میں بار بار چھپ کر شایع ہوتا رہا اور آج تک برابر چھپ رہا ہے۔

ان ایڈیشنوں میں سے ان نسخوں کا ذکر تاریخی حیثیت سے زیادہ مفید اور دلچسپ ہوگا، جو مرزا صاحب کی زندگی میں خود ان کی ایما سے شایع ہوئے تھے۔ جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے مرزا صاحب کی زندگی میں ان کا اردو دیوان چار بار چھپ کر شایع ہوا ہے یہ چاروں ایڈیشن آج بھی کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔

پہلا ایڈیشن | ان میں سے پہلا نسخہ مطبع سید الاخبار دہلی میں چھپ کر شایع ہوا تھا مرزا صاحب نے

ختم طباعت سے کچھ پہلے میجر جان جاکوب کو لکھا تھا[۱]

"نہاں نماناد کہ نقش مطبع سید الاخبار انگیختۂ طبع یکے از دوستان روحانی منست ہمانا کارفرمائے
ایں نو آئین کدہ، ایں می سگالد کہ دریں کارگاہ نقشہائے مہیج انگیزد و فرو ریختہائے خامۂ غالب
بے نوا را بجامۂ انطباع فرو پیرد، وزاں جملہ دیوان ریختہ کہ در تمامی ناتمام است عجب
نیست کہ ہم دریں ماہ تمامی و آنگاہ بنظر گاہ سامی رسد۔"

یہ مطبع سر سید مرحوم کے بھائی، سید محمد خاں بہادر نے دہلی میں قایم کیا تھا اور سید المطابع یا مطبع
سید الاخبار کے نام سے مشہور تھا۔ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں اس مطبع سے میرزا صاحب
کا دیوان چھپ کر شایع ہوا۔ پبلک لائبریری رامپور میں اس اڈیشن کا ایک نسخہ محفوظ ہو جس کے سرورق
پر حسب ذیل عبارت اس طرح پانچ سطروں میں لکھی ہو:۔

"دیوان اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص
مرزا نوشہ صاحب مشہور کا دہلی میں سید محمد خاں بہادر کے چھاپہ خانہ کے
لیتھوگرافک پریس میں شہر شعبان
۱۲۵۷ء ہجری مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ عیسوی کو سید عبد الغفور کے
اہتمام میں چھاپا ہوا"

صفحات کی تعداد ۱۰۸ ہے۔ آخر میں ایک ورق اور شامل ہے جس کے پہلے صفحے پر ۱۵ غلطیوں کا
ایک غلط نامہ دیا گیا ہو مگر کاتب نے اس پر مسلسل یا نئے ہندسے نہیں ڈالے ہیں۔ ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں
ہیں ہر دو غزلوں کے درمیان کی ایک سطر کاتب نے سادہ چھوڑ دی ہو جس کے باعث سے
ہر صفحے میں مکتوبی سطریں پندرہ سے کم رہ گئی ہیں۔ کاغذ ایرانی وضع کا دیسی ہے، اس کا بنا ہوا ہو کتاب کا طول
عرض ۸ ۱/۴ × ۵ ۳/۴ انچ اور کتابت کا ۶ ۱/۴ × ۳ ۱/۲ انچ ہو۔ خط بہت معمولی نستعلیق ہو اور پوری کتاب
جدولوں سے خالی ہو

۱۔ پنج آہنگ

مضامین کی ترتیب یہ ہو۔

صا مہرنامہ (اس کی پوری عبارت نقل کی جاچکی ہی)

صا دسادہ ہی)

۳-۵ (دیباچۂ فارسی۔ اس کے آخر میں کوئی تاریخ نہیں ہی)

ص۵ سطر۴ "یا اسداللہ الغالب"

" سطر۵ غزلیات ردیف الف (لیکن یہ الفاظ نسخے میں محذوف ہیں، تعداد اشعار: ۲۲۹)

ص۲۱ ردیف الباء الموحدہ (تعداد اشعار: ۱۲)

ص۲۲ ردیف التاء المثناۃ الفوقانیہ (تعداد اشعار: ۱۹)

ص۲۰ ردیف الجیم المعجمۃ التازیہ (تعداد اشعار: ۴)

ص۲۹ جیم الفارسی (لفظ ردیف محذوف ہی۔ تعداد اشعار: ۶)

ص۲۹ ردیف الدال المہملہ (تعداد اشعار: ۸)

ص۳۰ ردیف الراء المہملہ (تعداد اشعار: ۳۹)

ص۳۳ ردیف الزاء المعجمہ (تعداد اشعار: ۲۰)

ص۳۵ ردیف السین المہملہ (تعداد اشعار: ۷)

ص۳۶ ردیف الشین المعجمہ (تعداد اشعار: ۲)

" ردیف العین المہملہ (تعداد اشعار: ۸)

ص۳۷ ردیف الفاء (تعداد اشعار: ۲)

" ردیف الکاف تازیہ (الف لام "التازیہ" محذوف ہی۔ تعداد اشعار: ۱۵)

ص۳۸ کاف فارسی (لفظ ردیف وغیرہ محذوف۔ تعداد اشعار: ۲)

" ردیف لام (الف لام محذوف۔ تعداد اشعار: ۹)

ص۳۹ ردیف المیم (تعداد اشعار: ۸)

ص۴۸ ردیف النون (تعداد اشعار: ۱۲۷)

ص۵۲ ردیف الواو (یہ عنوان پورا محذوف ہے تعداد اشعار: ۳۸)

ص۵۵ ردیف الہاء (تعداد اشعار ۳۰)

" ردیف الیاء (تعداد اشعار ۴۱۰ ہے لیکن اس ردیف میں کلکتے کی تعریف والے قطعے کے ۲ شعر سہواً چھپ گئے ہیں، اس لیے تکرار اشعار کو کم کرنے کے بعد صحیح تعداد: ۴۰۸ ہوتی ہے)

ص۹۴ سطر آخر "تمام شد غزلیات"

ص۹۵ "منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام" (تعداد اشعار: ۲۵)

ص۹۷ "انتخاب قصیدۂ منقبت علی مرتضیٰ علیہ السلام" (تعداد اشعار: ۲۳)

ص۹۹ س ۸ "قطعات"

ص۱۰۰ س ۵ "قطعہ در نمایشِ عنوان دلاویزی گفتار و آسان کردنِ اندوہِ پیدائی بر دلِ دلدا" (تعداد اشعار: ۲)

ص۱۰۰ "چمن سرمایہ کردن گفتار بستایش کلکتہ کہ اگر فردوس تواں گفت ارم است" (تعداد اشعار ۴)

ص۱۰۱ "بادوست از سپاس عطای ہدیۂ سخن راندن، و متاعِ گزیدۂ سخن در برابر آں افشاندن" (تعداد اشعار: ۱۳)

ص۱۰۱ س ۲ "رباعیات" (تعداد اشعار: ۲۰)

ص۱۰۳ س ۷ تقریظ (نوشتۂ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیّر)

یہ تقریظ "سنہ ہزار و دویست و پنجہ و چہار ہجریہ بود" (۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء) میں لکھی گئی ہے اور تعداد اشعار کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"یکی اشعار یعنی شمار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و نو دو ہشت اند یافتم"

لیکن سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید[۵] میں اس تقریظ کو نقل کرتے ہوئے ۱۲۵۴ھ کے

---

۵ کتاب مذکور باب ۴، ۱۵۵-۱۵۸، طبع اول ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نسخۂ صولت پبلک لائبریری، رامپور۔

...تعداد اشعار "یک ہزار ہفتاد و اند" درج کی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ترتیب دیوانِ ریختہ کے وقت
...کی کل تعداد ۱۰۷۲ سے کچھ اوپر تھی جب طباعت کے وقت اس میں اضافہ ہو کر کل اشعار ۱۰۹۰
...کچھ زیادہ ہو گئے تو تعداد میں ترمیم کر دی گئی۔ اصولاً یہاں تاریخ بھی بدلنا چاہیے تھی لیکن کسی وجہ
سے ایسا نہیں ہوا۔

اس عبارت کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ میرؔ نے اصل میں "ہزار و نود و اند" لکھا تھا۔ لفظ "ہشت"
کتاب کے چھپ جانے کے بعد کاتب یا مصحح نے اشعار گن کر اڑا دیا ہے۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ "اند"
بھی چند اکائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جب "ہشت" نے اکائی کی جگہ پُر کر دی تو اس لفظ کی ضرورت
باقی نہیں رہتی، اور بے ضرورت لفظ کا غلط استعمال میرؔ جیسے ادیب سے ناممکن ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ
اشعار کی یہ تعداد بھی درست نہیں کتاب میں کل اشعار ۱۰۹۵ ہیں۔ میرزا صاحب کے قطعہ:۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ... اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کے تین بیت حصہ غزلیات کی ردیف الیا میں سہواً کر چھپ گئے ہیں جس کے سبب سے میزان میں
۳ عدد کا اضافہ ہو کر حاصل ۱۰۹۸ نکلا ہے چونکہ میرؔ کے متعلق تصحیح کتاب میں حصہ لینے کا کوئی حوالہ نسخے میں
نہیں ہے اس لیے یہ حسابی غلطی بھی اُن کے سر تھوپنا نازیبا ہے۔

اس مطبوعہ نسخے کی ایک پرانی نقل کتاب خانہ عالیہ رامپور میں موجود ہے خوش قسمتی سے ناقل نے
سرورق کی عبارت سے شروع کر کے میرؔ کی تقریظ پر کتاب کو ختم کیا ہے صرف دیباچے کا ابتدائی حصہ
...ردیف یا کی کچھ غزلیں اصل کتاب کے اوراق گم ہو جانے کے سبب سے کم ہو گئی ہیں، خط شکستہ ہے اور اشعار کو
...س کے انداز پر لکھا گیا ہے کاتب نے بڑی احتیاط سے نقل کا فریضہ انجام دیا ہے اور اپنی طرف سے
کوئی کمی بیشی نہیں ہونے دی ہے اس لیے یہ ہو بہو نقل اصل مطبوعہ نسخے کے برابر اہمیت رکھتی ہے۔

دوسرا اڈیشن | اس کے چھ سال بعد مئی ۱۸۴۷ء میں نئے اشعار کے اضافہ کے ساتھ منتخب دیوانِ
ریختہ مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر شائع ہوا جس میں اس دیوان سے پہلے کلیات غالبؔ فارسی
...ن چھپ چکا تھا۔ دیوان اردو کے اس اڈیشن کے سرورق پر حسب ذیل عبارت چھپی تھی۔

" دیوانِ اردو تصنیف مشتری اوج حق پژوہی و خدادانی، رصد بند فلک البروج معارف سبحانی افصح فصحائے دوراں ہمتا بنشینِ شعرائے ہند و ایران و ہندوستان، دقاق غوامض و رموز سخن سنجی و نکتہ دانی، خلاق مضامین و معانی، سرآمد ارباب فضل و کمال، مہر سپہر نبالت و اجلال جناب مستطاب مع القاب، میرزا اسد اللہ خان بہادر دام القدیر کاتہم وحسنا تہم المتخلص بغالب و اسد، بہ تصحیح و مقابلہ جناب مصدر الدرج در مطبع دار السلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی جنیۂ اقل انعباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین احمد لکھنوی حلیۂ انطباع پوشید"

پہلے ایڈیشن میں اور اس نسخے میں ترتیب مضامین یکساں رہی مگر غزلوں کی ردیفوں کے عنوانات حذف کر دیے گئے اور قصاید کے عنوان کی عبارتوں میں بھی رد و بدل کیا گیا۔ چنانچہ پہلے قصیدہ کا عنوان یہ قرار پایا "افزایش آبرو دے گوہر سخن بہ ثنائے ابو الایمہ حضرت علی مرتضی علیہ التحیۃ والثناء" دوسرے کا عنوان رہا "ایضاً فی المنقبت"۔

تیر کی تقریظ میں تاریخ سنہ ۱۲۵۵ھ ہی رہی۔ مگر اشعار کی تعداد "یک ہزار یک صد و اند" بنا دی گئی گویا چھ برس کے اندر میرزا صاحب نے زیادہ سے زیادہ پانچ اور نو کل چودہ شعر کہے تھے جو اس نسخے میں بڑھا دیے گئے۔ دونوں ایڈیشنوں کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تجمل حسین خاں کی مدحیہ غزل جس کے ۴ شعر ہیں، اضافہ ہوا ہے۔ بقیہ اشعار جوں کے توں ہیں۔

یہ نسخہ ۱۰½ × ۷، ۸¼ × ۴¼ سائز کے ۱۵ سطری ۱۰۸ صفحوں پر چھپا تھا کاغذ بار یک انگریزی سفید اور خط معمولی نستعلیق تھا ہر غزل کے آغاز میں عنوان پر لفظ "غزل یا وله" لکھا گیا تھا۔

اس ایڈیشن کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ رجسٹرار صاحب دہلی یونی[ورسٹی] کی مہربانی سے یہ نسخہ کتاب خانے کو مستعار مل گیا تھا جس کی ہو بہو نقل اسی سائز اور اسی مسطر اور [اسی] املا میں کتاب خانے کے لیے کرائی گئی ہے مگر سوء اتفاق سے اس نسخے میں صفحات ۱۰۸ تا ۱۰۵ کم تھے۔ ا[س لیے] ہماری نقل میں بھی یہ کمی باقی رہ گئی ہے چونکہ ۱۸۴۷ء والے ایڈیشن میں اور اس ایڈیشن میں صرف ایک آخری غزل کی کمی بیشی ہے بقیہ حصہ یکساں ہے اور اس ایڈیشن کی نقل ہمارے پاس موجود ہے اسی

قلمی سے چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔

حال ہی میں رسالہ جامعہ کے ماہ مئی کے پرچے سے معلوم ہوا کہ سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

تیسرا ایڈیشن | مگر غدر کے پہلے ہی یہ ایڈیشن بھی بازار میں ختم ہوگیا چنانچہ نواب باندہ کو میرزا صاحب نے ۱۸۵۸ء کے لگ بھگ لکھا ہے۔

"دیوان فارسی و دیوان ریختہ و دیگر از نظم و نثر ہر چہ فرد ریختۂ کلک لاابالی خرام منست کافر باشم اگر یک ورق نزد من یا خود نسخہ ازاں من باشد۔ ہمہ ماں مسودہا بردند و فراہم کردند وجا بجا بکالبد طبع فرو ریختند و آنہا سوداگراں بردند و بشہرہائے دور دست فروختند بہ پذیرفتن فرمان مردماں را سوبسو گماشتم، رفتند و جستند دیوان فارسی و دیوان ریختہ وا جستند نیامد"

لیکن شہر کے بعض ذاتی کتاب خانوں میں اس کے نسخے محفوظ تھے جن سے بوقت ضرورت میرزا صاحب کام لیا کرتے تھے جیسا قاضی عبدالجلیل بریلوی کو ۲۹ اپریل ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں۔ ؎

"دیوان ریختہ چھاپے کا یہاں کہیں کہیں ہے اپنے حافظے پر اعتماد کر کر اس کو ہی دیکھا وہ غزل نہ نکلی۔"

غدر میں میرزا صاحب کے کلام کے قلمی نسخے جو میرزا حسین میرزا کے پاس تھے لٹ گئے ۱۸۵۷ء میں اس فتنے کے پیدا ہونے سے کچھ دن پہلے میرزا صاحب نے اردو کلیات کا ایک قلمی نسخہ نواب فردوس مکاں ناظم کو تحفے میں بھیجا تھا وہ رامپور کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ دلی کے بعض احباب کے پاس مطبوعہ نسخے کے علاوہ تازہ غیر مطبوعہ کلام بھی تھا۔ جسے انھوں نے حواشی پر درج کر لیا تھا چنانچہ اپریل ۱۸۵۹ء میں منشی شیو نرائن نے غالباً اخبار میں چھاپنے کے لیے میرزا صاحب سے کچھ اردو کلام طلب کیا اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۱۹ اپریل کو تحریر کیا ہے۔ ؎

"صاحب میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے؟ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں سب غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں

۱؎ آہنگ ۲۳۳۔ ۲؎ اردو: ۲۱۲؛ عود: ۱۶۶؛ خطوط ۱: ۱۱۵۔ ۳؎ اردو: ۳۶۹؛ خطوط ۱: ۳۹۳

کھتا ہوا نظر آجائے سے تو تم کو بھی لکھ بھیجا۔ ۔ ۔ ۔ ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان حجانے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے سودات متفرق بھی بہم پہنچا لیے ہیں چنانچہ "پنہاں ہوگئیں" یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں خط لکھ کر رہنے دوں گا جب اس کے پاس سے ایک دو غزل آجائے گی تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیجدوں گا"

منشی شیونراین اور انھیں جیسے مخلص تلامذہ اور احباب کی دلچسپی میرزا صاحب کے دیوان ریختہ کی سہ بارہ طباعت کا موجب ہوئی۔ اس کی تفصیل خود میرزا صاحب نے رامپور سے دہلی واپس جاکر اپریل سنہ ۱۸۶۶ء میں شیونراین کو اس طرح لکھی ہے[1]

میاں! دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو تب کچھ کلام کرو میں رامپور میں تھا کہ ایک خط بہ جیا سرنامہ پر لکھا تھا "عرضداشت عظیم الدین احمد متمقام میرٹھ" واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہرحال پڑھا معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فایدہ اٹھانے کے لیے مہیا یا چاہتے ہیں۔ خیر چپ ہو رہا جب میں رامپور سے میرٹھ آیا بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے یہاں اترا وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے انھوں نے کہا کہ اپنا اردو کا دیوان مجکو بھیجدیجیے گا عظیم الدین ایک کتاب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔

اب تم سنو! دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا۔ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیجدیا تھا اب جو دلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی نواب ضیاء الدین خاں صاحب نے مجکو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے اردو دیوان لے کر کسی کاتب سے لکھوا کر مجکو بھیجدینا۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیجدیا تھا۔

---

[1] اردو: ۳۸۱؛ خطوط: ۱: ۴۰۳-۴۰۴۔

۴مم برسرمدعائے سابق اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہ تو مجلائے یہ کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیجدوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے نواب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں۔ اب کہو میں کیا کرتا۔ دلی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہات نواب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیجدیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا، اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے اگر چھاپا شروع نہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیج جائے۔ اگر دیوان آگیا تو فوراً تمھارے پاس بھیجدوں گا اور اگر ہاں کاپی شروع ہوگئی ہے تو میں ناچار ہوں میرا کچھ قصور نہیں ہے اور اگر اس سرگزشت کو بھی سن کر مجھکو گنہگار ٹھیراؤ تو اچھا، میرا بھائی میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے یقین ہے کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرے پاس آئے اور تم کو بھیج جائے۔

سنی سنہ ۱۸۶۲ء تک یہ دیوان میرٹھ سے واپس نہیں آیا تھا۔ یوسف مرزا کو میرزا صاحب نے لکھا ہے۔[1]

"میرا اردو دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے مصطفیٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اس کی رسید آگئی۔"

بہ شنبہ ۱۱ر جون کو سیاح کو بگڑ کر لکھا ہے[2]

"دیوان کا چھاپا کیسا، وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا آدمی نہیں ہے بھوت ہے پلید ہے، غول ہے قصہ مختصر سخت نامعقول ہے مجکو اس کے طور پر یہ الطباع دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہات آجائے۔ تم دعا مانگو۔"

اس اثنا میں دیوان کا مسودہ میرٹھ سے واپس آگیا۔ ۲۵ر جون کو اس کا پارسل میرزا صاحب نے

---

[1] اردو: ۳۴۳ [2] خطوط: ۱/۱۷۰ – [3] اردو: ۱۶ –

شیونراین کو ارسال کرکے لکھا۔[1]

صاحب میں تمہارا گناہگار ہوں تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہو بڑی کوشش اور محنت سے اس کو واں نہ چھپنے دیا، منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہو تو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی کی مجھے اطلاع دو۔

یہ کتاب یعنی دیوانِ ریختہ تم کو میں نے دے ڈالا۔ اب اس کے مالک تم ہو۔ میں نہیں کہتا کہ چھاپو میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو۔ جو تمہاری خوشی ہو سو کرو۔ اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجکو لکھ لو۔ اور اچھا میرا میاں، ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو۔

اور عید کے دن ۳۰ جون ۱۸۶۱ء کو سیاح کو تحریر کیا۔[2]

"میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب ناانصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورچشم منشی شیونراین کو بھیجدیا یقین کلی ہو کہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔"

علائی کو اس خط کے دو دن بعد لکھا۔[3]

اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں۔ وہ آگرہ گیا ہو وہاں منطبع ہوگا۔[4]

شیونراین نے اس مسودے کی جامعیت میں شبہے کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۳ جولائی ۱۸۶۱ء کو لکھا۔[5]

"میاں، تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہو۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہو اتم و اکمل ہو وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں اور اس دیوان میں نہیں اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں۔"

کسی وجہ سے شیونراین نے اس کی طباعت میں تاخیر کی میرزا صاحب نے محمد حسین خاں تحسین

---

[1] خطوط: ۱: ۳۰۳، ۳۰۴۔ [2] اردو: ۲۶۱، ۲۶۲۔ [3] اردو: ۳۶۴؛ خطوط: ۱: ۲۲۱ [4] اردو [5] خطوط: ۱: ۳۰۵، ۳۰۴۔

اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ غالباً یہ مسئلہ نیّر کی سفارش پر طے ہوا اور انھیں نے اپنا مسودہ جس کی تکمیل نسخۂ رامپور سے کی جا چکی تھی عطا کیا۔ ورنہ میرزا صاحب کو اُن کے مطبع میں دیوان چھپوانے کی خواہش نہ تھی جیسا کہ خود انھوں نے اس نسخے کے خاتمۂ طبع میں لکھا ہے۔

۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (آخر جولائی ۱۸۶۱ء) کو یہ نسخہ ۸½ × ۴¾ انچ ناپ کے ۲۵ سطری مسطر پر ۸۰ صفحات میں طبع ہوا۔ اس کے شروع میں فارسی دیباچہ۔ اس کے بعد ص۳ سے ص۵۷ تک غزلیات اور اسی صفحے کی سولھویں سطر سے ص۶۷ تک قصائد ہیں۔ آموں کی تعریف والی مثنوی ص۶۷ کی بارھویں سطر سے ص۷۰ کے آخر صفحہ سے تیسری سطر تک ہے۔ اس کے بعد قطعات ہیں جو ص۷۳ کی دوسری سطر پر ختم ہو گئے ہیں۔ ان کے بعد ص۸۰ کی پہلی سطر تک رباعیاں ہیں۔ رباعیوں کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کی فارسی تقریظ ہے اس میں تاریخ بدل کر ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء اور تعداد اشعار "یک ہزار و شش صد و نود و پنج" اندراج کی گئی ہے چونکہ اصل میں الفاظ "نود و اند" تھے جن پر کاتبِ نسخہ نے لفظ پنج اپنی طرف سے بڑھا دیا تھا۔ اس بنا پر غلط نامے میں لفظ پنج کو حذف کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

لیکن اس مطبوعہ نسخے میں ۱۶۹۵ کے بجائے ۱۷۹۶ اشعار ہیں اس لیے قیاس یہ ہے کہ تقریظ کے اندر مذکورہ تعداد اس وقت ہو گی جب اس کی تاریخ بدل کر ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) کی گئی تھی نہ معلوم کیوں طباعت کے وقت یہ تاریخ اور تعداد دونوں بحالہا باقی رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ نسخۂ رامپور سے جو شعر بڑھائے گئے تھے اُن کی وجہ سے کل تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا جس کو تقریظ میں

۱؎ اس قیاس کی چند وجہیں ہیں پہلی یہ کہ نسخۂ رامپور کی ترتیبِ مضامین اس کے برخلاف ہے دوسری یہ کہ غزلوں کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے تیسری یہ کہ احمدی ایڈیشن میں لفظ کسی کی جگہ کسو لکھا گیا ہے جس کی خاتمے میں میرزا صاحب نے ہدایت بھی کی ہے اس کے برخلاف نسخۂ رامپور میں ہر جگہ کسی استعمال ہوا ہے بجز مقاماتِ قافیہ کے۔ چوتھی یہ کہ احمدی ایڈیشن میں یہ شعر لیا جاتا ہے ؎

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

نسخۂ رامپور میں یہ شعر نہیں ہے علاوہ بریں احمدی ایڈیشن اور نسخۂ رامپور میں دیگر لفظی اختلافات بھی جا بجا پائے جاتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ ان دونوں میں اصل و نقل کا فرق نہیں ہے۔

ظاہر کرنا چاہیے تھا۔

صفحہ ۸ کے تقریباً وسط میں تقریظ کے بعد نیرّ اور عزیز کے قطعات تاریخ طباعت ہیں جن سے ۱۲۷۸ھ مستخرج ہوتے ہیں۔ ان کے بعد عبارت خاتمہ دیوان" کے تحت میرزا صاحب کی یہ تحریر ہے۔

"داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے مخلص و داد آئین سید قمر الدین کی کارفرمائی اور خان صاحب الطاف نشاں محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منطبع ہوا۔ اگرچہ انطباع میری خواہش سے نہیں لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے یقین ہے کہ کسی جگہ حرف غلط نہ رہا ہو مگر ہاں ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے کہاں تک بدلتا؟ ناچار جا بجا یونہی چھوڑ دیا یعنی کسو، بکاف مکسور و سین مضموم و واؤ معروف میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں البتہ فصیح نہیں قافیہ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ افصح "کسی" ہے۔ واو کی جگہ یائے تحتانی۔ میرے دیوان میں ایک جگہ قافیہ کسو بہ واؤ، اور سب جگہ کسی بہ یائے تحتانی ہے۔ اس کا اظہار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشفتہ بیانی ہے۔ اللہ بس، ما سوائے ہوس۔"

اس کے بعد لکھا ہے :-

"مطبع احمدی میں واقع دِلّی اتو جان کے اہتمام سے بیسویں محرم الحرام ۱۲۷۸ھ کو مطبوع ہوا۔"

اس ایڈیشن میں میرزا صاحب نے اپنے کلام میں کچھ ضروری ترمیم بھی کی تھی اور چونکہ وہ ترمیم طباعت کے بعد ذہن میں آئی تھی اس لیے اسے غلط نامے میں ظاہر کرنا پڑا ہے، مثلاً میرزا صاحب کا مصرع اس طرح تھا: دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے" اس کو بنایا ہے": صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے" بالکل یہی الفاظ ایک رباعی میں بھی باندھے گئے تھے۔ فرماتے ہیں یعنی:

ہر بار کا غذ باد کی طرح ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے لیکن یہ مقام میرزا صاحب کی نظر سے

رہ گیا اس لیے یہاں اصلاح نہیں ہو سکی۔"

لفظ "کسو" کے تعلق میرزا صاحب کا ارشاد بھی ترمیم کے اندر ہی داخل سمجھنا چاہیے یعنی پہلے میرزا صاحب نے "کسو" ہی لکھا تھا، مگر بعد میں جدید محاورے کے ماتحت "کسی" بنا یا ہو چنانچہ نسخۂ رامپور میں جہاں کہیں "کسو" تھا وہاں مقابلے کے وقت خود میرزا صاحب نے اصلاح کر دی ہے۔

اس ایڈیشن کا چھاپا تمام ہو جانے کے فوراً بعد میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا تھا[۵۲]۔

"کلیات اردو کا چھاپا تمام ہوا، اغلب ہو کہ اس ہفتے میں، غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بسبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے گا۔"

۸ راگست ۱۸۶۱ء (۳۰ محرم ۱۲۷۸ھ) کو پھر لکھا[۵۳]۔

"دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا، حسن خط سے الفاظ کو چمکا دیا۔ دلّی پر اور اس کے بانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت، صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے حق التصنیف ایک مجکو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ غلط جو کہ تو ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتہ میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں۔ نہ تم خوش ہو گے۔"

اور یہ جو لکھتے ہو یہاں خریدار ہیں، قیمت لکھ بھیجو میں دلال نہیں، سوداگر نہیں، مہتمم مطبع

---

[۵۱] اس اصلاح کے سلسلے میں میرزا صاحب کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو: طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہو، اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں، اور بمعنی آسایش دنیا بھی مجاز ہو۔ مرادف طرز و روش بھی طرح ہو بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔" (اردو: ۳۰، بنام سرور)

[۵۲] اردو: ۱۸۲۔ [۵۳] اردو: ۱۵۴؛ خطوط: ۱، ۲۷۲۔

نیں مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مہتمم مرزا اموجان مطبع شاہدرے میں، محمد حسین
دلّی شہر داسے مان کے کوچے میں مصوروں کی حویلی کے پاس قیمت کتاب ۱۲ آنے
محصول ڈاک خریدار کے ذمے۔"

آخر اگست ۱۸۶۱ء (مطابق آخر صفر ۱۲۷۸ھ) میں ایک نسخہ میرزا صاحب نے نواب افتخار الملک بہادر نائب والیٔ حیدرآباد (سر سالار جنگ اوّل) کی خدمت میں ارمغان بھیجا تھا۔[1] ذکا کو فارسی خط میں سہ شنبہ ۱۱ ربیع الاول کو اس کی اطلاع دی ہے۔

<u>چوتھا ایڈیشن</u> | غالباً میرزا صاحب نے محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی دہلی کے روبرو اپنے اس مذکورہ بالا خیال کا اظہار کیا اور وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ میرزا صاحب ایک مطبوعہ نسخے کی تصحیح کر دیں اور محمد حسین اُسے کسی دوسرے مطبع میں طبع کرا دیں میرزا صاحب نے ایک نسخے کی تصحیح کر کے اس کی پشت پر یہ رقعہ لکھ بھیجا۔[2]

"جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا ہے غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے گویا اب غلط نامہ بیکار ہو گیا ہے خاتمے کی عبارت، کیا میرا بیان، کیا میر فخرالدین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھپے گی یہ مجلد گویا مسودہ ہے اس کو بھیج دیجئے۔"

محمد حسین خاں نے اس مسودے کو کانپور کے مطبع نظامی کو بھیجا یہ ابتدائی سال کا قصہ معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن کانپور کے مطبع نظامی میں طبع ہوا تو اس کے خاتمۃ الطبع میں یہ لکھا گیا تھا۔[3]

"بخدمت ارباب سخن عرض کرتا ہے امیدوار رحمت وغفران محمد عبدالرحمن بن حاجی محمد روشن خاں طیب اللہ ثراہ، کہ اس کے پہلے دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسداللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لیے جناب

---

[1] پنج آہنگ: ۲۴۶ - [2] غالب: ۳۰۲ [3] نظامی (کانپور) ایڈیشن: ۱۰۴

مجمع لطف بیکراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظرثانی اور تصحیح جناب مصنف کے ایک نسخہ میرے پاس بھیجا میں نے با فضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔ امید کہ جب ناظرین اس کے مطالعہ سے حلاوت سخن کی پائیں مہتمم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔"

اس نسخہ کا سائز احمدی کی برابر مگر کتابت کا مسطر اکیس سطری رہا۔ خط قدرے جلی اور نسبتاً عمدہ نستعلیق اور کاغذ ٹ۲ پاتی کا لگایا گیا اور پوری کتاب ۴۴ صفحات میں تمام ہوئی۔ ترتیب مضامین بالکل احمدی کی تھی۔ مگر ایک تو اس میں نیر کی تقریظ شامل نہیں کی گئی اور دوسرے حسب ذیل دو غزلیں اضافہ کی گئیں جو نسخہ رامپور اور احمدی ایڈیشن کسی میں نہیں پائی جاتیں۔

(۱) کیوں کہ اس بت سے رکھوں جان عزیز (۳ شعر)

(۲) بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے (۳ شعر)

چونکہ اس کی اصل خود غالب کی تصحیح کردہ تھی بنا بریں مذکورہ سابق رباعی میں بھی لفظ "طرح" کو "صورت کا فذ باد" بنا دیا گیا تھا، اور ہر جگہ کسو کی اصلاح کر دی گئی تھی البتہ ایک فاحش غلطی اس میں رہ گئی، اور وہ یہ کہ میرزا صاحب کا بہترین شعر

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۔۔۔ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس طرح مسخ کیا گیا۔ ع گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری خوشامد سے

نیز اور اغلاط بھی جگہ جگہ رہ گئے۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ پروف اور کاپی کی تصحیح غور سے نہیں کی گئی۔ ہاں ایک بات اس میں یہ ضرور مفید نظر آتی ہے کہ غزلوں پر مسلسل شمار کے ہندسے ڈالے ہیں لیکن اس شمار میں "کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز" پر نمبر شمار چھوٹ گیا ہے۔

خدا جانے میرزا صاحب کو یہ ایڈیشن پسند آیا یا نہیں سید بدرالدین کو ستمبر ۱۸۶۲ء میں صرف یہ لکھا ہے[۱]

"ریختہ کا دیوان، اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصے میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرے میں چھپ رہا ہے"

---

[۱] غالب: ۲۹۲۔

اس سے پسندیدگی و عدم پسندیدگی کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

چونکہ میرزا صاحب نے نسخۂ رامپور کی نقل میرٹھ سے واپس منگا کر منشی شیو نراین کو بھیجدی تھی اور ان کی تاخیر سے یہ سمجھ کر دلی اور کانپور میں دیوان چھپوا لیا تھا کہ وہ طباعت کا خیال ترک کر چکے ہیں اس لیے جب آخر ۱۸۶۱ء یا آغاز ۱۸۶۲ء میں میرزا صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ آگرے میں بھی دیوان چھپ رہا ہے تو وہ اس پر متاسف ہوئے اور شیو نراین کی خفگی کا ازالہ کرنے کے لیے میر نیاز علی صاحب کی معرفت معذرت کی۔ انھوں نے اچھی وکالت نہ کی اور شیو نراین نے دیوان واپس کرنے کے خیال کو میرزا صاحب پر ظاہر کیا۔ اس کے جواب میں ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو میرزا صاحب نے انھیں لکھا[1]۔

میاں! میں جانتا ہوں کہ مولوی سید نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمھارا بھیجا ہوا فرمہ مجکو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمھارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں غور کرو میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر بجبر اس سے پھیر لیا یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔ تم نے جو خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھا تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیو نراین سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔

بھائی خدا کی قسم! میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اُس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے۔ رامپور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلی میں تصویر بہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی۔"

اس خط کے لفظ فرمہ سے یہ مترشح ہے کہ آگرے میں طباعت دیوان کا کام ۱۸۶۱ء ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن ستمبر ۱۸۶۳ء میں میرزا صاحب نے سید صدر الدین صاحب کو جو خط لکھا ہے اس سے

[1] اردو: ۳۸۵، خطوط: ۱، ۲۵۷۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے میں کتاب زیرِ طباعت تھی۔ نیز یہ دیوان جب آگرے سے چھپ کر شائع ہوا تو اس کے سرورق پر کتاب کے نام دیوانِ غالب کے اوپر ۱۸۶۳ء لکھا گیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نسخہ آغاز ۱۸۶۳ء میں چھپنا شروع ہوا اور یہ کہ میرزا صاحب کے خط میں "فرمہ" سے کاپی مراد ہے ورنہ جو فرمہ جنوری ۱۸۶۳ء سے قبل چھپ جائے اس پر ۱۸۶۳ء کسی طرح نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

بہر حال یہ نسخہ ستمبر ۱۸۶۳ء کے بعد چھپ کر شائع ہوا اس کے مضامین کی ترتیب نسخہ رامپور کے مطابق رکھی گئی۔

"دیباچۂ فارسی (سیاہ لوح کے نیچے)، قطعات (سیاہ لوح کے نیچے)، مثنوی، قصاید، غزلیات رباعیات، تقریظ نیر بزبان فارسی"

اس کا سائز مذکورہ بالا نسخوں سے قدرے بڑا ہے ۱۵ سطرہ مسطر ہے کاغذ دیسی مشین کا بنا ہوا۔ اور خط قدرے جلی نستعلیق ہے۔

نیر کی تقریظ میں سنہ ۱۲۷۹ھ اور تعداد اشعار "یک ہزار و ہفصد و نود و اند"۔ مگر نسخے میں اشعار کی واقعی تعداد ۱۰۹۵ ہے، جو نسخۂ خطیۂ رامپور کے بالکل مطابق ہے۔ اس تعداد میں بمقابلۂ نسخۂ احمدی ایک شعر کی کمی اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ نسخۂ رامپور میں یہ شعر نہیں ہے ؎

عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر

اسی لیے اس کی نقل نسخۂ آگرہ سے بھی ساقط ہوگیا ہے۔

باقی لفظ "ہفصد" خود نیر کی ترمیم نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ غالباً منشی شیونراین نے اشعار شمار کر کے یہ تغیر کیا ہے۔ ورنہ نیر نسخہ احمدی کی تقریظ میں بھی یہ تغیر کر دیتے۔

اس دیوان کے بعد پھر میرزا صاحب کی زندگی میں دیوانِ اردو کا کوئی ایڈیشن شایع نہیں ہوا کتاب خانۂ عالیۂ ریاست رامپور میں بحمد اللہ ابتدائی دو ایڈیشنوں کی نقلیں اور آخری ایڈیشنوں کے اصل نسخے محفوظ ہیں۔

امتیاز علی عرشی

فرائیڈ اور اس کا فلسفہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

احتباس

عملِ احتباس فرائیڈ کے نظریۂ غیر شعوری کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق طفولیت ہی سے احساسات، جذبات و خیالات مسلسل دبا دیے جاتے ہیں۔ بچہ کا ذہن محدود ہوتا ہے خیالات غیر پختہ ہوتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اس کی فہم و فراست کا افق وسیع تر ہوتا جاتا ہے اس کے خیالات میں پختگی آجاتی ہے۔ خیالات بدلتے جاتے ہیں جن کی جگہ نئے خیالات لے لیتے ہیں جو نئے حالات اور ماحول کے پیداوار ہوتے ہیں۔ دیرینہ خیالات اب تو دب جاتے ہیں لیکن مٹتے نہیں بلکہ ہمیشہ زندہ اور پائندہ رہتے ہیں جن کو نفسِ شعور ابھرنے نہیں دیتا کیونکہ یہ ترقی یافتہ ذہن کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتے لیکن چونکہ یہ ناقابلِ فنا ہیں اس لیے وہ شعور کی مملکت سے باہر نفسِ غیر شعور میں پناہ لیتے ہیں اور ہم انھیں بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنی شکل و صورت اس طرح تبدیل کر لیتے ہیں کہ نفسِ شعور پہچان نہیں سکتا۔

وہ محبوس شدہ جذبات اور خیالات ہر وقت اظہار کی نئی نئی اور عجیب راہیں ڈھونڈ نکالتے ہیں ان بندشوں کی قلب ماہیت کی ایک نہایت اہم اور عجیب صورت بھی ہے اور وہ ہے بعض حیوانی یا خود غرضانہ میلانات کا سودمند اور رفاہِ عام کے کاموں میں تبدیل ہو جانا۔ بچہ ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اس خواہش کو دبا یا روک دیا جاتا ہے تو اس دباؤ اور روک سے مثلاً اس کی حصولِ علم کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی طرح ایذا رسانی کی فطری خواہش عملِ جراحی کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ یہی وہ روک ٹوک ہے جس سے نوعِ انسان کے تمدن کی عظیم الشان عمارت معرضِ وجود میں لائی گئی ہے۔ اس عمل کو صوئیت Sub limation کہتے ہیں۔ نوجوانوں میں جوش ہوتا ہے موج ہائے غم و مصائب کے ساتھ آویزش سے ایک

Repression a/

لطف، ایک سرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس کی لڑائی کی خو ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے آج دنیا جو خون و خرابہ قتل میں مکمل ہے یہی ہے اس کی محرک یہی انسان کی جنگی خو ہے اگر اس کے اخراج کی کوئی اور راہ نکالی جائے تو جنگ کی ہیبت ناکیوں سے انسان بڑی حد تک محفوظ رہ سکتا ہے اس کی تشفی کے لیے اگر دنگل اور مکہ بازی کی با قاعدہ تنظیم کی جائے تو اس سے جنگی خو تبدیل شدہ صورت میں عمل پیرا ہو سکتی ہے دوسری انسان کی خودنمائی کی جبلت ہے جو پبلک میں تقریروں سے اور ایکٹنگ اور اسی طرح زندگی کے کسی دوسرے شعبہ میں شہرت حاصل کرنے سے تسلی حاصل کر سکتی ہے اس طرح صاف ظاہر ہے کہ یہ اجتماع کا طریقۂ عمل کتنا پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ انسان فطرتاً خود پرست ہے آغاز میں اس کا خیال صرف اپنی طرف ہوتا ہے وہ اپنی ہی ضروریات اور خواہشات کو مدنظر رکھتا ہے لیکن جوں ہی وہ سن بلوغ کو پہنچتا ہے خود کو سماج کا ایک رکن پاتا ہے اور ہزار ہا ذمہ داریوں کا حامل۔ اب اس کو صرف اپنا ہی خیال نہیں رکھنا پڑتا بلکہ سماج کی پابندیاں اور ان کی ادائگی اس کی توجہ کی مرکز ہوتی ہیں وہ بہت سی خواہشات رکھتا ہے لیکن سوسائٹی سد راہ ہوتی ہے۔ وہ بہت سے ایسے خیالات اور نظریے رکھتا ہے جن کو مروجہ اخلاق و قوانین برداشت نہیں کر سکتے اس لیے اسے اپنی خواہشات اور خیالات کو سوسائٹی کے رجحان کے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بندش اور سوسائٹی کا یہ دباؤ اس شخص کے عمل اور خیالات میں پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے درحقیقت ہم لوگ اپنی بنیادی اور اصلی خواہشات کو عموماً جبلی حالت میں ظاہر نہیں کرتے اور نہ اصلی جبلی حالت میں ان خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ نقالی اور تربیت، تجربہ اور عقل سے کام لے کر ہم اپنی بنیادی خواہشات کی تکمیل مختلف غیر جبلی طریقوں سے کرتے ہیں مثلاً ایک شخص دوسرے کسی شخص سے بگڑ پڑتا ہے اب اس کا جبلی ردعمل تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس شخص پر پل پڑے اور غصہ کا ابال نکال باہر کرے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا سوسائٹی سد راہ ہے۔ قانون کا خوف مسلط ہے۔ تہذیب اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے وہ اپنے جذبۂ غیض و غضب کی تکمیل کے لیے دوسری راہیں ڈھونڈ نکالتا ہے اب وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے دوستوں میں اس کی بے عزتی کرے یا اس کے مقاصد میں رخنہ اندازی کرے یا اس کے احساسات کو صدمہ پہنچائے لیکن بہت سے انسان ان بندشوں اور رکاوٹوں کے متحمل نہیں ہوتے اور وہ سماج اور اخلاق

سے بے پروا ہو کر اپنی ہی خواہشات کے مطابق عمل کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج کی نظروں سے گر جاتے ہیں اور سماج ان کی نظروں میں گر جاتا ہے وہ تنہائی کو پسند کرنے لگتے ہیں اور تنک مزاج ہو جاتے ہیں ہندوستان کے مشہور شاعر میر تقی میر کی تنک مزاجی اور تخلیہ پسندی کی یہی وجوہات ہیں مندرجہ بالا سطور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے فطری میلانات کے اشارے پر عمل کرتا ہے یہ تبدیلیاں جو احتباس ہم میں پیدا کر دیتا ہے عموماً ہمارے جانے بوجھے بغیر عمل میں آتی ہیں لیکن بعض قسم کی بندشیں بعض لوگوں کے اندر غیر کاموں کی سرگرمی میں تبدیل ہو جاتی ہیں (جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے) لیکن اکثر دبی ہوئی خواہشات شخصیت میں انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ ایک مثال لیجیے:۔ ایک طلاق شدہ مغربی خاتون نے ایک طلاق شدہ مغربی مرد سے شادی کر لی وہ دونوں زن و شوئی کے ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے جس میں مکمل آزادی ہو اس لیے ان دونوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہوا کہ وہ جو کچھ بھی باہر کریں بلا کم و کاست ایک دوسرے سے بیان کر دیں۔ مرد میں کچھ اخلاقی جرات تھی اس لیے وہ آئے روز مثلاً کہ آج میں نے فلاں عورت سے بات کی، مجھے فلاں عورت بھلی معلوم ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اب عورت کے دل میں بھی اس قسم کے خیالات موجزن ہونے لگے کہ وہ بھی اس قسم کی دلچسپیوں میں حصہ لے لیکن اچانک ایک عجیب بات اس عورت کے اندر پیدا ہوئی کہ اسے کھلی جگہوں سے ہول پیدا ہو جاتا۔ وہ اکیلی باہر نہ جا سکتی تھی۔ اس کی اعصابیت نے اسے کمرہ میں قید کر دیا۔ اگر وہ دروازے سے ایک قدم بھی باہر اٹھاتی تو وہ فوراً لوٹنے پر مجبور ہو جاتی دراصل یہ باہر نکلنے کا ہول اس کے خاوند کی دل لگی کی عادت کے خلاف ایک ردعمل تھا اس کے نفس میں دو خیالوں کے درمیان مجادلہ و مناقشہ برپا ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ دہشت و ہیجان تھا جبلت کی یہ تحریک تھی کہ وہ بھی باہر جائے اور غیر مردوں سے ملاقات کرے لیکن خودی ایک پاسبان کی طرح ہر خیال کی نگہبانی اور محاسبہ کرتی تھی۔ اس نے اس قسم کے خیالات کی اجازت نہیں دی نتیجتاً یہ ہول پیدا ہو گیا۔

فرائیڈ کا جنسیاتی نظریہ | فرائیڈ کے جنسیاتی نظریہ کے بغیر اس کا فلسفہ نامکمل اور ادھورا رہتا ہے۔ اس کے فلسفہ کا یہی پہلو ہے جو جا بجا تنقید کا ہدف بنا رہا اس کا یہ نظریہ کہ تمام فطری رجحانات اصلاً جنسی ہیں۔ مخالفت کا

طوفان پیدا کر دینے کا موجب ہوا یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ احساس جبلی حیاتی رجحانات سے متعلق ہوتے ہیں۔ جو چیز ہمیں پسند آتی ہے ان کا ہمارے خیال میں وجود نہیں رہتا یعنی ہم اس کو بھول جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ موجودہ تہذیب نے جنسیات کے موضوع کو شجر ممنوع قرار دیا ہے۔ اس کا ذکر تک اخلاق کو ان کی نظر میں کھٹکتا ہے۔ اس لیے بظاہر مہذب انسان اپنے جنسی جذبہ کی حقیقت سے انکار کرتے ہیں اس لیے یہ بالکل فطری امر ہے کہ ہر وہ نظریہ جو ان میں اس جذبہ کے وجود کا انکشاف کرے ان کو مخالفت پر آمادہ کر دے گا لیکن اس ضمن میں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ فرائیڈ نے جنسیات کا لفظ محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا عام طور سے ہر وہ خیال جو شہوانیت سے متعلق ہو اور جس کا اختتام مجامعت سے ہو جنسی سمجھا جاتا ہے لیکن فرائیڈ نے جنسی نظریہ کی وضاحت کے لیے ایک لفظ (Libido) استعمال کیا ہے جو نہ صرف عام حیاتی جذبہ کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ایسے معنی کا بھی حامل ہے جو بظاہر جنسی جذبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہر قسم کی محبت باپ، ماں، بھائی اور بہن۔ خود سے محبت کسی جاندار یا بے جان سے لگاؤ۔ یہ سب جذبات اس ایک لفظ میں پنہاں ہیں۔ اگر ہم انسانی تعلقات کو لیں خصوصاً جو والدین کے بچوں کے ساتھ ہیں یہ فرائیڈ کی نظر میں بہت اہمیت رکھتے ہیں ان تعلقات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بنیاد دونوں طرف سے جنسی جذبہ پر ہوتی ہے۔ یہ جنسی خواہش ایسی ہی جبلی اور فطری ہے جیسے بھوک اس لیے لازمی ہے کہ یہ جذبہ ایک ہی خونی رشتہ کے افراد میں بھی کارفرما ہو۔ اگر لوگوں کی نظر اتنی دور نہ پہنچ سکے تو یہ اس جذبہ کی عدم موجودگی کی دلیل نہیں اس کا وجود ثابت ہونے پر اگر اچنبھا ہو جائے تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کمسن لڑکے کی نظر میں ماں صرف ایک عورت ہے سن بڑے ہونے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب اور سوسائٹی نے اسے ایک ممتاز درجہ دیا ہے۔ اس بچپن کے زمانہ میں ماں وہ تمام صفات لیے ہوئے ہے جو ایک صنف نازک میں ہونی چاہییں اور صنف نازک کے متعلق اس کی عمر کے مطابق بچہ میں جنسی جذبات ابھرتے ہیں اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طفلی محبت اصل میں وہی سن بلوغ کی محبت ہے جس کو سب لوگ متفقہ طور پر جنسی محبت مانتے ہیں یہ جنسی جذبہ بچہ کی شروع زندگی ہی میں موجود ہوتا ہے اور عمر کے تقاضہ کے ساتھ نمایاں طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔

جنسیاتِ طفلی | یہ عام عقیدہ ہو کہ بچوں میں جنسی جذبہ نہیں ہوتا اور سن بلوغ میں یکایک نمودار ہو جاتا ہو عام غلط فہمی ہو جو جنسی زندگی کے بنیادی اصول کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہو بچہ کا اولین جنسی ہیجان زندگی کے نہایت ہی اہم عمل کے ساتھ ملحق ہو یعنی ماں کا دودھ پینا۔ دودھ پینے کے بعد وہ میٹھی نیند سو جاتا ہے اور اس کے چہرہ پر اطمینان اور سکون کی ایسی جھلک ہوتی ہو جیسی مجامعت کے بعد انسان پر طاری ہوتی ہو جب وہ دودھ نہیں پیتا تو وہ انگوٹھا چوستا رہتا ہو جس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ عمل بھوک کی تحریک سے نہیں ہوتا اور وہ انگوٹھا چوسنے میں ایک لطف حاصل کرتا ہو اور سو جاتا ہے دایہ اور ملازم لوگ جو بچوں کو کھلایا کرتے ہیں بغیر کسی علمی نظریہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر کہا کرتے ہیں کہ بچہ صرف حصول مسرت کے لیے انگوٹھا چوستا ہو اور اس کی اس حرکت کو وہ شرارت سے تعبیر کرتے ہیں اور کوشش بھی کرتے ہیں کہ ایسا کرنا چھوڑ دے اس عمر میں بچہ کی تمام خواہشات کا مرکز منھ ہوتا ہو وہ منھ سے ماں کا دودھ پیتا ہو اور زندگی کا تمام حظ منھ سے لیتا ہو اور یہ چوسنے کا عمل بھی جنسیاتی ہو اور تجزیہ عمل سے یہ معلوم ہوا کہ اس عمل کی اہمیت تمام زندگی میں رہتی ہو اور یہی وہ نقطۂ آغاز ہو جہاں سے جنسی زندگی ترقی کرتی ہو۔ یہ دودھ پینے کی خواہش کے ساتھ ساتھ ماں کی چھاتی کی خواہش بھی ہوتی ہو جو کہ شہوانیت کا اولین مقصد ہے اور یہی خود ماں کا سینہ آئندہ ہماری جنسی خواہشات کی غرض و غایت کے متعین کرنے میں ایک بہت گہرا اثر رکھتی ہو۔ یہ انگوٹھا چوسنے کی عادت اگر بہت زیادہ ہو تو بڑا ہونے پر بوسہ بازی، مے نوشی، سگرٹ نوشی میں تبدیل ہو جاتی ہو یا انسان کھانے سے پرہیز کرنے لگتا ہو یا قے کا عارضہ ہو جاتا ہو۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوتا ہو تو اسے بول و براز کے اخراج میں خاص حظ و لطف حاصل ہوتا ہو اور پہلی مرتبہ اس کے حصول مسرت میں، اس کی من مانی کارروائیوں میں دنیا رکاوٹ ڈالتی ہو یعنی اسے بتایا جاتا ہو کہ بول و براز کے اخراج کے خاص اوقات معین ہیں اور اس پر زیادہ توجہ دینا بری بات ہو۔ طفلی جنسی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم بات جو پائی جاتی ہو وہ اس کا جنسیات کے متعلق تجسسانہ رجحان ہو اور یہ عموماً تین چار سال کے بچہ میں پایا جاتا ہو اس کا خیال زیادہ تر پیدائش کے مسئلہ کو سلجھانے میں منہمک ہوتا ہو وہ یہ سوچتا ہو کہ بچہ کہاں سے پیدا ہوتا ہو۔ اس کے خیال کے مطابق بچہ سینہ سے پیدا ہوتا ہو۔

کو چبا کر نکالا جاتا. دیا ناف کھل جاتی ہو اور بچہ پیدا ہوجاتا ہو یا خاص غذا کھانے سے ولادت ہوتی ہو یا برازکی طرح وہ بھی اسی راستے سے پیدا ہوتا ہو یہ خیالات تجزیہ نفس کی مدد کے بغیر یاد نہیں آسکتے کیونکہ یہ بہت زیادہ محبوس ہوتے ہیں۔ اس طرح جنسی زندگی کی عمارت بچپن ہی سے تعمیر ہوتی ہو نوجوان بچہ کی محبت کی اولیں خواہش پختہ عمر کی عورت کے ساتھ ہوتی ہو اور لڑکی کی بوڑھے مرد سے جو کہ حاکمانہ اطوار رکھتا ہو۔ بچہ کے والدین کے ساتھ تعلقات اس کے جنسی جذبہ کے ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کا سبب ہوتے ہیں کیونکہ والدین خصوصاً ماں بچہ کو ایسے احساسات بہم پہنچاتی ہو جو اس کی اپنی جنسی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں وہ اس کا بوسہ لیتی ہو کبھی سینہ سے لگاتی ہو کبھی تھپکی دیتی ہو۔ اگر ماں کو یہ بتلایا جائے کہ اس کا یہ پیار اور محبت بچہ کے جنسی جذبہ کو برانگیختہ کرتے ہیں تو وہ حیران و ششدر رہ جائے کیونکہ اس کے خیال میں اس قسم کے احساسات صرف اعضائے مخصوص کے چھونے ہی سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ جنسی جذبہ صرف اعضائے مخصوص کو چھونے ہی سے نہیں بھڑک اٹھتا ہو بلکہ جسم کے اور بھی حصوں کو چھونے سے ایسا جذبہ مشتعل ہوجاتا ہو اس لیے والدین کا ضرورت سے زیادہ بچہ سے پیار اس کے جذبۂ جنسی کو اور زیادہ تیز کر دیتا ہو۔ بچہ آغاز ہی سے والدین کے ساتھ اس طرح پیش آتا ہو جیسے وہ جنسی محبت میں مبتلا ہو۔ ڈر اور خوف جس کا اظہار بچہ عموماً کرتا ہو صرف اس بات کا مظہر ہو کہ اس کو اس شخص کی غیر موجودگی کی بے چینی ہو جس سے اس کو پیار ہو اس لیے بچے ہر اجنبی شخص سے گھبراتے ہیں اور تاریکی سے خوف زدہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ محبوب شخص کو نہیں دیکھ سکتے ان کا خوف جاتا رہتا ہو اگر وہ اس شخص کا ہاتھ تھام لیں۔

فرایڈ کا فلسفہ اور سوسائٹی | آج کل جنگ کے شعلے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں انسانیت چیخ اٹھی ہو۔ تمدن اور آرٹ کے وہ شاہکار جن پر بشریت کا سر فخر سے بلند ہوتا مٹی میں مل چکے ہیں معلوم کر کے تعجب اور حیرانی کی کوئی حد نہیں رہتی کہ اس جنگ کے ذمہ دار صرف ہٹلر اور مسولینی ہیں آج کل تقریباً ہر ملک میں کوئی ہٹلر اور مسولینی ضرور ملے گا جمہور کی آمریت پسندی اس بات کی دلیل ہو کہ سماج میں کوئی نقص ہو اور اس کے ارتقا میں کوئی خامی رہ گئی ہو۔ وہ خامی کیا ہے ؟

سوسائٹی افراد سے مشتمل ہے اور یہ نفسیات کا مسلمہ اصول ہے کہ افراد کی زندگی بچپن ہی میں ڈھلتی ہے اس کا ذہنی سانچہ اسی وقت سے کوئی مخصوص شکل اختیار کرنے لگتا ہے بچہ عمر کے پہلے سات سالوں میں ایک نرم ونازک پودا ہوتا ہے اس پر معمولی بات بھی گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اصول نفسیات کی ناواقفیت کی وجہ سے بچہ کی زندگی پر عموماً والدین آمر کی حیثیت سے مسلط رہتے ہیں۔ وہ بچہ کی افتاد طبع اور خواہش کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ سے یہ بات ہمیشہ اوجھل رہی ہے کہ بچہ کے ننھے سے من کے اندر بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں کے بت ہیں جن کا وہ پجاری ہے۔ وہ شفقت سے نہیں بلکہ حاکمانہ انداز سے اس کے روزانہ معمولات کے وقت کا تعین کرتے ہیں۔ "فلاں وقت رفع حاجت کرنی چاہیے۔ دن میں اتنی بار کھانا چاہیے اور فلاں وقت کھانا چاہیے" معلم صاحب آتے ہیں تو وہ بچہ کی نہفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی بجائے ان کو اور سلا دیتے ہیں۔ بچہ سے بطور نصیحت کہا جاتا ہے کہ بزرگوں کا کہا مانو، ان کے ہر حکم کی (جائز ہو یا ناجائز) تعمیل کرو۔ غرض یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ نتیجتاً بچہ بڑا ہو کر کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا اس میں خودداری اور خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا اس میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی عادت [illegible] اس کی رہنمائی کا محتاج رہتا ہے [illegible] والدین کی اطاعت بزرگوں کی اطاعت اور اساتذہ اور استادوں کی اطاعت اس لیے بڑا ہو کر کسی ڈکٹیٹر کی اطاعت اسے ناگوار نہیں ہوتی اور اسے کوئی شے قبول کر لیتا ہے۔ لیکن زمانہ کے تغیر نے اس قسم کے والدین کی آمریت اور حاکمیت میں بہت کمزوری پیدا کر دی ہے اور سوسائٹی کی حالت اس معاملہ میں روبہ اصلاح ہے۔ اب فرائیڈ کی تعلیم سے متاثر ہو کر والدین ہر جزوی اور غیر ضروری بات کی اہمیت کو سمجھ کر اس کی رہنمائی کرتے ہیں اب تعلیم کا یہ مقصد نہیں رہا کہ لڑکے کو کتابوں کے بوجھ سے لاد دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے میں کس قسم کی صلاحیت اور کس قسم کے میلانات ہیں اس کے [illegible] اس کے تمام قوا کو کام میں لا کر اس کی تربیت عمل میں لائی جاتی ہے۔ اب موجودہ یورپ میں خود اعتمادی [illegible]

نہیں کیا جاتا بتدریج سماج کی ہیئت تبدیل ہو رہی ہے اس کے علاوہ فرائیڈ کی تعلیم سے ان وجوہات ... پر جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے سماج کے قوانین اور رسم و رواج میں لچک پیدا ہو جائے گی۔ قوانین اور رسم و رواج لوگوں کی نگاہ میں ایک ... حسب التنظیم اور خوف انگیز قوت ہے اور ان پر کوئی فرد بھی رائے زنی نہیں کر سکتا اگرچہ اس کی طبیعت اور رائے میں وہ کتنے ہی ... کیوں نہ ہوں لیکن اس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ اس طرح متمدن سوسائٹی میں قوانین اور رسم و رواج آزادئ رائے اور آزادئ عمل کی راہ میں ایک سنگ گراں ہیں لیکن اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر قسم کی آزادی ہر فرد کو مل جائے اور اس کے خیال و عمل پر کوئی محاسبہ کرنے کے لیے کوئی قوت موجود نہ ہو تو اس سے بے راہ روی پیدا ہو جائے گی اور ... نقصان دہ ہوگی اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ احساسات اور جذبات علومیت اور ... کی طرف بڑھتے ہیں۔ انسان کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ ان دونوں کا ... کرے وہ سماج ... پرانے ... رسنانے پر تلی ہوئی ہو اپنے افراد کو صحیح تعلیم سے محروم رکھ رہی ہے۔

زندگی کے شعبوں میں فرائیڈ کی تعلیم کا بہت ہی گہرا اثر پڑا ہے خصوصاً ان نظریات پر جو بچوں کی تربیت اور تعلیم سے متعلق ہے۔ فرائیڈ کی تعلیم میں احتباس کا نظریہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگر صرف اسی ... کی تعلیم اور تربیت ہو تو کچھ زمانہ کے بعد تمام سوسائٹی ہی بدل جائے گی ہندوستان میں ... و حرکت اور اظہار خیال پر جو کڑی پابندیاں ہوتی ہیں اور جس قسم کی سختیاں جائز رکھی جاتی ... بعض تو بہت مضحکہ خیز ہیں اور زہر آلود بھی۔ بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو قاعدہ کی ... کی پہلی سطر پڑھتا ہے "باپ حقہ پی رہا ہے۔ ماں روٹی پکا رہی ہے" گھر آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ واقعی والد ... منہ میں حقہ لیے دھوئیں کے بادل چھوڑ رہے ہیں۔ فطری طور پر بچہ والدین کی باتوں اور خصوصاً ... کا بہت اثر لیتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو کہ اس کے والدین کرتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حقہ ... اس کا ...

فنا نہیں ہوتا اس کے برعکس حقہ پینے کی خواہش تیز تر اور مضبوط تر ہو جاتی ہے اور یہ خیال پیدا ہو جا
کہ یقینی طور پر حقہ پینے میں کوئی خاص حظ اور لطف ہو گا جس سے وہ محروم رکھا جا رہا ہے تو وہ چوری
پینے کی کوشش کرتا ہے اور جب ایک مرتبہ اس کا تجربہ کر لیتا ہے تو یہ عادت لگی ہوئی کبھی نہیں چھٹتی ۔
دیکھیے ایک غلط قسم کے دباؤ سے بچہ کے اخلاق و کردار میں کتنے اسام کے نقائص پیدا ہو گئے ا
بچہ کو چوری چھپے پینے سے چوری کی عادت ہو گئی دوم چوری کی عادت اسے جھوٹ بولنا سکھلا تی
اسی طرح سے بعض مائیں روتے ہوئے بچوں کو چپ کرانے کے لیے ہوّے سے ڈراتی ہیں
یہ نہیں جانتیں کہ وہ ننھے سے پودے میں زہر سرایت کرا رہی ہیں جو آخر کار خوف اور بزدلی پیدا
فرائیڈ نے ابتدائی تربیت کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق معلم کا اولین فرض
کہ غیر ضروری اور ناواجب اعتباس سے بچہ کو بچائے یعنی زیادہ سے زیادہ جہاں قابل عمل ہو بچہ
جذبات و احساسات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پڑنے دے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک
دور رس اور گہرے نفسیاتی علم اور پُرخلوص دل کی ضرورت ہے۔ بچہ کو اس نفسیاتی تعقید یا گنجلک (
Complex) سے محفوظ رکھنے کے لیے چند باتیں ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں۔ اول ہمیں اس بات کا اچھ
علم ہونا چاہیے کہ ہم کو ہر شخص کو موجودہ سوسائٹی کے نظام کے ہم آہنگ اور مطابق بنانے کی کوئی خا
ضرورت نہیں اور نہ یہ سودمند ہی ہے کیونکہ بچہ کے جبلی میلانات کچھ اور ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے
کچھ اور ڈھنگ کے واقع ہوئے ہیں۔ بچہ کے فطری میلانات کو دبا کر سوسائٹی کے ہم آہنگ کر
کوشش سراسر بچہ کی ذہنی اور بہت حد تک جسمانی ترقی کے لیے ضرر رساں ہے۔ اصول یہ ہونا
کہ بچہ کی فطری صلاحیتوں کو ابھارا جائے اور اس کی پوری طرح نشو و نما اور نگہداشت کی جائے
سے امید رکھتے ہیں کہ وہ بہت ہی صاف ستھرا ہو اس کا طرز عمل اور نشست و برخاست بھی ب
مہذبانہ ہو۔ اگر بچہ اس معیار پر عمل نہیں کر سکتا تو اس کو مارا پیٹا بھی جاتا ہے یہ نہایت ہی غیر معقول حرکت
ہمیں بچہ کے رجحانات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کی بنیادوں تک پہنچنے کی کوشش کر
یہ کام لغو بارسے سٹے بچوں ہو سکتا ہے۔

دویم اجتماعی تربیت اور تعلیم کے لیے لازمی ہے کہ معلم بہت سے پیچیدہ معاملات کا مقابلہ کرے وہ معلم جو کسی مفروضہ خیال کے ماتحت بچہ کی فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں ناکامیابی یقینی ہے کیونکہ جو باتیں اس کے مفروضہ خیال کے مطابق نہ ہوں گی معلم اسے قبول نہ کرے گا خصوصاً بچہ کی جنسی زندگی کے متعلق تو لوگ عموماً بہت زیادہ حسن ظن رکھتے ہیں اور خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ بچہ جنسی جذبات سے بالکل معرا ہے۔ یہ لاعلمی اس اہم نفسیاتی پہلو سے ہماری تعلیم کی کج روی کا باعث ہے۔ بچہ کا یہی وہ جذبہ ہے جو سب سے زیادہ محسوس کیا جاتا ہے والدین اور معلم بچہ کے جنسیات کے متعلق متجسسانہ سوالات کا جواب دینے کے لیے بالکل رضامند نہیں ہوتے اس لیے بیہودہ اور مخرب الاخلاق کہکر بچہ کا منہ بند کر دیتے ہیں جنس کے متعلق بچہ کا یہ متجسسانہ جذبہ ان کے تحکمانہ اور حاکمانہ طرز عمل کے بوجھ سے دب جاتا ہے اور بہت سی اعصابی امراض اور نفسیاتی کمزوریوں کا موجب ہوتا ہے اس لیے معلم اور والدین کا یہ فرض ہونا چاہیے بچہ کے ہر سوال کا جو جنسیات سے متعلق ہوں تسلی بخش جواب دیں اور اس کے متعلق ہر ممکن معلومات بہم پہنچائیں۔ یہ آگاہی بچہ کو بہت سی بری باتوں سے بچائے گی۔

سوم بچہ کو ہر ممکن طریقے سے ایسی باتوں سے محفوظ رکھا جائے جو کہ شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہوں لیکن اس کے لیے بھی گہری اور وسیع معلومات کی ضرورت ہے۔ بچہ میں یہ جنسی خواہشات کن کن طاقتوں سے منتقل ہوں گی ان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان خواہشات کو علویت کے اصول پر اچھی راہوں پر لگانا چاہیے۔

رشید الدین بی، اے

اشیائے خوردنی

جنگ کی وجہ سے ہندوستان پر جو گوناگوں معاشی اثرات پڑ رہے ہیں ان کا پڑنا یوں بھی لازمی ہے کہ لڑائی کی وجہ سے ملک کی بیرونی تجارت بہت گھٹ گئی ہے جاپانی مقبوضات اور جاپانی مفتوحہ علاقوں سے تو تجارت بالکل بند ہو گئی۔ بحر ہند اور خلیج بنگال میں دشمن کی موجودگی کی وجہ سے آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ سے تجارت ختم ہو گئی۔ برما روڈ بند ہو جانے سے چین کی تجارت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب صرف مشرقی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں سے تجارتی تعلقات باقی رہ گئے ہیں، مگر جہازوں کی کمی کی وجہ سے اس تجارت کا بڑا حصہ بھی فوجی اغراض کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ تجارت کی اس تخفیف کا اثر ہندوستانی زراعت پر پڑنا بھی ضروری تھا۔ مثلاً ان چیزوں کی کاشت میں کمی ہونا لازمی تھی جن کی ہندوستان میں زیادہ کھپت نہیں ہے یا ملک میں ان اشیائے خوردنی کی کمی ہو جانے کا امکان تھا، جو باہر سے آیا کرتی تھیں چنانچہ اس سال ملک میں اشیائے خوردنی کے معاملہ میں بڑی گڑبڑ رہی اگرچہ باقاعدہ اعداد و شمار کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہم بالکل صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں گے مگر یہ مجبوری ایسی ہے جس پر ہم غالب نہیں آ سکتے، اول تو یہاں ہندوستان میں ویسے ہی اعداد و شمار کی کمی ہے اور جو کچھ ہیں وہ سرکاری محکموں یا رپورٹوں کے واسطے فراہم کیے جاتے ہیں اور اس کے باوجود بھی بعض اوقات خود حکومت بھی مجبور ہو جاتی ہے مثلاً مارچ میں جب اسمبلی میں اشیائے خوردنی کے مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا تو سوال کیا گیا کہ "ملک میں کتنا گیہوں صرف ہوتا ہے؟" حکومت ہند کے وزیر تجارت نے اس کا جواب دینے سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ ۱۱ مارچ کے ہریجن میں گاندھی جی نے اس پر ایک نوٹ لکھتے ہوئے بتایا کہ گیہوں کے اندرونی خرچ کا اندازہ ۹ ملین ٹن کے قریب ہے اس لیے ایسی مجبوری کی صورت میں ان اعداد کو ہمیں اپنا رہبر بنانا پڑتا ہے جن کا یا تو اخباروں میں تذکرہ ہوتا ہے یا سرکاری تقریروں میں جن کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اس سال کے شروع میں اشیائے خوردنی کی جو حالت تھی اس کا اندازہ اس بیان سے ہو سکتا ہے

جو وزیر تجارت نے مارچ میں اسمبلی میں دیا تھا۔ ۱۹۴۲-۴۳ء میں دس ملین ٹن گیہوں پیدا ہوا اور گذشتہ دس مہینے میں ۸۲ ہزار ٹن آٹا اور ۱،۷۵،۰۰۰ ٹن گیہوں باہر گیا۔ ڈیفنس کے سلسلہ میں ۲،۰۳،۰۰۰ ٹن باہر سے خریدا گیا۔ بہرحال اس طرح درآمد و برآمد کے اعداد تقریباً برابر ہو جاتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک میں جتنا گیہوں پیدا ہوا وہ سب کا سب یہیں رہا۔ لہٰذا ایسی صورت میں گیہوں کی قلت کی شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ مگر سال کے ابتدائی حصہ میں اور بالخصوص مارچ میں نئی فصل کے بازار میں آنے تک صوبہ سرحد، یوپی، دہلی اور گیہوں کی کان یعنی سرزمین پنجاب میں بھی گیہوں کی قلت ہو گئی اور صورت حال اس قدر شدید ہو گئی کہ صوبجاتی حکومتوں کو گیہوں کے ساتھ ۴۰ فیصدی تک مکا اور جوار وغیرہ کا آٹا ملا کر فروخت کرنے کی اجازت دینا پڑی۔ نیز ملک کے دوسرے حصوں سے گیہوں بھیج کر بے چینی اور پریشانی کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی۔

صورت حال ایسی نازک ہو گئی تھی کہ ۲۲ رمارچ کو دارالعوام میں یہ سوال کیا گیا اور وزیر ہند نے اس کے جواب میں کہا کہ "ہندوستان اشیائے خوردنی کے معاملہ میں خودکفیل ہے۔ البتہ چاول کا کچھ حصہ برما سے آتا ہے مگر اس کی تعداد کل ہندوستانی خرچ کی ۵ فیصدی ہے حکومت ہند کو نہ صرف غیرفوجی آبادی بلکہ فوجی آبادی کے لیے بھی غلے کی ضرورت ہے نقل و حمل کی مشکلات کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ غلہ لے جانا مشکل ہو رہا ہے چنانچہ ان دشواریوں کو دور کرنے کے لیے حکومت ہند صوبجاتی حکومتوں اور ریاستوں کے نمایندوں سے مختلف کانفرنسوں کے ذریعہ چاول اور دوسرے غلوں کے رقبوں میں اضافہ کے متعلق گفت و شنید کر رہی ہے اور ۱۶ راپریل کو پھر ایک کانفرنس ہونے والی ہے۔"

۱۶ راپریل کو دہلی میں یہ کانفرنس ہوئی جس میں وزیر تجارت نے سنایا کہ "اس وقت ملک کی عجیب حالت ہے ہندوستان میں اکثر اشیائے خوردنی کا قحط ہو چکا ہے اور اس کی وجہ بارش کی قلت ہوا کرتی تھی مگر اس مرتبہ صورت حال ایسی نہیں ہے اور نہ گذشتہ جنگ عظیم میں ایسا ہوا۔ برما کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے چاول کی مقدار پر اثر پڑا اور اسی کی وجہ سے گیہوں کی مقدار متاثر

ہوئی۔ ہندوستان میں جو تھوڑا بہت گیہوں آسٹریلیا سے آیا کرتا تھا وہ رُک گیا۔ لہٰذا جب ملک سے دو اہم غلوں کی رسد متاثر ہوئی تو دوسرے عام غلوں پر بھی اس کا اثر پڑنا لازمی تھا"

اُنھوں نے بتایا کہ "اشیائے خوردنی کا ۸۰ فی صدی حصہ چاول گیہوں، جوار، باجرہ اور چنے پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں چاول کی پیدائش ۲۶۵ لاکھ ٹن ہے اور ۱۴ لاکھ ٹن باہر سے آتا ہے مگر اس سال چاول کی پیدائش میں ۹ لاکھ ٹن کی کمی ہو جائے گی گویا اس طرح مجموعی حیثیت سے ہندوستان کو ۲۳ لاکھ ٹن چاول کا خسارہ رہے گا اور اگر فوجی اغراض کے لیے چاول کی مانگ نہ ہو تب بھی لنکا سے چاول کی مانگ ہوگی کیونکہ وہاں بھی چاول کی بڑی مقدار برما سے جایا کرتی تھی۔ گیہوں کی عام پیدائش ۱۰۰ لاکھ ٹن ہے مگر اس سال کل پیدائش کا اندازہ ۹۹ لاکھ ٹن ہے۔ اگرچہ صوبہ سندھ، بہار اور وسط ہند میں گیہوں کے رقبے میں تھوڑا بہت اضافہ ہوا ہے مگر پھر بھی ۳ر۵ لاکھ ٹن کی کمی رہے گی۔ جوار، باجرہ کی عام پیدائش ۹۲ لاکھ ٹن ہے مگر اس مرتبہ ۱۰۹ لاکھ ٹن ہوگا اور ملک کی ضروریات ۱۵۴ لاکھ ٹن ہیں اس طرح ان چیزوں میں کچھ بچت رہے گی۔ چنے میں کوئی خطرہ نہیں اور اس کی پیدائش ۳۵ لاکھ ٹن کے قریب رہے گی جو اس کی اوسط سالانہ پیداوار ہے"

وزیر تجارت نے موجودہ صورت حال کے اسباب بھی بتائے پہلا باہر سے درآمد کی کمی اور دوسرے اندرونی نقل و حمل کی دشواریاں چونکہ ریلوں پر بہت زیادہ بار پڑ رہا ہے اس لیے نقل و حمل کا سوال بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس خطرے کے امکان سے بھی بحث کی جو کسی وقت یہاں نقل و حمل کے راستوں میں بے ترتیبی کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا خطرے کے وقت جب راستے رُک جائیں گے تو اس وقت جو حالت ہوگی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ صوبوں کو خود کفالت کے اصول پر عمل کرنا چاہیے اور اسی کے ساتھ ساتھ زاید سے زاید اشیائے خوردنی پیدا کرنے کی مہم شروع کرنے کی ضرورت ہے چونکہ چاول کے معاملہ میں سب سے زیادہ کمی ہے اس لیے اس طرف خاص طور پر توجہ کی ضرورت ہے اور مناسب ہوگا کہ کم مدت میں تیار ہونے والی فصلوں کی کاشت کی جائے۔ وزیر موصوف نے خود کفالت کی تعلیم دی تھی مگر یہ خطرہ تھا کہ کہیں اس پر اس سختی سے

عمل نہ ہونے لگے کہ صوبے اور ریاستیں اپنی اپنی پیداواریں باہر بھیجنا بند کر دیں جو قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے ہرگز مفید نہیں ہو سکتا چنانچہ اس مسئلہ کو انھوں نے خود ہی صاف کر دیا کہ "اگرچہ میں نے خود کفالت کی تعلیم دی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے جو قومی اور ملکی لحاظ سے مضر ثابت ہو، بلکہ دراصل اس سے میرا مقصد ترغیبی پہلو ہے"

گزشتہ جنگ عظیم میں جو اس قسم کی صورت پیدا نہیں ہوئی اس کے مختلف اسباب تھے مثلاً اس وقت جنگ یورپ تک محدود رہی۔ دوسرے جاپان اتحادیوں کے ساتھ تھا، اس لیے جاپان سے تجارت بڑھتی رہی، بحر ہند اور خلیج بنگال میں کوئی خطرہ نہ تھا اس لیے جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، جزائر غرب الہند اور ملایا وغیرہ سے تجارت حسب حال قائم رہی بحر اوقیانوس بھی دشمن کی آبدوز کشتیوں سے نسبتاً بہت محفوظ تھا اس لیے امریکہ سے برابر تجارت ہوتی رہی نیز چونکہ امریکہ بہت بعد میں لڑائی میں شامل ہوا تھا اس لیے ابتدا میں وہ برابر تجارت میں حصہ لیتا رہا، جہازوں کے ڈوبنے کی رفتار بھی بہت کم تھی اس لیے تجارتی اغراض کے لیے جہاز کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ بیرونی ملکوں سے پناہ گزینوں کی کوئی خاص تعداد نہیں آئی تھی جیسا کہ اس مرتبہ ہو رہا ہے، اس لیے صورت حال نے نزاکت اختیار نہیں کی تھی اس سلسلہ میں ایک بات کا اور خیال رکھنا چاہیے کہ اس مرتبہ مختلف ملکوں سے جو ۸ - ۹ لاکھ پناہ گزیں ہندوستان آئے ہیں وہ زیادہ تر چاول کھانے والے ملکوں سے آئے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کی چاول کی مقدار پر زیادہ بار پڑے گا۔

بہرحال اس طرح جب غلوں کی کمی محسوس ہونے لگی تو زاید سے زاید خوراک پیدا کرنے کی تحریک شروع ہوئی اور ہر طرف اسی کا پروپیگنڈا نظر آنے لگا اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ غیر خوردنی اشیاء کے رقبہ میں کمی کی جائے۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے طے کیا کہ وہ روئی فنڈ میں سے ایک کروڑ روپیہ زاید غلہ پیدا کرنے والی تحریک کی امداد پر صرف کرے گی۔ چھوٹے ریشہ والی روئی کی کاشت کو کم کرنے کے لیے حکومت بمبئی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آیندہ ایسی روئی کی کاشت کے واسطے کوئی امداد نہ دے گی کیونکہ اس کا بازار نہیں ہے۔ یا آسام میں جوٹ کے بجائے چاول بویا گیا پھر بھی آسام میں اشیائے خوردنی

کی کمی میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ چنانچہ ۳ جولائی کے ایک پریس نوٹ میں حکومت آسام نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہو کہ اس سال ایک لاکھ ٹن چاول، ۲۰۰ ہزار ٹن دالوں اور ۱۵ ہزار ٹن گیہوں کی کمی رہے گی۔ البتہ آلوؤں کی پیدائش میں اضافہ ہو جائے گا۔

۱۴ جولائی کو آنریبل این۔ آر۔ سرکار نے ایک پریس کانفرنس کے دوران میں پھر اشیائے خوردنی کے اعداد و شمار پیش کیے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی آپ نے بتایا کہ برما سے چاول کی برآمد رک جانے، لنکا سے مانگ بڑھ جانے اور ملک میں فصل اچھی نہ ہونے کی وجہ سے بعض اشیائے خوردنی اور بالخصوص چاول کی حالت بہت خراب ہو گئی ہو۔ ۱۹۴۱-۴۲ء کے جو اعداد اب تک موصول ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہو کہ اس سال چاول میں ۱۲ لاکھ ٹن اور گیہوں میں ۴ لاکھ ٹن کی کمی ہوگی اور اس تخفیف کا اثر پورے ۱۹۴۲ء پر اور ۱۹۴۳ء کے کچھ حصہ پر پڑے گا۔ کیونکہ ستمبر میں خریف کی چاول کی فصل معمولی ہوگی اور گیہوں کی نئی فصل اپریل ۱۹۴۳ء سے پہلے بازار میں نہیں آئے گی۔ صرف باجرہ کی پیداوار میں ہمارے اندازے سے ۸ر۰ لاکھ ٹن کی زیادتی ہو جائے گی۔

البتہ ۱۹۴۳-۴۴ء میں ہماری زاید خوراک پیدا کرنے والی تحریک کے اچھے نتائج مرتب ہوں گے کیونکہ مختلف صوبوں اور ریاستوں میں افتادہ اور غیر آباد علاقوں پر کاشت شروع ہو گئی ہو۔ اس کے علاوہ غیر ضروری فصلوں مثلاً چھوٹے ریشہ والی روئی، جوٹ اور السی کے بجائے اشیائے خوردنی کی کاشت ہوگی اس طرح اندازہ ہو کہ مزید ۹۶ لاکھ ایکڑ رقبہ اشیائے خوردنی کے تحت آ جائے گا جس سے ۲۲ لاکھ ٹن پیداوار ہو سکے گی جس میں ۳ر۸ لاکھ ٹن چاول، ۷ر۴ لاکھ ٹن گیہوں اور ۳ر۸ لاکھ ٹن باجرہ اور ۵ لاکھ ٹن چنا ہوگا۔ گویا اس طرح آئندہ سال میں چاول میں پھر بھی ۱۱ لاکھ ٹن کی کمی رہے گی مگر یہ کمی گیہوں اور باجرے کے ذریعہ پوری ہو جائے گی۔ البتہ اس کا امکان ہو کہ خاص خاص حصوں میں چاول یا بعض دوسری اشیاء کی قلت رہے۔ اس کو مختلف طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً گیہوں کے بجائے باجرہ کھایا جائے یا ترکاریوں اور پھلوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اس سے ایک طرف تو خوراک پر بار کم ہو جائے گا دوسری طرف صحت کے لیے یہ چیزیں بہت مفید ثابت ہوں

چنانچہ اس خیال کے پیش نظر عنقریب زیادہ پھل اور ترکاریاں پیدا کرنے اور کھانے کی تحریک شروع کی جائے گی۔ ہندوستان میں مختلف قسم کی ترکاریاں اور جلدی بڑھنے والے پھل مثلاً ارنڈ ککڑی، کیلا اور اناناس وغیرہ کی پیدائش کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ نیز اسی کے ساتھ ساتھ غلے کو کم سے کم ضائع کرنے کی تحریک بھی شروع کی جائے گی۔"

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۵۲ء کے آخر اور ۱۹۵۳ء کے اوائل میں ملک میں اشیائے خوردنی کی قلت رہے گی اس لیے ابھی سے ان مشکلات پر غالب آنے کے لیے مختلف تجاویز پر غور کرنا بہت ضروری ہو نیز غلے کے بدل تلاش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مگر غلے کے بجائے ترکاریاں اور پھل کھانے کی جو تجویز پیش کی گئی ہو وہ نظری حد تک کتنی ہی عمدہ اور مفید کیوں نہ ہو مگر عملی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں کون نہیں جانتا کہ پھل اور ترکاریاں صحت کے لیے کس قدر مفید ہیں مگر اس کے باوجود ملک میں کتنے آدمی ان کو استعمال کرتے ہیں یہاں سوال افادیت کا نہیں ہو بلکہ اصل مسئلہ یہ ہو کہ ان کی لاگت برداشت بھی کی جاسکتی ہو یا نہیں پھل یا ترکاریاں خواہ وہ کتنی ہی ارزاں کیوں نہ ہوجائیں پھر بھی ادنیٰ اور معمولی غلوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جس ملک کے کاشتکاروں کی بڑی تعداد سال کے کچھ حصے میں کچھ را اور آموں کی ابلی ہوئی گٹھلیوں درختوں کے پتوں اور چھالوں پر گزر کرتی ہو وہاں یہ توقع کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا کہ یہ لوگ پھل اور ترکاریاں کھاسکیں گے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہو جبکہ امن کا زمانہ تھا۔ مگر اس وقت اعداد تو موجود نہیں لیکن اندازہ ہو کہ عام ترکاریوں کی قیمتوں میں ۵۰ فیصدی اور پھلوں کی قیمتوں میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوگیا ہو تو ان کو کس طرح استعمال کیا جاسکے گا۔ پھر اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عام گرانی کی وجہ سے لوگوں کی قوت خرید گھٹ گئی ہو۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہو کہ جب انقلاب فرانس سے پہلے وہاں کے لوگوں نے روٹی نہ ملنے کی شکایت کی تو ملکہ نے یہ سن کر کہا تھا کہ "یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟"

جہاں تک پھل اور ترکاریوں کی کاشت کا تعلق ہو تو یہ زیادہ تر مقامی طور پر ہوسکتی ہو مگر اس میں بھی [illegible] شہروں کی آبادی کا بیشتر حصہ ایسے کمروں یا چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتا [illegible] درخت لگانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہو۔ دوسری طرف ملک کی بڑی آبادی دیہات

میں پھیلی ہوئی ہو مگر یہاں آبپاشی کا کوئی انتظام نہیں ہو اور ان چیزوں کی کاشت کے لیے پانی ناگزیر ہے چنانچہ ملک میں ایسے دیہات زیادہ ہیں جہاں ایک آدھ قسم کی معمولی ترکاری کے سوا اور کوئی ترکاری نہیں ملتی، لہذا دیہات میں ان کی کاشت میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ آبپاشی کا انتظام نہ ہو اور یہ اس قدر قلیل عرصہ میں ناممکن ہو البتہ جہاں پانی کی کثرت ہو وہاں ان چیزوں کی کاشت ممکن ہو گی مگر اس کا فایدہ مقامی طریقہ پر بہت ہی محدود رہے گا کیونکہ ترکاریاں سریع الزوال ہونے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں جا سکتیں نیز بوجہ نقل و حمل کی دشواریوں، ریلوں پر فوجی اغراض کے بڑھتے ہوئے بار، پٹرول کی کمی کی وجہ سے موٹر لاریوں کی مسدودی کی وجہ سے پھلوں کو بھی باہر نہیں بھیجا جا سکتا اب صرف ایک ہی چیز رہ جاتی ہو کہ "خود پیدا کرو اور کھاؤ" کے اصول پر عمل کیا جائے مگر ہندوستان جیسے ادنی معیار زندگی رکھنے والے ملک میں اس کا بھی امکان نہیں، یہاں اب بھی جہاں قیمتی پھلوں یا ترکاریوں اور غلوں کی کاشت ہوتی ہو وہاں عموماً پیدا کرنے والے ان چیزوں کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے بلکہ وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں۔ اور ان کی قیمت سے ادنی قیمت کی اشیا خرید کر زندگی کے دن گزارتے ہیں گویا ان کے نزدیک کسی شے کی ذاتی قدر و قیمت سے زیادہ اہم معاشی افادہ ہو اس طرح اس تحریک سے اس فایدہ کی امید رکھنا جس کی توقع کی جا رہی ہو فضول ہو۔

اب رہی دوسری صورت کہ چونکہ اعلیٰ قسم کے غلوں کی کمی ہو لہذا ان کے بجائے ادنیٰ غلے کھائے جائیں تو اس پر تو ہندوستان میں عام حالات میں عمل ہوتا ہی رہتا ہو عام طور پر چھوٹے قسم کے کاشتکار۔ کارخانوں کے مزدور، زرعی مزدور، اور اینٹ بھٹی اور پتھر کا کام کرنے والے اور چھوٹے چھوٹے دیہی اور شہری صناع اور دستکار مثلاً جولاہے، نجار، لوہار، چمار شمالی ہند میں باجرہ اور مکی، وسط ہند، برار اور مرہٹواری میں جوار، دکن میں راگی (مچینا) اور چاول کھانے والے علاقوں میں معمولی قسم کے موٹے اور سرخ چاول یا کنکیاں کھایا کرتے ہیں اب بھی ان کی غذا میں یہی چیزیں زیادہ شامل ہیں اور جب اعلیٰ قسم کے غلے قلت کی وجہ سے اور مہنگے ہو جائیں گے تب ہی وہ لوگ یہی چیزیں کھائیں گے اور ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ انہی طبقات پر مشتمل ہو۔ نہ ان پر غلہ ضایع کرنے کا الزام رکھا جا سکتا ہو اور غالباً غذ

ضایع ہونے سے مراد یہ ہی کہ مویشیوں، جانوروں یا پرندوں کو اچھے قسم کا غلہ کھلایا جاتا ہی اور نقل و حمل میں لاپرواہی اختیار کی جاتی ہی کہ غلہ کا کچھ حصہ ضایع ہو جاتا ہی یا ایسے گوداموں میں رکھا جاتا ہی کہ غلہ خراب ہو جاتا ہی یا کھیتوں میں جنگلی جانور اور پرندے غلہ کا نقصان کرتے ہیں، جو آدمی خود اچھی چیز نہ کھا سکے وہ اپنے مویشیوں یا پرندوں کو کیا کھلائے گا، بلکہ ان میں تو بعض لوگ بڑے بڑے بیوپاریوں اور منڈیوں کے کوڑے کرکٹ سے دانے چن چن کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اس طرح ضایع شدہ غلہ کو پھر پیدا کرتے ہیں۔

بہرحال غلہ کی کمی کو صرف پھلوں اور ترکاریوں کی زیادہ سے زیادہ کاشت یا غلے کو ضایع نہ ہونے والی تحریک کے ذریعہ پورا نہیں کیا جا سکتا بلکہ سب سے ضروری چیز غلے کے بیوپاریوں کے پوشیدہ اور مدفون ذخیروں کو بازار میں لانا ہی، اگر یہ سارا غلہ بازار میں آ جائے تو قلت کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا ۱۹۵۲ء میں درآمد و برآمد کے اعداد برابر ہونے کے باوجود قلت کی شکایت اس بات کا بین ثبوت ہی کہ ملک کے غلہ کا کچھ حصہ بازار میں نہیں آیا اور وہ اب بھی موجود ہی اور اس سال اس میں مزید اضافہ ہوا ہی غلہ کا ذخیرہ کرنے والوں میں صرف بڑے بیوپاری ہی نہیں ہیں بلکہ متوسط اور چھوٹے درجہ کے بیوپاری، دوکاندار آڑھتیے، مہاجن، بنیئے اور بڑے بڑے کاشتکار بھی شامل ہیں، دوسری چیز ان کی ناجائز منافع ستانی کو کو روکنا ہی۔ تیسرے نقل و حمل میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں پیدا کرنا ہیں تاکہ اشیا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکیں۔ ان باتوں کے ساتھ اگر ان تحریکوں پر بھی ضمنی طور پر بھروسہ کیا جائے تو مجموعی حیثیت سے صورت حال بہتر ہو سکتی ہی اور ملک قلت غذا کے گوناگوں ہولناک نتایج سے محفوظ رہ سکتا ہی۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

ٹالسٹائے

اہلِ بصیرت قدرت کے اس قانون سے بخوبی واقف ہیں کہ ہر اثبات میں اس کی نفی مضمر ہوتی ہے اور شاید اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر "ہر کمالے را زوالے" یا "ہر فرعونے را موسیٰ" کہا گیا ہے۔ ہر کمال کا وجود اس کی نفی زوال سے وابستہ ہوتا ہے اور فرعون کی گود میں موسیٰ کا پرورش پانا اس کی بہترین مثال ہے۔ قدرت کی کارسازی ختم نہیں ہوئی بلکہ جاری و ساری ہے۔ شاید اسی اصول کے ماتحت زار کی استبدادی حکومت اور دار و رسن کے ماحول میں اللہ پاک نے اسی حکمراں طبقہ میں زار کی نفی پیدا کی جو ایک قلندر کی شکل میں آئی جس کو دنیا نے لیو ٹالسٹائے کے نام سے پکارا۔

ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا تعلیم یافتہ نوجوان ہوگا جس کے مطالعہ میں اس روسی قلندر کی کوئی تصنیف نہ آئی ہو لیکن ایسے نوجوان بہت کم ہوں گے جن کو لیو کی خانگی زندگی کی جھلک دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ مندرجہ ذیل چند سطور میں لیو کے برادر نسبتی مسٹر بارس کے قلم سے لیو کی زندگی کے جو دو رُخ ہم تک پہنچے ہیں ہم ان کو پیش کرتے ہیں شاید یہ ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوں۔ ابتدا میں اس دور کے حالات پیش کیے جاتے ہیں جبکہ لیو ایک دنیادار کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور آخر میں وہ واقعات درج ہیں جبکہ لیو کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔

مسٹر بارس اپنی تصنیف "ٹالسٹائے کے حالات" کے دیباچہ میں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "جب لیو نے اپنے خاص طرزِ خیال کی تبلیغ شروع کی تو دنیا کو یہ معلوم کرنے کا اشتیاق ہوا کہ آخر یہ نیا رہبر اپنی خانگی زندگی کس طرح بسر کرتا ہے۔ کیونکہ مجھے لیو سے عقیدت اور اپنی بہن سے محبت تھی اس لیے گرمیوں کا موسم ضرور بہن کے پاس یالایانہ میں گزارتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے بہنوئی کے ساتھ رہنے سہنے اور ان کی خانگی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا ہے۔ مجھے لیو کے خانگی حالات بیان کرنے میں اس لیے تامل نہیں ہے کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے "مجھے دنیا میں کسی سے کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا

میں جو کچھ کرتا ہوں ساری دنیا دیکھ سکتی ہے۔ میں آخری مرتبہ ۱۹۳۸ء کے موسم خزاں میں تیو سے ملا جبکہ ان کی زندگی میں وجدانی انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور اگرچہ میں دو ماہ پالا پانہ میں بہن اور بہنوئی کا مہمان رہا لیکن چونکہ اس وقت میری زندگی اور خیالات تیو سے مختلف ہو چکے تھے لہٰذا پہلی سی بات پیدا نہیں ہوئی بلکہ میرے اور تیو کے تعلقات میں ایک قسم کی بے لطفی سی رہی۔ ان چند سطور میں مستند عزیزوں سے سنے ہوئے یا چشم دید حالات بیان کر رہا ہوں وغیرہ" -

اب ابتدائی حالات سنیے مسٹر بارس تحریر فرماتے ہیں "ابھی تیو کی عمر شاید تین سال کی تھی کہ والدہ گزر گئیں۔ نو برس کے ہوئے تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا قریبی عزیزوں نے پالا۔ تیو کی چچی صاحبہ کا بیان ہے بچپن میں یہ بڑا تیز اور شوخ تھا اور اکثر ایسی حرکتیں کرتا جن کا کسی کو سان و گمان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن دل کا گرم اور نرم تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے ہم گھوڑا گاڑی میں سفر کو جا رہے تھے گاڑی میں گھوڑے جوتے جا رہے تھے کہ تیو غائب۔ سب پریشان کہ بچہ کہاں غائب ہو گیا ابھی ادھر ادھر نظر دوڑا ہی رہے تھے کہ ایک سمت سے آواز آئی اماں! ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں دیکھتے کیا ہیں کہ آپ سر منڈا رہے ہیں آدھا سر منڈ چکا ہے اور آدھا منڈنا باقی ہے۔ خبر نہیں کیا جی میں آئی کہ گاڑی جانے والی ہے اور سر منڈانے چلا گیا۔ میری والدہ صاحبہ نے بھی تیو کے بچپن کا ایک قصہ سنایا جس کا تیو نے اپنی تصنیف "بچپن" میں ذکر نہیں کیا۔ ابھی کمسنی ہی تھی کہ تیو کو ایک لڑکی سے محبت ہو گئی لیکن رشک کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اس نو برس کی لڑکی نے کسی دوسرے بھولے لڑکے سے بات کی تو تیو نے اپنی محبوبہ کو اٹھا کر چھجے کے نیچے پھینکدیا شروع ہی سے طبیعت کی افتاد مذہبی تھی نوعمری ہی میں ایک بیاض بنا لی گئی تھی جس میں ہر گناہ اور غلطی درج کر دی جاتی تھی تاکہ دوبارہ اس کا ارتکاب نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم تو گھر پر ہوئی پھر کازان یونیورسٹی میں داخلہ کرا لیا لیکن کالج کی زندگی کچھ کامیاب ثابت نہیں ہوئی جس کا تیو کو مدت تک افسوس رہا اور ناکامی کی وجہ سے اس زمانہ میں کچھ احساس کمتری بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ناکامی ہوئی تو کالج چھوڑ فوج میں بھرتی ہو کر قفقاز چلے گئے وہاں خوب عیش و نشاط سے زندگی بسر کی۔ وہاں کے قیام کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ تیو جوئے میں کثیر رقم ہار گئے۔ جب قرضہ کی

اور تصنیف کا کام شروع کر دیتے۔ گرمی کے موسم میں بھی کام نہ چھوٹتا حالانکہ آپا اور بچے ان کی صحت کے خیال سے کام ختم کر دینے کی التجا کرتے لیکن وہ کام کرتے ہی رہتے میں نے کسی کو اتنے تواتر اور مستعدی سے کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

صبح سویرے چہل قدمی یا گھوڑے کی سواری یا تیراکی کرتے۔ واپس آکر ناشتہ ہوتا، ناشتہ کے وقت میز پر بڑی دلچسپ باتیں کرتے، دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہتا، دن بھر کے لیے پروگرام بنتے، ناشتہ کر چکتے تو یہ کہکر اٹھ جاتے "اچھا بھئی اب کام کرنا چاہیے" اور ایک تیز چائے کا پیالہ لے کر اپنے کتب خانے میں چلے جاتے جس دن کام نہ کرتے اس دن میں بہت خوش ہوتا کیونکہ پھر سارا دن باتوں یا بچوں سے کھیل کود میں گزرتا یا بچوں کے ہمراہ کتوں کو ساتھ لے شکار کو نکل جاتے جاڑوں میں اسکیٹ کرنا یا اسکیٹ کی جگہ سے برف ہٹانا بچوں کے لیے سب سے زیادہ دل خوش کن مشغلہ تھا یا پھر لیو اور میں میدان کی گھاس کاٹتے یا کیاریاں کھودتے یا وزنی پتھر زیادہ دور پھینکنے میں مقابلہ کرتے۔ وزنی پتھر دور پھینکنے میں تو لیو مجھ سے نمبر لے جاتے لیکن دوڑنے میں میں تیز تھا اس پہ بھی کبھی آگے نہ نکل سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بھی میں برابر آکر آگے نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ کچھ ایسی حرکت کرتے یا بات کہتے کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی اور دوڑ ختم ہو جاتی اکثر یہ ہوتا کہ جب سیر کو نکلتے تو ان کی نظر کسی تھکے ہوئے گھسیارے پر پڑ جاتی وہ خود اس سے درانتی لے کر گھاس کاٹنے لگتے اور گھسیارے کو آرام کرنے دیتے۔ مجھ سے فرماتے "ان لوگوں کو نہ کھانے کو ملتا ہے اور نہ پینے کو لیکن دیکھو کتنی مشقت کرتے ہیں۔ ذرا تم یہ کام کر کے دیکھو کتنی مشقت کرنی پڑتی ہے" جب وہاں سے چلتے تو مٹھی بھر سوکھی گھاس لے لیتے اور اس کو سونگھتے چلے آتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھاس کی خوشبو لیو کو مدہوش کیے ڈالتی ہو کھیلوں میں ان کا سب سے زیادہ دل پسند کھیل سوار کا حملہ تھا یہ خود ان کا ایجاد کردہ کھیل تھا اس کھیل کی نوعیت یہ تھی کہ وہ یک لخت کھڑے ہو جاتے ایک ہاتھ ہوا میں اٹھا ہوا دوسرا جیسے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے یوں ہاتھوں کا یہ انداز قائم رکھکر سوار کے زیر و بم کو ملحوظ رکھتے ہوئے کمرے میں دوڑ لگاتے جس میں نہ صرف بچے بلکہ ہم بڑے بھی شریک ہو جاتے، خوب اودھم مچاتے اور خوب ہنسی رہتی گھر میں خود اتنی تفریح رہتی تھی کہ باہر جانے اور دوست پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ لیو

کے صرف دو چار ہی ملنے والے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے اگر کبھی بچوں کے لیے علم کی تلاش یا اپنی کسی تصنیف کی اشاعت کی خاطر ماسکو کا جانا نکلتا تو کئی دن پیشتر سے تقدیر کی شکایت شروع ہو جاتی کہ ماسکو جانے کی مصیبت مقدر میں تھی۔ دیہات کی زندگی پسند تھی اور اگر ضرورتاً کسی بڑے شہر میں جانا پڑتا تو وہاں پہنچتے ہی طبیعت کی جولانی ختم ہو جاتی۔ قدرتی مناظر کے بہت دلدادہ تھے اور فرمایا کرتے تھے "خدا نے خود محظوظ ہونے کے لیے کتنے حسن اور خوبیاں پیدا کی ہیں۔ ہر ہر ذرہ حسن ایک نئی اور تازہ شان سے اس حاکم مطلق کے سامنے آتا ہے" جب کبھی لکھتے لکھتے طبیعت رک جاتی یا گھر کی کوئی بات ناگوار گزرتی تو طبیعت کو رواں کرنے یا افسردگی دور کرنے کے لیے سیر کو نکل جاتے۔ ٹیو تمام تمام دن برابر چل سکتے تھے اور وہ اور میں بارہ بارہ گھنٹے گھوڑے کی کمر پر رہے ہیں صبح کی سیر موسم خراب ہونے پر بھی نہیں چھوٹتی تھی۔ ورزش اور گھوڑے کی سواری کا بڑا شوق تھا۔ اپنے کتب خانے میں بھی ڈمبلوں کی ایک جوڑی رکھی ہوئی تھی اور جب لکھنے پڑھنے سے طبیعت تھک جاتی تو ورزش کرنے کے مختلف آلات کی درستی میں مشغول ہو جاتے۔

مکان میں آرائشی ماحول پیدا کرنے کے خلاف تھے فرمایا کرتے تھے "آرائشی ماحول جسم و روح کی نمو کے لیے بُرا ہے" اسی وجہ سے یاآلایانہ میں گھر کا سامان بہت معمولی رکھا جاتا تھا۔ خود بھی لچکدار پلنگ پر آرام نہیں کرتے تھے۔ لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ گھر پر کبھی سخت کف کی قمیص استعمال نہیں کرتے تھے۔ لباس کی تراش میں آرام کا خیال رکھا جاتا تھا نہ کہ فیشن کا۔ گاؤں کی ایک بڑھیا باربارا نامی کو ٹیو کی پسندیدہ تراش کی خبر تھی اور وہی ہمیشہ کپڑے سیا کرتی تھی۔ کپڑوں کے اوپر ایک پورا یا آدھا چغہ پہنا کرتے تھے جو وہاں کے موسم میں بہت آرام دہ ثابت ہوتا تھا۔ اکثر مہمان اور گھر والے بھی اس کو استعمال کرتے تھے ریل کے سفر سے نفرت بھی فرمایا کرتے تھے "ریل کے ڈبہ میں بیٹھ کر مجھے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔" انھوں نے اپنے مضامین میں بھی تحریر کیا ہے کہ "ریل کی ایجاد سے انسان کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے" چونکہ ان کو خود مسافروں سے باتیں کرنے کا بڑا شوق تھا اس لیے ریل کے ڈبہ میں ایک دوسرے مسافر کی آپس کی بے اتفاقی ان کو بہت ہی شاق گزرتی تھی۔ ہمیشہ تیسرے درجہ میں سفر کرتے اور خاص طور پر اس درجہ میں بیٹھتے تھے

جس میں دیہاتی ہوتے تھے ڈاکٹروں کے بہت خلاف تھے ان کا خیال تھا کہ طبابت کسی خاص انسان کا پیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ہر شخص کو طبیب ہونا چاہیے نفیری انکوں اور بڑے بوڑھوں کی بتائی ہوئی دوا پر زیادہ اعتقاد تھا تاہم گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو ڈاکٹر آتے تھے۔

بچوں سے بڑا شوق تھا اور انھیں جلدی بچوں کو مانوس کرنے کی ترکیب بھی آتی تھی بچوں کے خیالات کو بھی فوراً تاڑ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ان کا بچہ بھاگا ہوا آیا اور کان میں کہنے لگا ایک راز کی بات ہے لیکن بات نہ بتائی کچھ دیر تو ٹیپو اصرار کرتے رہے کہ میاں بتا دو پھر بچہ کے کان میں وہی راز کی بات کہہ دی۔ بچہ کو بڑا تعجب ہوا وہ چلایا "اف ہمارے ابا جان کیسے ہیں یہ راز کی بات انھیں کیسے معلوم ہوگئی"

جب سے اپنے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تو بچوں کے تعلیمی مسائل میں خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ان مسائل پر انھوں نے بہت سے مضامین لکھے، اور بچوں کے لیے قاعدے اور کہانیوں کی کتابیں بھی تحریر کیں۔ ان کا خیال تھا کہ دیہاتی بچوں کو پڑھانے کے لیے استاد بھی دیہاتی ہونے چاہئیں جو ان میں نئی روحانی امنگیں پیدا کریں اور وہ رجحانات پیدا نہ کریں جو بحیثیت ایک دیہاتی ہونے کے ان کے لیے مضر ہوں اور ان کو اس دیہاتی کام کرنے کے ناقابل کر دیں جو انھیں آیندہ زندگی میں کرنا ہے اور ٹیپو کا یہ بھی خیال تھا کہ شہری معلم دیہاتی بچوں کی نفسیاتی کیفیت اور ضرورت کو نہیں سمجھ سکتے اسی خیال کی بنا پر انھوں نے اپنے گاؤں میں معلموں کا کالج کھولنے کی کوشش کی لیکن حکومت نے اجازت نہ دی اس زمانہ میں آپ کا خط آیا جس میں تحریر تھا "ٹیپو آج کل تعلیمی کاموں میں بہت مشغول ہیں خاص کر معلموں کے لیے اسکول قایم کرنے میں صبح سے رات تک لگے رہتے ہیں مجھے ان کی اس مشغولیت سے خوشی نہیں ہوتی کاش کہ اتنی دردسری کسی ناول لکھنے میں کی جاتی اور آخر ایک ذرا سے دیہات میں اس دردسری مول لینے سے کوئی عظیم الشان فائدہ تو ہو نہیں سکتا"

متعدد ناکامیوں کے بعد جب ادبی دنیا میں ان کو کامیابی ہوئی تو فرمایا کرتے "مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں بحیثیت ایک مصنف کے کامیاب ہوں مجھے مسرت ہوتی ہے کہ میں خاندانی بز ہوں اور مصنف بھی" اپنے کسی پرانے دوست کی ترقی کی خبر سنتے تو درباری زندگی کے تخریبی پہلو کا

ذکر فرماتے اور کہا کرتے وہاں تو خوشامد اور عیاری سے عہدے مل جاتے ہیں" ایک دن ہنس کر فرمانے لگے "میں جرنیلی کے قابل تو نہیں ہوں لیکن مجھے ادبی دنیا کی جرنیلی مل گئی ہے۔ ایک دن میں اور وہ سیر کر رہے تھے کہ میں نے ذکر کیا کہ جب ہم قانون کے کالج میں تھے تو آپ کا ناول صلح و جنگ بہت شوق سے پڑھتے تھے اور دوسرے مصنفوں کی بہ نسبت ہم طلبا کو آپ کے ناول بہت پسند تھے یہ سن کر ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے اور فرمایا "مجھے اپنی تعریف سن کر کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی کہ آج ہوئی کیونکہ نوجوان ہی تو حسن و خوبی کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اخباری نمائندوں سے بغض للہ تھا اگر کوئی ان کا مصنفوں میں شمار کرتا تو ناراض ہو جاتے اور کہتے "اخباری دنیا نے اپنے آپ کو گرا لیا ہے" وہ نہ کبھی اخبار پڑھتے اور نہ اپنی تصانیف پر اخباری تنقید پڑھتے۔

فرمایا کرتے تھے کہ ایک خاندانی شخص بغیر روپے پیسے کے ایسا ہے جیسا گھوڑا بغیر دانے کے" اس لیے اپنے بچوں کی آسودگی کا خیال کرتے ہوئے گاؤں کو ترقی دینے کی بہت کوشش کرتے تھے مویشیوں کی نسل بہتری کی تدابیر کرتے کھیتی باڑی کرنے باغ لگانے اور شہد کی مکھیاں پالنے اور ہر قسم کا شکار کھیلنے کا بڑا شوق تھا ایک مرتبہ شکارگاہ میں ٹیو کو ریچھ نے آ دبایا اگر دوسرے شکاری ریچھ کے گولی نہ مار دیتے تو کام تمام تھا ماتھے پر جو نشان ہے وہ اسی ریچھ کے پنجے کا ہے یادگار کے طور پر اس ریچھ کی کھال اب بھی یاسنایا پولیانہ میں محفوظ ہے۔ زندگی کا دوسرا حادثہ بھی شکار ہی میں پیش آیا۔ وہ گھوڑے پر جا رہے تھے راستہ میں ایک خندق آئی۔ گھوڑے کو جو ایڑ دی تو گھوڑا جھجکا اور سوار اور گھوڑا دونوں خندق میں جا پڑے اس حادثہ میں ٹیو کا شانہ اتر گیا خندق سے اٹھ کر گھر کی طرف چلے لیکن کچھ دور ہی چلنے پائے تھے کہ تکلیف سے بیہوش ہو گئے اور راستہ میں گر پڑے اتفاق سے ایک چھکڑے والا ادھر آ نکلا وہ ٹیو کو چھکڑے میں ڈال کر گھر پہنچا گیا۔ ڈاکٹر بلایا گیا جس نے بیہوشی کی دوا سونگھا کر جراحی کی اور باوجود اس کے کہ بیہوش تھے چار آدمیوں نے ان کو پکڑا تب کہیں جراحی ہو سکی ورنہ وہ بیڑ پر سے اچھل پڑتے تھے

ٹیو کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ خوش گو اور محبت کرنے والے مہربان انسان ہیں ان کو میں نے کبھی نوکروں کو جھڑکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نوکر بھی ان سے محبت کرتے تھے، اور ایسا کوئی کام نہیں

کرتے جس پر تیو کو اعتراض ہو میں نے شکار میں ان کو کبھی گھوڑے یا کتے کو چابک مارتے ہوئے نہیں دیکھا ایک اور عادت یہ تھی کہ سوتے ہوئے آدمی کو خود کبھی نہیں اٹھاتے اگر زیادہ ضرورت ہوتی تو اکثر مجھ سے فرمایا کرتے کہ فلاں ملازم کو اٹھا دو۔

جب متواتر کام کرنے سے تیو کی صحت خراب ہونی شروع ہوئی تو علاج کا خیال پیدا ہوا اور یہ قرار پایا کہ جنوبی روس جا کر نبیذ کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ جنوبی روس میں کرائیک کے مقام پر ایک مسلمان مُلّا کے مہمان ہو گئے یہاں نبیذ کے استعمال اور باقاعدہ پرہیز سے اُن کی صحت کافی اچھی ہو گئی حسب دستور تیو سب سے محبت سے ملتے تھے اس لیے بہت سے لوگ دوست ہو گئے وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اگر تیو کسی شے کی تعریف کر دیتے تو میزبان وہ شے ان کو تحفتاً پیش کر دیتا ایک مرتبہ تیو نے ایک گھوڑی کی تعریف کی تو چلتے وقت میزبان نے وہ گھوڑی ہمارے ساتھ کر دی جب وہ لوگ ہمارے یہاں آتے تو ہم بھی ان کو تحفہ پیش کرتے جنوبی روس میں جب مسلمان قبائل سے ملنے کا اتفاق ہوا تو اس کا تیو پر یہ اثر ہوا کہ بالالایانہ واپس آ کر انھوں نے قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پڑھا بالالایانہ پہنچ کر ایک مسلمان کو جس کے پاس گھوڑیوں کا ایک گلہ تھا ہم نے دعوت دی وہ اپنا سب گھر بار لے کر آ گیا۔ بڑا ایماندار، وفادار اور سلیقہ کا انسان تھا اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر ہم نے اسے بلایا تھا وہ اپنے خیمہ میں رہتا تھا جس کو وہ بڑا صاف ستھرا رکھتا تھا ہم اکثر اس کے پاس گپ شپ کرنے جاتے اس کے خیمہ میں ایک طرف ایک چھینٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا جب کوئی اجنبی آتا تو روما نوچ (مسلمان کا نام) کی بیوی اس پردے کے پیچھے ہو جاتی تھی اور مہمان کے لیے پردے سے ہاتھ نکال کر نبیذ کی بوتلیں اور لکڑی کے پیالے دیتی رہتی۔ تیو مذاق میں اس خیمہ کو اپنا سیلون کہا کرتے تھے کچھ مدت بعد تیو نے سمارا میں اور زمین خریدی اور روما نوچ کو کارندہ بنا کر لے گئے وہاں روما نوچ نے تیو کے اشارہ سے پندرہ میل کی ایک گھوڑ دوڑ کا انتظام کیا ڈھنڈورے سے پٹے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تیس گھوڑے دوڑ میں شریک ہوئے گھوڑوں پر دس دس برس کے بچے بلا کاٹھی کے تھے۔ دوڑ ہوئی اور جو جیتے ان کو پنسل، بندوق، گھڑی وغیرہ انعام میں دی گئیں۔ دو دن تک دعوتیں اور جشن رہے۔ یہ میرا تیو کے ساتھ گرمی گزارنے کا آخری موقع تھا کیونکہ اس کے بعد مجھے ملازمت مل گئی تعلقا[illegible]

تعیناتی ہوئی اور سب عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہو کر میں پردیس چلا گیا۔

تیو کی زندگی کا دوسرا دور بیان کرتے ہوئے بارٹس صاحب تحریر فرماتے ہیں نو سال گزر چکے ہیں میں اپنی نئی زندگی کا عادی ہو چکا ہوں پالا یانہ احباب کی نئی راہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں، سے کبھی کبھی کوئی خط آ جاتا ہے اور خیریت معلوم ہو جاتی ہے ۱۸۸۸ء میں جب میں پہلی مرتبہ وطن واپس ہوا تو بڑا جوش تھا کہ پالا یانہ جانے کا موقع ملا جب پالا یانہ پہنچا تو تیو اپنی مشہور تصنیف کرنز رسونیٹا کا آخری باب لکھ رہے تھے جس کے معنی تھے کہ انھوں نے اپنے لیے ایک خاص لائحہ عمل مقرر کر لیا تھا میرے پہنچتے ہی میری آپا مع اپنے سب بچوں کے مجھے خوش آمدید کہنے بڑھیں میری آپا خوشی میں چور ہو رہی تھیں بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہتیں تم نے اس کو پہچانا اور دیکھو یہ تو ماشاءاللہ اب تم سے بھی بڑی ہو گئی میری آپا تو یہ باتیں کر رہی تھیں اور میری آنکھیں تیو کو ڈھونڈ رہی تھیں چند منٹ بعد کتب خانہ کا دروازہ کھلا اور تیو مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے دوسرے کمرے میں آئے ویسے تو خندہ پیشانی سے ملے لیکن لب و لہجہ میں ایک متانت تھی جس سے مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ پالا یانہ میں اب پہلی سی زندگی بسر نہیں ہو سکتی ان نو برسوں میں وہ سفید ہو چلے تھے اور چہرے سے بھی روحانی کش مکش کے آثار نمایاں تھے، چہرہ اداس سا تھا۔ میں دو ماہ تک پالا یانہ میں رہا اور اس اثنا میں مجھے تیو کے فلسفہ اور نئی طرز زندگی کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اس باب میں وہ سب کچھ بیان کروں گا جو میں نے دیکھا۔

ابتدائی زمانہ میں تیو کے کیا مذہبی تخیلات تھے اس کا مجھے تفصیل سے علم نہیں لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی زمانہ میں وہ بھی کلیسائی مذہب پر کاربند تھے اور شادی کرنے سے پہلے انھوں نے گرجا میں جا کر اقرار اعمال بھی کیا تھا اس ضمن میں ایک قصہ اور بیان کر دوں جو ابتدائی طرز خیال پر روشنی ڈالتا ہے۔ جب میں کوئی ۱۷ یا ۱۸ برس کا تھا تو میرے ایک دوست کو اور مجھے اپنی روحانی ترقی کا خیال پیدا ہوا اور ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ رہبانیت اختیار کرنی چاہیے جب میں نے اپنے اس ارادہ کا تیو سے ذکر کیا تو انھوں نے مجھے اس مسئلہ کے مختلف پہلو سمجھائے لیکن کبھی اپنی ذاتی رائے کا اظہار نہ کیا اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ تیو اور میں ایک مرتبہ اس گاؤں سے گزرے جہاں تیو کے ماں باپ کی قبریں ہیں حسب دستور

موت کے بعد کی زندگی کا ذکر ہو رہا تھا اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک انسان مستقبل کی زندگی کا مسئلہ حل نہ کرلے وہ کس طرح آسودہ خاطر رہ سکتا ہو نظر جو اٹھی تو ہم دونوں نے یہ دیکھا کہ دو گھوڑے قبروں کے قریب گھاس چر رہے ہیں۔ ٹیو نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا: وہ دو گھوڑے دیکھ رہے ہو معلوم ہو وہ کیا کر رہے ہیں: یہ اپنے مستقبل کی زندگی کا مسئلہ حل کر رہے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ میرا مطلب اس مادی زندگی سے نہیں ہو بلکہ میرا اشارہ روحانی زندگی کی طرف ہو اس پر وہ بولے اچھا یہ بات ہو! تو بھائی اس کے متعلق تو مجھے نہ کچھ معلوم ہو نہ کچھ معلوم ہی کر سکتا ہوں۔"

ٹیو کے خاندان کے چند بزرگ راہب ہونے آئے تھے آخری عمر میں ٹیو کی چچی صاحبہ بھی راہبہ بن گئیں تھیں لیکن کبھی کبھی پارا یانہ تشریف لایا کرتی تھیں اور ان کا انتقال بھی وہیں ہوا سنہ ۱۸۵۰ء میں ٹیو میں مذہبی انقلاب پیدا ہونا شروع ہوا اب انھوں نے باقاعدہ کلیسا جانا شروع کر دیا اور ہر روز صبح کو مراقبہ میں بیٹھنے لگے اسی زمانہ میں پاپیادہ او پٹینا من کی خانقاہ کی زیارت کو بھی گئے۔ اب ان میں پہلی سی شگفتگی کے بجائے عاجزی وانکساری پیدا ہو گئی اس زمانہ میں میری آپا کا ایک خط آیا جس میں تحریر تھا ٹیو اب پورے کلیسا ئی عیسائی ہو گئے ہیں یہاں ٹیو کے مذہبی معتقدات کے ذکر کی ضرورت نہیں کیونکہ ٹالسٹائی نے خود اپنی تصنیف "اعترافات" میں ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہو اور اس موضوع پر ان کی تفسیر بھی موجود ہو جس کو پادریوں کی انجمن کے حکم سے شاہراہ عام پر جلایا گیا تھا لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہو کہ اس زمانہ میں ٹیو کی روح میں اس درجہ پیچ و تاب تھا کہ ایک مرتبہ خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔

ٹیو کی تعلیم نے مختلف لوگوں پر مختلف اثر کیا لوگ ان کی تعلیم کا گہرا مطالعہ کیے بغیر اس پر اعتراض کرنے لگے ٹیو فرمایا کرتے تھے: لوگ جتنی زیادہ کوشش میری تصانیف کو سمجھنے کی کریں گے اتنے ہی کم اعتراض کریں گے۔ ان کا تمام فلسفہ انجیل مقدس کے اس حکم پر مبنی تھا "اپنے پڑوسی سے محبت کرو" اس اصول کو بنیاد مان کر ٹیو نے تین اصول قایم کیے۔

(۱) برائی کا طاقت سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) انسان کو چاہیے کہ جتنا وہ بذات خود پیدا کرے اتنا ہی استعمال کرے۔

(۴) مرد و عورت کو چاہیے کہ پاک اور طاہر ہونے کی کوشش کریں۔

اپنے فلسفہ کی بابت مجھ سے فرمایا کرتے تھے "میرا پہلا اصول یہ ہے کہ برائی کا مقابلہ طاقت سے نہ کرو
۔ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ زندگی تنازع للبقا کا نام ہے صرف انسان اور قدرت کے درمیان ہی نہیں بلکہ
انسان انسان کے درمیان تنازعہ ہونا زندگی اور ترقی کی واحد شرط ہے۔ یہ تنازع للبقا وہ طاقت ہے جو انسانیت
ترقی کی سمت دھکیل رہی ہے۔ معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ میرا یہ اصول ایک علمی نظریہ کے لحاظ سے اگرچہ
ناقابل تردید ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ کوئی ایسا اصول نہیں جو قابل عمل ہو۔ اس اعتراض کا میں یہ جواب دیتا ہوں
کہ سب سے پہلے انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ قدرت نے انسان میں کیا جذبہ ودیعت کیا ہے ہمسایہ سے
دشمنی کرنے کا یا دوستی کا ۔ اور جب ظاہر ہے کہ اپنے ہمسایہ اپنی اولاد، اپنے ملازموں اور اپنے جانوروں سے
محبت کرنا زیادہ مفید ہے تو دوسرے لوگوں کے ساتھ اسی جذبۂ محبت سے کام لینا کیوں نہ مفید ہوگا (یعنی
جب ہم اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہمسایوں سے محبت کا سلوک کرتے ہیں اور یہ سلوک ان کی ترقی کا
باعث ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم باقی بنی نوع سے کیوں جبر و تشدد سے پیش آئیں اور ان کے ساتھ برتاؤ
میں کیوں تنازع للبقا کے اصول پر کاربند ہوں) ہمسایہ سے محبت کرنے کا اصول ایک ایسی حقیقت ہے
جس کو بلا دلیل مانا جا سکتا ہے جب ایسا ہے تو تنازع للبقا کا اصول ایجاد کرنے کی کیا ضرورت ہے تنازع للبقا
کی کشمکش انسان اور انسان میں نہیں بلکہ انسان اور قدرت کے درمیان ہونی چاہیے۔ یعنی انسان کی ترقی
کا راز انسان کا انسان سے مقابلہ کرنے میں نہیں ہے بلکہ انسان کا قدرت سے تنازعہ کرنے میں ہے جس کے
سبب دنیاوی ترقی حاصل ہو سکتی ہے مثلاً بجلی اور بھاپ پر قابو پا کر طرح طرح کی مشینیں بنانا۔ معدنیات
کی ماہیت معلوم کر کے اس سے فائدے اٹھانا وغیرہ وغیرہ) یہ باہمی کشمکش کا قانون انسانوں میں نفاق پیدا
کرتا ہے اور بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی اس نفاق کی وجہ سے قدرت کے خلاف موثر طریقہ پر تنازع للبقا
کی کشمکش جاری نہیں رکھ سکتے تنازع للبقا کے اصول پر کاربند ہونے سے دنیا میں جرائم بڑھتے ہیں اور قوم
قوم میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ موجودہ اقتصادی نظریوں کو دیکھو یہ دولت کو انسانی قدر و منزلت کا معیار ٹھیراتے
ہیں لیکن دولت ہی وہ شے ہے جس سے انسان اپنے ہمسایہ کو غلام بناتا ہے بلکہ اس کی حالت غلاموں سے

بھی بدتر کر دیتا ہے یہ صحیح ہے کہ دانشمند ظاہری تشدد نہیں کرتا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اقتصادی تشدد سے کام لیتا ہے اس لیے یہ جدید غلامی پرانی غلامی سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ اس سے بدتر ہے دوسرے یہ کہ موجود اقتصادی نظام کسی طرح دولت کی تقسیم میں مساوات قایم نہیں رکھ سکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں کتنی بے انصافی پھیل گئی ہے پس جب دنیا میں اتنی بے انصافی پھیل گئی ہو تو ہمارے لیے خاموش بیٹھے رہنا جائز ہے ہمیں کوئی دوسرا لایحۂ عمل تلاش کرنا چاہیے۔ وقت آ رہا ہے کہ دنیا میرا پیغام سمجھے گی اور مجھے یقین ہے کہ اس وقت دنیا بجائے تنازع للبقا کو ترقی کا محرک خیال کرنے کے کوئی اور ترقی کا نظریہ پیش کرے گی۔ اس وقت اگرچہ قدرت کے خلاف تنازعہ رہے گا لیکن وہ ایک خوش کن طریقہ پر ہوگا اور دنیا زیادہ سکون و راحت کی زندگی بسر کر سکے گی۔ اگر میرا پہلا اصول مان لیا جائے تو دوسرے کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں خود ضبط نفس کرنا اس سے بہت بہتر ہے کہ دنیا کی بیشتر مخلوق کو زبردستی ضبط نفس کرایا جائے۔ تیسرے اصول کو کیو نے اپنے ناول کرٹزر سوناٹا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

اب یہ عرض کرتا ہوں کہ اس فلسفہ کا خود کیو پر کیا اثر ہوا ہے ان فلسفیانہ تخیلات نے کیو کے دل و دماغ کو بدل دیا ہے۔ ان کی زندگی کا ہر شعبہ اس فلسفہ سے متاثر معلوم ہوتا ہے ان کی بعد کی تصانیف میں اس فلسفہ کا گہرا اثر ہے اب کیو کے لیے ہر شئے کے حسن و قبح کا معیار اس پر ہے کہ وہ محبت میں اضافہ کرتی ہے یا کمی۔

چونکہ عام طور سے بچوں کو تعلیم اس خیال سے دی جاتی ہے کہ وہ آیندہ زندگی میں گرد و پیش کے ہمسایوں سے خوش حال ہوں اس لیے کیو نے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لینی ترک کر دی ہے اور آپ کا بھی دلچسپی لینا ان کو ناگوار گزرتا ہے جب بڑا لڑکا یونیورسٹی سے ڈگری لے کر آیا اور اپنے ابا جان سے آیندہ زندگی کی بابت مشورہ کرنے لگا تو یہ مشورہ ملا جاؤ گانو میں دوسرے دیہاتوں کی طرح کام کرو۔ کیو نے خود بھی دیہاتوں کی سی زبان اور انھی کی سی عادات اختیار کرنی شروع کر دی تھیں۔ اب وہ صرف آرام و آسایش ہی کو برا نہیں کہتے تھے بلکہ دوسرے سے صفائی کرانے کے بھی خلاف تھے وہ خود پانی بھر کر لاتے اور خود حمام گرم کرتے۔ پہلے تو کسی سے ملتے جلتے تھے لیکن اب ہر دیہاتی کو اجازت تھی کہ جب وقت چاہے مشورہ کرنے آ سکتا تھا ان کا اب یہ بھی عقیدہ ہو گیا تھا کہ ملکیت گناہ ہے چونکہ اس کا قیام طاقت کے بل بوتے پر ہوتا ہے اپنی جایداد کی بابت انھوں نے مجھ سے

کہا کہ وہ اس سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں لیکن دشواری یہ تھی کہ اگر کسی کو دیں تو ان کے عقیدہ کے مطابق اسکو گناہ میں ڈالیں دوسرے آپا جایداد کو خیرات کرنے کے خلاف تھیں پہلے لیو نے جایداد آپا کے نام کرنے کو کہا جب انھوں نے انکار کیا تو بچوں کے نام کرنے کا ارادہ کیا لیکن ان دونوں صورتوں میں وہی دشواری پیش آئی کہ ان کو گناہ میں مبتلا کرنا ہوگا آخر کار اس اصول کے مطابق کہ گناہ کو طاقت سے نہیں روکنا چاہیے وہ اس طرح زندگی بسر کرنے لگے جیسے ان کے پاس جایداد ہی نہیں جایداد کی آمدنی سے متمتع ہونا ترک کر دیا اور سوائے اس کے کہ وہ آپا یانہ کے گھر میں رہتے رہے لاکھوں کی جایداد سے خود کسی قسم کا فایدہ نہیں اٹھایا البتہ بچوں کو آمدنی ملتی ہے آپا کا بیان ہے کہ وہ ہر سال تین چار ہزار روبل خیرات کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مفلس دہقان ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرا جھونپڑا گر گیا ہے بَلیاں دیدو اسی وقت لیو مجھے ساتھ لے کر دو کلہاڑے کندھے پر رکھ جنگل روانہ ہو گئے وہاں درخت کاٹے ان کی شاخیں الگ کیں۔ بلیوں کو دہقان کی گاڑی پر رکھا اور روانہ کر دیا مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں نے وہ محنت بڑے خلوص سے کی اور محنت کرنے کے بعد میں بہت مسرور ہوا جب ہم درخت کاٹ رہے تھے تو بے چارہ بڈھا غریب دہقانی احسانمند نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا جب شکر گزاری کے بعد وہ دہقانی چلا گیا تو لیو کہنے لگے: "کیا تمھیں اس میں اب بھی شک ہے کہ ہمسایہ کی مدد کرنا ضروری ہے اور کیا تمھیں اس خدمت سے خوشی نہیں ہوئی؟"

اگرچہ لیو نوجوانی ہی سے شراب اور تمباکو پینے کے عادی تھے لیکن اب یہ دونوں عادتیں ترک کر دی تھیں۔ نوکروں سے کام لینا بھی چھوڑ دیا تھا کھانے کی میز پر اگر کوئی ملازم رکابی پیش کرتا تو لے تو لیتے لیکن چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو جاتے کیونکہ وہ کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے گھوڑے کی سواری اور شکار کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے: "نہ معلوم پہلے کیسی نفسیاتی کیفیت تھی کہ شکار کا شوق تھا، اب صرف ترکاری پر قناعت کرتے۔ سردی میں جب تمام گھر والے ماسکو جاتے تو خود دو چار روز بعد یالایانہ سے سو میل ماسکو پیدل جاتے (کیونکہ گھوڑے کو تکلیف دینا برا سمجھتے تھے) مجھے انھوں نے یقین دلایا کہ باوجود اتنی مسافت طے کرنے کے ان کو بالکل تکان نہیں ہوتی گھر والوں کی روانگی کے بعد اپنا کھانا خود پکاتے۔ دو چار روز بعد اس لیے جاتے کہ میری آپا کو یہ معلوم ہو کر تشویش نہ ہو کہ پیدل سفر کیا جائے گا اب

صبح کی سیر بھی بند ہوگئی تھی اس کی جگہ ہل چلانے لکڑی کاٹنے اور غریبوں کی جھونپڑیوں کی مرمت کرنے نے لے لی تھی ڈاکٹروں سے اب بھی پہلی سی ہی بد دلی تھی۔ ایک مرتبہ اگوٹھے میں چوٹ لگ گئی جب تکلیف بڑھی تو یہ جانتے ہوئے کہ لیو ناراض ہوں گے میری آپا نے ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ڈاکٹر سامنے آیا تو کہنے لگے "زیادہ فیس ملنے کی توقع تمھیں یہاں لائی ہوگی" ڈاکٹر نے خاموشی سے جواب دیا "تعجب ہے کہ آپ محبت کی تبلیغ فرماتے ہیں اور خود ہی اپنے اصول کو توڑ رہے ہیں"۔ اگرچہ علاج جاری رہا اور ان کو آرام بھی ہوگیا لیکن ڈاکٹروں سے انھیں بغض ہی رہا۔ اب پہلی سی خوش طبعی نہیں رہی تھی اور بچوں کے ساتھ کھیل کود بھی بند ہوگیا تھا لیکن بچوں کو اجازت تھی کہ جو چاہیں کریں۔ ایک دن میں کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ لیو قہقہہ مارتے ہوئے اچانک کود کر میری کمر پر آ سوار ہوئے چنانچہ میں نے کمر پر لے کر کمرے کے ایک دو چکر لگائے۔ اس حرکت سے پہلا زمانہ یاد آگیا شاید لیو کا اس حرکت سے یہ اظہار کرنا مقصود تھا کہ اب بھی مجھ کو اچھا سمجھتے ہیں انھیں اب بھی بچوں کی صحبت بہت پسند ہے ان کے ساتھ ڈرافٹ وغیرہ کھیلتے ہیں لیکن شین کی طرح بچوں کی باتیں سنتے رہتے ہیں اور خوش ہوتے رہتے ہیں البتہ ان میں حصہ نہیں لیتے۔

اگرچہ لیو کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے لیکن اب بھی ان کی ذات سب گھر والوں کا مرکز ہے اور سب کو لیو کے غیر معمولی انسان ہونے کا اعتراف ہے اب وہ دادا بن گئے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے بچے کسانوں کے بچوں کی طرح ان کو "ہمارے" یا "ہمارے بڈھے بابا" کہہ کر پکاریں۔ عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ لیو اور گھر والوں میں تلخی پیدا ہوگئی ہے لیکن یہ افواہ سراپا غلط ہے۔ اختلاف رائے سے بدمزگی نہیں ہے لیو اپنا فلسفہ بچوں کو ضرور سمجھاتے ہیں لیکن ان کا اصول ہے کہ برائی کو طاقت سے نہ روکو اس لیے بچوں پر یہ جبر نہیں ہے کہ وہ لیو کی تقلید کریں ان کی اولاد کو اس کا علم ہے اور وہ اپنے خیالات کی آزادی قایم رکھتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ میری آپا کے معاملہ میں وہ قدرے سخت ہیں اور اس امر کا ان کو صدمہ ہے کہ ان کی بیوی ان کی ملکیت ختم کرنے کے ارادہ میں سد راہ ہے اور بچوں کو اسی پرانے طریقہ پر تعلیم دے رہی ہیں۔ میری آپا اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہیں اور اس کا ان کو افسوس ہے کہ جو کچھ بھی وہ اپنا فرض خیال کرتی ہیں اس کی ادائگی لیو کو ناگوار گزرتی ہے میری آپا نے ان کے روحانی پیچ وتاب کا

شاہدہ کیا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ اس روحانی کش مکش نے ان کی صحت پر بڑا خراب اثر کیا ہے۔ شاید اس خوف سے کہ لیو کی یہ روحانی کش مکش کہیں ان کو مادی طور پر فنا نہ کر دے میری آپا آج کل فلسفہ سے خوف زدہ سی رہتی ہیں اور بعض مرتبہ سختی سے ان کی مخالفت کرتی ہیں جب میری آپا نے دیکھا کہ لیو کی روحانی کشمکش میں وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں تو یکسو ہو کر وہ بچوں کی تربیت میں لگ گئیں میری آپا کو دوہری مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ایک طرف تو خاوند کا یہ پوشیدہ مطالبہ ہے کہ ان کے فکر و عمل کی مخالفت نہ کی جائے دوسری طرف بچوں کے مستقبل کا سوال ہے۔ بچوں کے مستقبل کے متعلق اختلاف ضرور رہے ایک مرتبہ میری آپا کا ارادہ ضرور ہوا کہ عدالت سے جائداد کے لیے ایک امین مقرر کرالیں تاکہ بچوں کا مستقبل خراب نہ ہو وہ لیو کے فلسفہ کو غلط نہیں بتاتیں بلکہ وہ کہتی ہیں کہ جب تک نئے خیالات کو سماج قبول نہ کر لے یہ غلطی ہوگی کہ بچوں کی تعلیم بند کر دی جائے یا جائداد مفلسوں میں تقسیم کر دی جائے۔ ایک روز آپا رو کر کہنے لگیں اب میرے لیے بڑی مشکل کا سامنا ہے پہلے میں صرف لیو کی مددگار تھی اب سب کچھ مجھ کو ہی کرنا پڑتا ہے بچوں کی تعلیم اور جائداد کا بار بھی اب میرے ہی شانوں پر ہے اور اس پر طرہ یہ ہے کہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ میں محبت و الفت کے مسیحی قانون کو توڑ رہی ہوں اگر بچے نہ ہوتے تو کیا میں لیو کی مرضی کے خلاف چلتی اور کیا وہ نہ کرتی جو وہ کہتے ہیں لیکن وہ اپنے نئے فلسفہ میں اس درجہ مستغرق ہیں کہ وہ سب مصلحتیں بھول گئے ہیں۔ جب لیو نے چاہا کہ سب گھر والے سبزی ہی پر گزاریں تو آپا نے بچوں کی صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی مخالفت کی۔ لیو کا بڑا لڑکا ماں کا ہم خیال ہے اور جائداد کا انتظام کرتا ہے دوسرا لڑکا باپ کا پیرو ہے تین سال ہوئے کہ اس نے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے اور زمین بوتا جوتتا ہے لڑکی اگرچہ کھاتے پیتے گھر کی ہے لیکن ملازم نہیں رکھتی سب کام دونوں اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں تیسرا لڑکا ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے لیکن وہ ابھی سے لیو کے فلسفہ کی تائید کرتا ہے۔ سب گھر والوں میں لیو کی دوسری لڑکی باپ کی بہت معتقد ہے۔ میری چھوٹی بہن جو یاپالایانہ میں رہتی ہے اگرچہ لیو کے فلسفہ کو درست سمجھتی ہے لیکن اس کو قابل عمل نہیں سمجھتی۔ لیو کے سامنے اس پر اعتراضات کرتی رہتی ہے اور گھنٹے گھنٹے جواب پاتی رہتی ہے۔

بہت مدت کا ذکر ہے کہ یالایانہ میں ایک ڈاکٹر صاحب تشریف لائے انھوں نے ایک خاص قسم

کے کھانا پکانے کی ترکیب بتائی لیو کو وہ کھانا بہت مرغوب ہوا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے نام پر اس کھانے کا نام انکفسکی پائی رکھا لیو کی فرمایش پر گھر میں یہ کھانا اکثر پکتا رہتا تھا لیکن جب میں آخری مرتبہ یالایانہ آیا تو دیکھا کہ وہ کھانا پکنا بند ہو گیا ہے بلکہ ہر غیر ضروری عیش و نشاط کی شے کو انکفسکی پائی کا نام دیا جانے لگا ہے جب گھر والوں پطعن کرنا ہوتا تو لیو فرمایا کرتے تم یہ تو انکفسکی پائی (یعنی عیش و نشاط) کی ضرورت ہے ایک دن لیو کتب خانہ میں جھاڑو دے رہے تے میں بھی چلا گیا اور جھاڑو دینے لگا جب صفائی ختم ہوئی تو اسی طرح جھاڑو ہاتھوں میں لیے ہم دونوں برآمدے میں آ گئے میری چھوٹی بہن وہاں سے گزری اور اس نے ہمیں دیکھ لیا جب ہم گھر میں گئے تو چھوٹی بہن لیو کے سامنے ہی مجھ سے کہنے لگی مبارک ہو آپ نے بھی بیعت کر لی آپ تو ماشاءاللہ بڑے جوشیلے مرید نکلے۔ میں نے آپ کو جھاڑو ہاتھ میں لیے کھڑے دیکھا ہے اور جب آپ کھڑے تھے تو لیو آپ کے ۔۔ پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے اور جب لیو نے دریافت کیا کیا تو انکفسکی پائی اور اس کی تمام برائیوں سے توبہ کرتا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا جی ہاں۔ میری چھوٹی بہن لیو کو چھیڑنے کے لیے اس قسم کی باتیں کرتی رہتی تھی اور جواب پاتی رہتی تھی۔ جب لیو کی شادی کو ۲۵ سال ہو گئے تو سب گھر والوں نے جوبلی منانے کی تیاری شروع کی لیو کو اس کا علم ہوا تو ناگواری سے فرمایا "کل واقعی میری شادی کی جوبلی منائی جارہی ہے یا انکفسکی پائی کی جوبلی منائی جا رہی ہے؟"

اب میں بلا اظہار رائے لیو کے حالات ختم کرتا ہوں یہ کہ لیو کی تعلیم درست ہے یا غلط صرف مستقبل ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

ایم ایم جوہر میرٹھی

علامہ اقبال کا فلسفہ

اس عنوان سے جامعہ کی اگست ۱۹۴۲ء والی اشاعت میں جوہر صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا۔ نومبر کی اشاعت میں باقی صاحب نے اس پر تبصرہ کیا۔ دسمبر والی اشاعت میں جوہر صاحب نے باقی صاحب کے تبصرے کا جواب دیا ہے۔

جوہر صاحب اور باقی صاحب کے درمیان جو علمی مسئلہ اساسی اور اختلافی حیثیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ جوہر صاحب علامہ اقبال کو پہلے فلسفی اور پھر شاعر کہتے ہیں۔ باقی صاحب کہتے ہیں کہ اقبال شاعر ہے۔ یہ بھی بڑی پُرلطف بحث ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ پوری ہو جائے تو اچھی ہی کام کی چیز بھی ہو گی۔ استدلال کی پیش رفت میں جوہر صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی مضمون میں علامہ اقبال کے فلسفے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے گو اختصارِ مضمون کے باعث ان کی یہ سعی سردست مشکور نہ ہوئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں یہ کمی اب پوری ہو سکے گی البتہ ہمارا خیال ہے کہ جوہر صاحب اپنے آیندہ مضمون میں چند علمی باتوں کو پیدا کریں جو ان کے جواب میں نہیں پائی جاتیں تو اچھا ہو:۔

۱۔ جوہر صاحب اقبال کو فلسفی قرار دیتے ہیں باقی صاحب کا کہنا ہے کہ فلسفی ایک نظامِ فکر معین کرتا ہے جس میں جذبات کو دخل نہیں ہوتا۔ اس کا جواب جوہر صاحب نے یہ دیا ہے کہ اقبال نے بھی اسلام کے نظامِ فکر کو پیش کیا ہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اسلام کے تیرہ سو برس پہلے ہی سوچے ہوئے نظامِ فکر کا اعادہ یا تشریح کر دینے سے اقبال ایک بڑے فلسفی ہو گئے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظامِ فکر شعر کے سانچے میں کیوں پیش کیا گیا؟ مشکل دراصل یہ ہے کہ جوہر صاحب کچھ سراپا اختلاف سے بن گئے ہیں اور اقبال کے اس شعری ادب کو جذبات سے عاری کر کے شاعری سے خارج اور خواہ مخواہ بزورِ فلسفے کی حدوں میں داخل کرنا چاہتے ہیں کیا یہ اقبال کے شعری کارناموں کا صحیح مطالعہ ہے؟ اور کیا اس میں اس کی تحقیر نہیں؟

۲۔ جوہر صاحب نے جان بوجھ کر یا انجان طور پر باقی صاحب کے تبصرے کی چند علمی اصطلاحوں کو

ان کے لطیف مفہوم کے ساتھ نہیں سوچا سمجھا مثلاً "جمالیات" جو حسن و جمال کی تحقیق اور اس کے اثر کی توجیہہ کرنے کا ایک فن ہے اُسے صرف زلف و کاکل کی جمالیات" کے معنوں میں لیا ہے۔ اس طرح جذبہ یا احساس کے لفظ کو بھی جو نفسیات کی مسلمہ اصطلاح ہے صرف بوس و کنار کے جذبات" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم جوہر صاحب کے متعلق یہ سوظن تو نہیں رکھنا چاہتے کہ وہ ان اصطلاحوں سے واقف نہیں مگر یہ پوچھنے پر مجبور ہیں کہ انھوں نے ان اصطلاحوں کی سطحی توضیح کیوں فرمائی؟

اس کے ساتھ ہی جوہر صاحب نے اقبال کے چند اشعار نقل کیے ہیں اور بتایا ہے کہ جمالیات، جذباتی شاعری، رقص و سرود وغیرہ اقبال کی تنقید کی روشنی میں ان کے نزدیک توجہ کرنے کے قابل ہیں اگر جوہر صاحب کے الفاظ میں ادب اور شاعری پر اقبال کے بتائے ہوئے اصولوں ہی کو (جو دراصل اصول نہیں بلکہ دور حاضر کی رفتار حیات پر گونہ تنقیدی پہلو لیے ہوئے ہیں) استعمال کیا جائے تو ایک ایسا مقام آتا ہے جہاں جوہر صاحب کی رائے خود اُن کے استدلال کی زد میں آجاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اقبال نے "فلسفے" پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے:-

بوعلی اندر غبار ناقہ گم   دست رومی پردۂ محمل گرفت
شعر چوں سوئے مدار حکمت است   شعری گردد، چو سوز از دل گرفت!

دوسری جگہ اقبال یوں فرماتے ہیں:-

مقام ذکر کمالات رومی و عطار   مقام فکر مقالات بوعلی سینا
مقام فکر ہے پیمایش مکان و زماں   مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ!

جوہر صاحب اگر اکتا نہ گئے ہوں تو "فلسفے" کے عنوان سے اقبال کی ایک اور نظم ملاحظہ کریں:-

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں   پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی   مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے
الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا   غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟
پیدا ہے فقط حلقۂ ارباب جنوں میں   وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل　　قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے
یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے!

اچھا اور سنیے! علم و عشق (فلسفہ و شعر) کے متعلق علامہ اقبال نے ایک اور نظم بھی لکھی ہے اس کا ایک بند یہ ہے:

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!
بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن!　　عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

۳- جوہر صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ "ادب کو پرکھنے کے لیے علامہ اقبال نے آپ کے (باقی صاحب کے) اصولوں سے مختلف اصول بیان کیے اور شعر و شاعری کے متعلق اُن کا اپنا تصور آپ کے (باقی صاحب کے) تخیل سے بالکل جدا ہے" اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا ایک اصول اپنے شعر سے کے عنوان سے درج کیا جاتا ہے جسے دیکھنے کے بعد جوہر صاحب خود اندازہ کر سکیں گے کہ باقی صاحب کے اصول یعنی سکونِ دماغ اور جذبۂ دل کی تائید ہوتی ہے یا تردید:

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا　　تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش!
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہ　　کر کسی سینۂ پر سوز میں خلوت کی تلاش!

۴ باقی صاحب نے فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ فلسفی ایک غیر جذباتی نظامِ فکر معین رکھتا ہے جوہر صاحب اقبال کو "پہلے فلسفی" کہتے ہیں اور ثبوت میں اسلامی نظامِ فکر پیش کرتے ہیں باقی صاحب کے استدلال کی تائید میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فلسفی کے نظامِ فکر میں کہیں تضاد نہیں ہوتا جب ہی تو وہ نظام معین ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شاعر کے جذبات میں تضاد پایا جاتا ہے وہ کہیں غم کو سراہتا ہے تو کہیں خوشی کو، کہیں بہار کے گیت گاتا ہے تو کہیں خزاں کے بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اکثر مقامات پر شاعر اقبال کا یہ رنگ نظر آتا ہے کیا اب بھی جوہر صاحب اقبال کو "پہلے فلسفی" کہنے پر مصر رہیں گے؟

۵- باقی صاحب نے کہا ہے کہ خیال جب شعر کے قالب میں آجاتا ہے تو اپنے اثر اور کیف کے اور بعض وقت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی اصل خیال سے مختلف ہو جاتا ہے جوہر صاحب نے مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی سے چند عنوانات دیے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:-

خود بیان اینکہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات و تعینات وجود بر استحکام خودی انحصار دارد"

خودی کے متعلق اقبال کے یہ دو شعر بھی ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی ۔۔۔ خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

کیا ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ ان اشعار میں فلسفی کا دماغ بول رہا ہے یا شاعر کا دل؟

ان امور کے باوجود اگر جوہر صاحب اقبال کو فلسفہ ہی کی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہم کا کوئی علاج نہیں ہم پوچھتے ہیں کہ علامہ اقبال کو پہلے فلسفی۔ کہنے سے ان کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس نے پہلے فلسفہ پڑھا۔ اور پھر اس فلسفہ کو نظم کر دیا؟ قصہ کوتاہ یہ چیز ذرا وضاحت طلب ہے کیونکہ جوہر صاحب نے لکھا ہے کہ "ایشیائی طبائع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے اس نے (علامہ اقبال نے) اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے" جوہر صاحب کے اس خیال کی بنا پر ہمیں مزید وضاحت کے لیے درخواست کرنی پڑی خصوصاً اس لیے بھی کہ جوہر صاحب دانتے کے ایک قول کا تذکرہ کرتے ہوئے ہماری شاعری کو "جذباتی شاعری" فرماتے ہیں۔ گویا بلا جذبہ بھی شاعری ہو سکتی ہے؟ پھر آگے چل کر یہ بھی فرمایا ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہے جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ یہاں اپنے آپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر میں حقیقت نسبتاً "سمجھی" کی چیز ہوتی یا اسے محسوس کیا جاتا ہے؟ اس موقع پر جوہر صاحب نے ثبوت میں علامہ اقبال کے جو شعر پیش کیے ہیں وہ یہ ہیں:-

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے ۔۔۔ یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا؟

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ۔۔۔ جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا؟

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ۔۔۔ جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

ان اشعار کو نقل کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے جوہر صاحب کو خیال نہیں رہا۔ ورنہ غور کریں تو انھیں محسو کہ شاعر نے فلسفی نے نہیں! پہلے شعر کے پہلے ہی مصرع میں "سوز حیات ابدی" کہہ کر یہ گتھی سلجھا دی ہے؟

بھی سوز سوزِ غم کیلئے خشکی کا باعث ہو اس کے لیے تو سکون چاہیئے۔ دل میں البتہ اس سے گداز پیدا ہوتا ہے جو شادابیٔ حیات کا موجب ہے اس طرح ملاحظہ کیجیے کہ ان اشعار میں ہنر (آرٹ) کو سمجھ سے بہت زیادہ دل کی چیز بتایا گیا ہے جس میں شروع سے آخر تک شاعر کے جذبہ کی ایک بجلی کوندر ہی ہے اور دیکھیے! ایک شاعر نے شاعر کی یوں تعریف کی ہے۔ اسے بھی سن رکھیے ا۔

" The poet's eye, in a fine frenzy rolling
Doth glance from heaven to earth, from earth to heaven,
And, as imagination bodies forth
The forms of things unknown, the poet's pen
Turns them to shape, and gives to airy nothing
A local habitation and a name."

شاعر کی یہ تعریف دنیا کی ایک ایسی بڑی شخصیت کے قلم سے نکلی ہے جس کے متعلق خود علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا راز داں پھر نہ کرے گی کبھی پیدا ایسا!

اوپر کے مقولے میں (fine frenzy rolling) کا حصہ دنیا کے شعری سرمایہ کا ایک نایاب ... ہے جس کا جواب نہیں ہو سکتا اور یہ وارفتگی (fine frenzy rolling) شاید دماغ (فلسفہ) سے ... دل (شاعری) کی چیز ہے۔ یہاں کچھ علامہ اقبال کی زبان سے بھی دل کی کچھ ایسی ہی باتیں سن لیجیے

دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے ...شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے
...دی عشق بسے دور و دراز است ولے طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

اسی بحث کے سلسلے میں جوہر صاحب نے ایک جگہ باقی صاحب کا یہ قول بھی دیا ہے کہ شاعر ...ہے جو زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہے جوہر صاحب اس پر یہ سوال ...تے ہیں کہ وہ صداقتیں کیا ہیں؟ اور فرماتے ہیں کہ یہیں سے فلسفہ کی حد شروع ہوتی ہے مگر ہمارے خیال ...ں شاعر کا منصب تو یہ ہوا کرتا ہے۔

ربنا ما خلقت هذا باطلا

شاعر جب شاعر ہو متشاعر نہیں، تو اسی سب سے بڑی صداقت کو وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر محسوس کرتا اور پیش کرتا ہے ممکن ہے فلسفی کے لیے اس صداقت کو جاننے کی کچھ حدیں اور تعینات ہوں۔ مگر شاعر اپنے وجدان کی بدولت ان حدود اور تعینات سے بہت آگے ہوتا ہے اور اسی دوری سے بے محابا کہہ دیتا ہے کہ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ۔۔۔ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں :

بہرحال یہ بحث ہو یا اس کی ضمنی دوسری بحثیں ہوں ان پر اس وقت کافی نظر ڈالی جا سکتی ہے کہ جوہر صاحب اب اپنے وعدہ کے بموجب علامہ اقبال کے فلسفے کو پوری پوری روشنی میں لائیں مگر جوہر صاحب کے دوسرے مضمون میں جب ہم نے اُن کا یہ مطالبہ دیکھا کہ خود وہ باقی صاحب سے اپنے مختصر مضامین کا مفصل جواب مانگ رہے ہیں تو اس سے ہمیں حیرت ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ جوہر صاحب علامہ اقبال کے فلسفے کو پیش کرنے کے کوشاں ہیں اس لیے انھیں پیش کرنا ہے وہ پیش کریں۔ اس باقی صاحب ہوں یا کوئی اور ہوں کچھ کہہ سن سکیں گے باقی صاحب کے پیش کردہ اصولوں سے تو جوہر صاحب کو اختلاف ہے شاید جوہر صاحب اب کچھ اپنے اصول بیان کر کے باقی صاحب کو مطمئن کر سکیں۔ علم دونوں صورتوں میں بھلا ہوگا۔

وزیر حسن (عثمانیہ)

لعل و گہر

نیرنگِ زمانہ کا اثر دیکھ رہا ہوں
بدلی ہوئی یاروں کی نظر دیکھ رہا ہوں

تھکتیں ہی نہیں دیکھنے سے منتظر آنکھیں
کب سے میں یوں ہی جانبِ در دیکھ رہا ہوں

اللہ رے اس محویتِ دید کا عالم!
اتنی بھی نہیں مجھ کو خبر دیکھ رہا ہوں!

بن دیکھے ہی کس طرح بگڑنے لگا ناصح
تو بھی تو اُدھر دیکھ جدھر دیکھ رہا ہوں

ہے گردِ سفر قافلۂ انجم و اختر
بیٹھا میں سرِ راہ گزر دیکھ رہا ہوں

خورشید کے ہاتھوں میں شعاعوں کے ہیں نیزے
ہر ذرّے کو میں سینہ سپر دیکھ رہا ہوں

افلاک بھی شاید کہ ہیں ساکت مرے غم میں
ہر روز وہی شام و سحر دیکھ رہا ہوں

پھر بھی یہی جی میں ہے ہوں اہلِ ہنر میں
گو خستگیٔ اہلِ ہنر دیکھ رہا ہوں!

دل پھر وہی لعل و گہر ڈھال رہا ہے
گو خاک میں سب لعل و گہر دیکھ رہا ہوں

فضلی بشریت کا ہے اک یہ بھی تماشہ
انسان کو جو آمادہ بہ شر دیکھ رہا ہوں

فضل احمد کریم فضلی

تصحیح:۔ جامعہ بابتہ جون ۱۹۴۲ء میں "نغمۂ زندگی" کے تبصرہ میں فضلی صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار غلط درج ہوگئے ہیں ناظرین تصحیح فرمالیں:۔

یہ فضلی کا لطفِ سخن دوستو
خداداد ہے اکتسابی نہیں

پھر بیٹھے بیٹھے دیکھتا ہوں جاگتے میں خواب
وہ مسکرا رہے ہیں کھلا جا رہا ہوں میں

نالوں میں غنچے کے چٹکنے کا طرفہ لطف
گھبرا رہے ہیں وہ کبھی گھبرا رہا ہوں میں

خرمن پہ غم کے بجلی گرا دیں
تم مسکرا دو ہم مسکرا دیں

آئینۂ عمل

جو دیکھے تفرقے ہم نے چمن کے پاسبانوں میں
لگا دی آگ خود ہی اپنے اپنے آشیانوں میں

ہم آہنگی نغمانوں میں، نہ یکرنگی ترانوں میں
بہار آئے تو کیا آئے ہمارے گلستانوں میں

ابھی ہیں تشنۂ سوزِ تپش ہندوستاں والے
نہ بجھنے پائیں جو شعلے ہیں رقصاں آسمانوں میں

ادھر بھی اک نظر او مٹنے والے ذوقِ مشرق پر
کہ خاک اُڑنے لگی ہے مغربی تہذیب خانوں میں

بتاؤ تو مجھے اے دولت و زر کے پرستارو
محبت کی بھی دولت ہے تمہارے ان خزانوں میں

نگاہ انقلابِ دہر کا منشا یہ کیا سمجھیں
نہ حکمت پیرِ دانا میں نہ غیرت نوجوانوں میں

بجھی جاتی ہیں قصرِ جور و استبداد کی شمعیں
لگی ہے آگ خود ان بجلیوں کے آشیانوں میں

اثر تو دیکھ غافل! نعرۂ اللہ اکبر کا
جو کڑکی تھیں فضاؤں میں چھپیں وہ آسمانوں میں

کتابِ نظمِ ہستی کا پڑھا ہے ہر ورق جس نے
وہ کیا ناکام ہوگا زندگی کے امتحانوں میں

سلایا ہے تھپک کر کس کے دستِ ناز نے ان کو
شرر تھے جن نگاہوں میں، اثر تھا جن زبانوں میں

نہ ہوگی یورشِ برقِ ستم تو اور کیا ہوگا
چمن والے مگن ہیں بیٹھے اپنے آشیانوں میں

نگاہ دوررس کہتی ہے ہاں روشن ہے مستقبل
بڑھے جانا نہ ہمت ہار دینا امتحانوں میں

کہاں کا شاہدِ مقصود کیسی راحتِ منزل
یہ کہئے زندگی کی روح بھی ہے کاروانوں میں

نظر بھی نکتہ رس ہو قلب بھی شفاف آئینہ
تو سب کچھ آج مل سکتا ہے فطرت کے خزانوں میں

نہ بیباکی، نہ بیتابی، نہ بیداری نہ ہشیاری
جوانی کتنی شرمندہ ہے آکر نوجوانوں میں

سکوں کی زندگی کیا چاہتا ہے بے خبر سن لے
اسے کہتے ہیں "مرگِ بے اجل" دونوں جہانوں میں

درندوں کی نظر سے بچ نکلنا کوئی آساں ہے
نہ ہو گر زور تیروں میں نہ قوت ہو کمانوں میں

کمالِ فطرتِ آزاد اگر تو دیکھنا چاہے
نگاہِ نکتہ رس سے ڈھونڈ اگلی داستانوں میں

درد دل کی تفسیریں، نہ سوزِ غم کی تصویریں
کہاں سے آئیں تاثیریں زبانوں میں فغانوں میں

نگاہ مردِ مومن ہی زبانِ مردِ مومن ہے
خدا کے رازداروں میں، قضا کے ہم زبانوں میں

ستا خودداریٔ دل مرحبا بیداریٔ فطرت
لگا دی آگ آخر سرکشوں کے عیش خانوں میں

رگوں میں خون ہو کچھ گرم تو ملتی ہے وہ دولت
جسے تو ڈھونڈتا ہے آج مغرب کے خزانوں میں

بدلنا ہے نظامِ بزمِ ہستی اے جنوں اک دن
نیا اب رنگ بھرنا ہے ہمیں اپنے فسانوں میں

دیا ہے دردِ دل، سوزِ دروں جن کو بصیرت نے
غنیمت ہے یہ محوی بھی ان آشفتہ بیانوں میں

محوی صدیقی لکھنوی

بمبئی کی ایک سڑک پر

یہ عماراتِ حسیں اور یہ اونچی اونچی کوٹھیاں
صرف مزدوروں کے فاقہ کی صدا۔ اور کچھ نہیں
یہ منور بجلیاں، اور سنہرے قمقمے!
قطرہ ہائے خوں کا رنگیں سلسلہ۔ اور کچھ نہیں
رنگ محلوں کے تماشے نغمہ زا رقص و سرود
خاطرِ افسردہ کی آہ و بکا۔ اور کچھ نہیں
ہے کسی رقاصہ کی پاؤں کی رقصندہ ادا
گاؤں میں چکی کے چلنے کی صدا۔ اور کچھ نہیں
نقرئی پوشاک میں ملبوس یہ شہزادیاں
غم زدہ بے کس بھکارن کی ردا۔ اور کچھ نہیں
کوٹھیوں کا رقص و نغمہ، شہریوں کا شورِ عیش
باغیوں کا قہقہہ در قہقہہ۔ اور کچھ نہیں
کاش ان محلوں کے نظاروں کو کوئی پھونک دے
کاش دولت کے سیہ کاروں کو کوئی پھونک دے

جذبی فیض آبادی

عاقل

(حکیم مرزا محمد علی بیگ عاقل دہلوی ذوق، ظفر، غالب اور مومن کے ہمعصر تھے اکثر اشعار میں ان بزرگوں کا نام بڑے ادب سے لیا ہے۔ دہلی ان سے کسی وجہ سے چھٹ گئی تھی جس کا اظہار انھوں نے بہت سے اشعار میں کیا ہے۔ اس کے کلام میں مسائل وقت پر بھی بعض جگہ بیباک تنقید یں ہیں۔ ۱۲۶۰ھ میں ان کا مجموعہ مکمل ہوچکا تھا البتہ طباعت کی نوبت ۱۲۹۶ھ سے پہلے نہ آئی ۱۲۹۶ھ میں دربار دہلی کے قطعہ تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۹۴ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب یہ ہے۔ ان کے کلام میں گھلاوٹ اور سادگی قابل قدر چیزیں ہیں۔)

بے خودی میں جسے ہم سمجھے تھے اس کا دامن — ہوش آیا تو وہ اپنا ہی گریباں نکلا

مومن نہیں اسد نہیں ذوق و ظفر نہیں — دلّی میں ہائے کوئی سخن داں نہیں رہا

حرم میں دیر میں میں جبہ سا کہاں نہ ہوا — نصیب اس کا مگر سنگ آستاں نہ ہوا

دکھانا تھا جو میں نے کبھی وہ دکھا دیا — تو نے تو خاک میں مجھے اے دل ملا دیا

اپنی ہستی حجاب ہے کوئی — آپ کو کھویا جب خدا پایا

سینہ کو میرے چیر کے آنکھوں سے دیکھیے — کیا پوچھتے ہو حال دل بے قرار کا

نالوں نے ایسی دھوم مچائی تمام رات — چشم جہاں میں نیند نہ آئی تمام رات

غضب ہے اس قدر پاس ہو اور صورت کو ترسوں میں — مرے دل میں رہو ہر دم اور آنکھوں سے نہاں ہو تم

نکلی نہ اپنی حسرت دیدار کیا کریں — سر پھوڑتے ہیں اب ترے دیوار و در سے ہم

بے بلائے اسے بلا دیکھیں — جذب دل اپنا آزما دیکھیں

کیونکر کروں بیان درازی زلف یار — ہاں اس قدر طویل بھی وہ زنجیر نہیں

انسان ہوں فرشتہ نہیں ہوں جو چپ رہوں
عاؔقل میں دردِ ہجر کی کیا تاب لا سکوں

زاہد! خطا معاف میں توبہ شکن سہی
ساغر بھرا ہوا ہو کفِ گل فروش میں

بے طاقتی سے لب پہ جو آہ و فغاں نہیں
حسرت سے کب نگاہ سوئے آسماں نہیں

ایسی ہو کیا غرض کہ جو کعبہ کو جاؤں میں
سر پھوڑنے کو یار کا کیا آستاں نہیں

حال دل وہ مرا نہیں سنتا
تجھ سے بھی اے خدا کہوں؟ نہ کہوں؟

چمن میں دیکھیں گے وہ کیا بہار کا عالم
وہ لے کے آئینہ اپنی بہار دیکھیں تو

مفلسی سے نہیں نصیب شراب
لوگ سمجھے ہیں پارسا مجھ کو

عاؔقل ہو کون مونس و غمخوار اب مرا
تنہائی میں رفیق اگر بیکسی نہ ہو

نازک ہے وقت دور ہے اہلِ فرنگ کا
ہے آبرو ہماری جہاں میں خدا کے ہاتھ

اس شعلہ رو کے رخ پہ وہ روشن نقاب ہے
گویا کہ ماہتاب پہ اک آفتاب ہے

باقی ہیں دل میں آپ کے اب بھی کدورتیں
جانے دو اب تو خاک میں ہم کو ملا چکے

جاں آگئی ہے لب پہ مری انتظار میں
اے موت تو ہی آجا بس اب وہ تو آچکے

رشک شیریں اسے یا غیرت لیلیٰ کہیے
جس کا ثانی ہی نہ ہو اس کو بھلا کیا کہیے

اے رشک مہر حسن کا دعویٰ ہے ماہ کو
چہرہ سے اپنی زلف پریشان اٹھائیے

پہنچا ہے ہاتھ تصور میں ترے داماں تک
کاش داماں دعا دستِ اثر تک پہنچے

تری تلاش میں پھرتی ہے اس طرح سے نظر
کہ جیسے بھولا ہوا راہ میں بھٹکتا ہے

عیاں ہے یوں رخ روشن تمھارا گیسو سے
کہ چمکے جس طرح ابر سیاہ میں بجلی

(مرسلہ حبیب کیفوی

بسم الله الرحمن الرحیم

دولت آصفیہ کے جدید عربی مطبوعات

مطبوعہ

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن

۱ - تاریخ کبیر للامام البخاری

شیخ الاسلام حافظ جلیل محمد بن اسمعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ ھ کی رجال حدیث مین سب سے قدیم اور مستند کتاب ہے ۔ اس جلیل القدر کتاب کا اشتیاق ارباب علم کو صدیون سے تھا الحمدللہ اس نایاب کتاب کے نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ، کتب خانہ آستانہ اسلامبول ، اور کتب خانہ خدیویہ مصر ، سے دستیاب ہوئے جس کے بعد تصحیح عمل مین آئی اور جلد رابع طباعت مین مقدم رکھی گئی

صفحات ۔ قیمت عثمانیہ روپیہ آنہ			کلدار روپیہ آنہ
جلد ٤ قسم (۱) ٤٦٨	۳	۸	۳
" ٤ " (۲) ٤٦٨	٤	۱۰	٤

۲ - کتاب الکنی للامام البخاری

امام مسلم رحمہ اللہ کی کتاب الکنی کی طرح یہ بھی ایک علحدہ کتاب ہے جس مین صرف کنیتون کا ذکر ہے

صفحات (۱۰۰) قیمت عثمانیہ (۱۵) آنہ کلدار (۱۳) آنہ

۳ - کتاب الامالی للامام محمد

یہ امام محمد رحمہ اللہ کے امالی ہین جو نصوص فقہیہ کا درجہ رکھتے ہین اس مجموعہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فقہ کے اہم مسائل کو نہایت سلیس طریقہ بیان سے طلبہ کی آسانی کیلئے تحریر فرمایا ہے یہ حصہ مسائل دین سے مسائل طلاق تک مشتمل ہے

صفحات (۸۱) قیمت عثمانیہ (۱٤) آنہ کلدار (۱۲) آنہ

کتاب الجرح والتعدیل

امام حافظ ابو محمد عبد الرحمن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رواۃ کے حالات کو قطعیت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے

یہ کتاب چار جلدون پر مشتمل ہے ابتک تیسری جلد طبع ہو سکی ہے

	صفحات	قیمت عثمانیہ روپیہ	آنہ	کلدار روپیہ	آنہ
جلد ۳ قسم اول	۴۳۲	۳	۸	»	۳
دوم	۳۲۸	[illegible]	[illegible]	۲	۱۱

۵ — میزان الحکمة

علامہ عبد الرحمن الخازنی المتوفی (۵۱۵) ھ کی اہم ترین تصنیف ہے جس مین سونے چاندی اور فلزات کے تولنے اور پرکھنے کے اصول سے بحث ہے

اس کتاب پر پروفیسر عبد الرحمن خان صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ نے بلحاظ تحقیقات جدیدہ ایک تبصرہ بھی لکھا ہے

صفحات (۳۱۶) قیمت عثمانیہ (۳) روپیہ کلدار (۲) روپیہ ۱۰ آنہ —

۶ — انباط المیاہ الخفیہ

علامہ حاسب کرخی متوفی ۴۰۸ھ کی تصنیف ہے جس مین زمین میں سوتون اور چشمون کے پتہ چلانے اور نہر اور کنوون کے کھودنے پر محققانہ بحث ہے

صفحات (۹۲) قیمت عثمانیہ (۱۴) آنہ۔ کلدار (۱۲) آنہ

۷ — کتاب الافعال

علامہ ابو القاسم علی بن جعفر المعروف بابن القطاع کی لغت میں ایک اہم اور مبسوط تصنیف ہے جس مین کتاب الافعال لابن القوطیہ پر اضافہ کیا گیا ہے

	صفحات	قیمت عثمانیہ روپیہ	آنہ	کلدار روپیہ	آنہ
جلد اول	۳۹۸	۳	»	۲	[illegible]
جلد دوم	۴۹۲	۴	۹	» ۳	[illegible]

خادم العلم

ناظم و مددگار معتمد دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال　　**عالیجناب ہز ہائنس آغا خان صاحب**

مجوزہ سرمایہ	ساٹھ لاکھ روپیے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
اداشدہ سرمایہ	گیارہ لاکھ چھ ہزار چھ سو پانچ	۱۱۰۶۶۰۵

اپنے بیموں کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے، ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل، موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن ، لاہور ، بمبئی ، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارشِ احوال واقعی

حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان سے چھپی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ئہ سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے دیکھی نہ گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کیے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لیے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیا کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جنکے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اِس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجرانِ عطر

حنا بلڈنگ لکھنؤ

رمضان المبارک

خاص رعایت

حمائل شریف (خورد)

یورپ کے کتب خانے مشرقی جواہراتِ علیہ سے مالامال ہیں۔ ہم اس علمی ورثہ سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن چند علم دوست ایرانیوں نے اس طرف توجہ کی اور مطبع کاویانی کے نام سے ایک مطبع اور دارالاشاعت قائم کرکے فارسی، عربی، ترکی وغیرہ کے چند قدیم نسخوں کو شائع کیا۔ یہ حمائل شریف بھی اسی مطبع کی مطبوعہ ہے۔ کاغذ اور چھپائی انگلستان ہالینڈ شام مصر کی جیسی کتابیں چھپ کر نکلتی ہیں ان سے اعلیٰ ہے۔ سائز جیبی ہے۔ پہلے ہدیہ قیمت ۲ تھا اب ایک روپیہ کردیا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان فائدہ اٹھا سکیں۔

حمائل شریف (کلاں)

فاطمۃ الکبریٰ بنت جناب محمد دین صاحب خوش نویس کی لکھی ہوئی حمائل شریف جو حال میں شائع ہوئی ہے۔ کتابت کی دلآویزی اور پاکیزگی کی وجہ سے خاص شان کی مالک ہے۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سب سے بہتر عربی خوش نویس ہونے کی حیثیت سے مختلف انجمنوں اور نمائشوں کی طرف سے طلائی تمغے ملے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب حیدرآباد نے ہدیے اور وظائف پیش کئے ہیں۔ حمائل مترجم ہے اور ترجمہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہدیہ مجلد بجائے [illegible] کے [illegible]۔ غیر مجلد [illegible]

مکتبہ جامعہ

دہلی قرولباغ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت: نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۷ - نمبر ۴	بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء	چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

ہٹلر اور نپولین

ان تاریخی واقعات کو زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔ نپولین جون ۱۸۱۲ء میں ماسکو کی طرف چلا تھا اسی سال ستمبر تک پہنچ گیا اور ہٹلر نے جون ۱۹۴۱ء میں اس طرف حملہ کیا اور وہاں اب تک نہیں پہنچ سکا ہے ایک معمولی امر ہے اور اس سے آج کل کوئی مفید نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ان دونوں واقعات میں کوئی بات یکساں نہیں پائی جاتی جس سے کچھ مطلب نکل سکے اور مقابلہ کیا جا سکے۔ لوگ آجکل کے اور نپولین کے زمانے میں مقابلے کے لیے بہت سی باتیں فرض کر کے عجیب فتوے صادر کرتے رہتے ہیں لیکن [illegible] کے کچھ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ہم ان دونوں زمانوں کا موازنہ کر کے کچھ بھی نتائج برآمد نہ کر سکیں۔

جس طور پر طب میں معالج کے لیے دو مریضوں کی حالت بالکل یکساں نہیں ہوتی بالکل یہی حال تاریخ کا ہے طبیب تاریخ یعنی تجربے سے کچھ سیکھنے کی امید رکھتا ہے بہت سے پیشہ ور مثلاً کاشت کار، انجنیر، ملاح تاریخی یکسانیت پر کام کرتے ہیں۔ ان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں اور جب وہ اس طور پر کام کریں گویا انہیں تجربے سے بالکل یکساں حالتیں ملی ہیں تو وہ زیادہ غلطیوں کے مرتکب ہوں گے اور اگر وہ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک مسئلہ بالکل نیا اور اچھوتا ہے تو وہ اس سے زیادہ فاش غلطیوں کے مرتکب ہوں گے۔

اب ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ نپولین کے یورپ پر تسلط حاصل کرنے کے منصوبوں سے کیا سیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے ہمیں ہٹلر کے اس خواب کی تعبیر مل سکے گی جس کے مزے وہ آج کل لے رہا ہے۔ یہ مقابلہ بھی شخصیتوں کے مقابلے سے زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا۔ نپولین کو غصے کے دورے پڑا کرتے تھے سینٹ ہیلینا چھوڑنے کے بعد اس نے یہ تسلیم کیا کہ یہ حالت سوچ سمجھ کر طاری کی جاتی تھی۔ ہٹلر کو بھی اس قسم کے دورے پڑتے ہیں جن کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ طے شدہ ہوتے ہیں دونوں کو بڑا آدمی بننے کا خبط ہے لیکن اگر ہم ان کا تجزیہ خاص کریں تو زیادہ مدد ملے گی سطحی طور پر دونوں بہت مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کی سماجی حیثیت کاروباری تربیت، مزاج اور شخصیت میں زبردست فرق ہے۔

مختلف معرکوں اور جنگوں میں بھی مماثلت تلاش کرنے سے کوئی فایدہ نہیں۔ یہ ضرور ہو کہ اگر گھوڑوں اور موٹر گاڑیوں کی رفتار کا فرق نکال دیا جائے تو فرانسیسیوں نے ۱۸۰۶ء میں جینا فتح کرکے پرشیا کو اتنی ہی تیزی سے فتح کر لیا تھا جتنی تیزی سے جرمنوں نے سیڈان فتح کرنے کے بعد سنہ ۱۹۴۰ء میں فرانس کو مغلوب کیا اس موازنہ سے مشہور پست خیال دور ہو جاتا ہو کہ جس تیزی سے جرمنوں نے فرانس کو سر کیا وہ بہت تعجب خیز اور فرانسیسیوں کے لیے باعث شرم ہو لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اسٹین اور ہارڈنبرگ کی اصلاحات آرنٹ کی نظموں کی پیدا کی ہوئی پروشیا کی قومی بیداری، فشٹے کی تعلیمات، عوام کے ہزارہا گمنام لیڈروں کی پرزور تقریریں اور خود ذی ہر شکر یک" جیسے ادارے عالم وجود میں آ سکتے ہیں گو ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

خاص واقعات، عام تاریخ اور شخصیتوں کا مقابلہ زیادہ مفید نہیں بلکہ جس چیز کو سماجی تاریخ کہا جا سکتا ہے ہم زیادہ کارآمد سمجھتے ہیں اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ ہم واقعات پر اصولوں کو ترجیح دیں گے اور حقایق کو چھوڑ کر تصورات سے بحث کریں گے بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ ایسے لاتعداد واقعات سے جو بظاہر یکساں نہیں ہیں اہم اور وسیع مماثلتیں تلاش کریں گے۔

انقلاب فرانس کے تین سال بعد ۱۷۹۲ء سے ۱۸۰۵ء کی جنگ عظیم چھڑ گئی گو فرانسیسیوں کو حال ہی میں امریکہ کی جنگ آزادی میں برطانیہ کے خلاف لڑ کر اپنے وقار کی تجدید کا موقع ملا ہو لیکن دوسری جنگ صد سالہ میں وہ برطانیہ سے بری طرح ہارے۔ شمالی امریکہ اور ہندوستان کے مقبوضات ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ۱۷۸۹ء تک حکومت دیوالیہ ہو چکی اور تمام طبقوں میں نامقبول ہو چکی تھی۔ ان کے فاضل لیڈر پچیس برس سے زیادہ عرصے سے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی اداروں کے مکمل احیا یا یوں کہیئے کہ انقلاب کے لیے آواز بلند کر رہے تھے شاہ لوئی پانزدہم نے دیوالہ کے آخری حل کے طور پر ۱۷۸۹ء میں اسٹیٹس جنرل منعقد کی۔ اس نے فوراً ہی فرانس کو انقلابی اصولوں پر منظم کرنا شروع کر دیا کچھ عرصہ تک یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لوگ متحد اور متفق ہیں اور امید تھی کہ ملک کی اصلاح پر امن طریقوں سے ممکن ہو لیکن انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی اور تشدد سے کام لیا جانے لگا شہنشاہیت کو سرنگوں کر دیا گیا اور حکومت انقلابیوں کے ہاتھ میں چلی

سی حاکم معزول کیے گئے۔ جایدادیں ضبط کی گئیں۔ مذہبی تنازعے ہوئے اور بالآخر اقتدار ایک منظم تشدد پسند جماعت یعقوبیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ عہد تشدد میں یعقوبی جماعت مجلس تحفظ الناس میں کارفرما رہی۔ اس نے تمام شہری حقوق کو نظر انداز کر دیا اور مرکزی حکومت قایم کرکے انتظام کیا۔ [illegible] یوں کیے کہ اس نے وہ طریقے اختیار کیے جس سے عہد تشدد بالکل صادق آنے لگا۔

۱۷۹۳ء سے تشدد صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ بیرونی دشمنوں پر بھی کیا جانے لگا۔ ۱۷۹۲ء میں فرانس اور آسٹریا و پرشیا اتحاد کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ آگے چل کر اس میں روس اور ترکی کے علاوہ سارا یورپ فرانسیسی جمہوریہ کے خلاف برسرپیکار ہو گیا۔ اس جنگ میں جن فرانسیسیوں نے حصہ لیا ان کے سامنے دو نصب العین تھے اور یہی انھیں اکساتے تھے۔ دوسرے ممالک کو استبداد سے نجات دلانا اور اس کے علاوہ انھیں فرانسیسی رنگ میں رنگنا حتی کہ ملحق کرنا چاہتے تھے ان کے دشمنوں کو یہ دونوں باتیں متضاد معلوم ہوتی تھیں فرانسیسی انقلابیوں (شاید نپولین کا یہ عقیدہ نہیں تھا) کا یہ خیال تھا کہ فرانسیسی نسل اور نظام سے وابستہ ہونے کا مطلب آزادی تھا۔ ان کے نزدیک آزادی کا راستہ صرف یہی تھا۔

۱۷۹۲ء اور پھر ۱۷۹۳ء میں جنگ فرانسیسیوں کے حق میں اچھی نہیں ثابت ہوئی لیکن ۱۷۹۳ء میں ایک اہم حکم نافذ کیا گیا جس کی وجہ سے لاتعداد آدمی مل گئے۔ پرانی فوج کے بہتیرے کار آزمودہ اور اولوالعزم ہاتھوں کے یہ آدمی سپرد کر دیے گئے اور اس طور پر پہلی مرتبہ بہترین منظم فوجیں تیار ہوئیں۔ رسد کے وسائل بھی فراہم کیے گئے [illegible] سائنسدانوں اور کارخانہ داروں کا جائزہ لے کر ان سے کام لیا گیا۔ اور آخر میں بہت سے تجربہ کار سپہ سالاروں نے جن میں نپولین نمایاں حیثیت رکھتا تھا اس انقلابی اصول سے کہ لیاقت سے مراتب حاصل ہو سکتے ہیں، فایدہ اٹھا کر قیادت حاصل کی۔

اس موقع پر فرانسیسی طاقت کو زیادہ اہمیت دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دشمنوں کی سپاہ کمزور ثابت ہوئی اس میں نیا نوسیت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ فرانس کے حملوں کا دنداں شکن جواب نہیں دے پاتے اس کے علاوہ تعجب تو یہ ہے کہ وہ لوگ فرانس کے خلاف متحدہ محاذ بھی قایم نہیں کر سکتے تھے مورخین کا بیان ہے کہ ۱۷۹۲ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیان فرانس کے خلاف چار پانچ اتحادی محاذ قایم کیے گئے

لیکن ۱۸۱۳ء کے اتحاد عظیم کے پہلے کسی نے یورپ کی تمام طاقتوں کو یکجا نہیں کیا اور نہ کوئی فرانس سے باضابطہ لڑائی مول لے سکا۔ یورپی تاریخ کی کوئی بھی کتاب اٹھا لیجیے اور ان ممالک کی ہر سال کی فہرست بنائیے جو فرانس سے جن سالوں میں برسرپیکار رہے اور جنھوں نے اس سے صلح رکھی اور جو اس کے ساتھ ... سب میں صرف برطانیہ ہی فرانس سے مسلسل جنگ کرتا دکھائی دے گا۔ برطانیہ نے بھی نپولین سے ۱۸۰۲ء میں صلح نامہ امیان کر لیا۔ نپولین نے ۱۷۹۹ء میں کونسل اول کی حیثیت سے اقتدار حاصل کیا اور جو اصلاحیں ۱۷۸۹ء میں شروع ہوئیں تھیں ان کو منظم اور منضبط کر کے فرانسیسی سلطنت کو استحکام بخشا ... فرانسیسی عرصہ ہوا ہالینڈ اور بیلجیم کو ختم کر کے جرمنی اور اٹلی پر دھاوا بول چکے تھے۔ نپولین بہترین منظم اور تربیت یافتہ فوج کی امداد سے شہنشاہ فرانس و ممالک محروسہ اور سارے یورپ کا مالک بن بیٹھا تھا۔ ماسکو پر یلغار کرنے سے پہلے جب اس کا اقتدار اپنے انتہائی کمال پر تھا اس نے سارے یورپ کا نقشہ بالکل بدل دیا تھا۔

نپولین نے اپنے نظام کا مرکز فرانس ہی رکھا جو براہ راست اس کے اثر میں تھا اس میں فرانس ہی نہیں بلکہ بیلجیم، ہالینڈ، ہیمبرگ تک کا جرمن ساحل، شمالی اٹلی کے حصے جس میں ٹیورن، جنیوا اور روما بھی شامل تھے اور غیرملحق ریاستیں کلیا کے مقبوضات مع صوبجات سیکسنی والیرین شامل تھے۔ اس کے بعد زیر اثر حکومتیں آجاتی ہیں۔ ان پر نپولین خاندان کے لوگ حکمراں تھے ۱۸۱۲ء میں مملکت اٹلی اور ان کے اُن حصوں جو فرانس سے ملحق نہیں تھے نپولین ایک وائسرائے کے توسط سے حکومت کرتا تھا جو اس کا سوتیلا لڑکا ایوان ڈی بیوہارنے تھا۔ اس کا برادر نسبتی مورت نیپلز پر اس کا بھائی جوزف اسپین پر اور اس کا بھائی جیروم مملکت ... رائن پر جس میں مغربی اور وسط جرمنی بھی شامل تھا حکومت کرتے تھے بحض وارسا کی نوابی چھوٹ جاتی جس کے لیے شاید خاندان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ سوئزرلینڈ بظاہر آزاد مگر درحقیقت زیر حکومت ... اس کے بعد آسٹریا اور پرشیا کی حکومتیں آجاتی ہیں جنھیں بری طرح دبا کر حکومت میں شامل کر لیا گیا ... ناروے اور سویڈن میں آخر الذکر کی طرف سے اطمینان تھا کیونکہ مارشل برناڈوٹ کو ولی عہد شہنشاہ ... بنا لیا تھا۔ اور آخر میں روس ابھی تک معاہدہ کی وجہ سے نپولین کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا اگر اس زمانے کے نقشہ کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس جال کے باہر صرف چند ہی ملک

جزائر سسلی و سارڈینیا کی نگہداشت برطانوی بیڑا کیا کرتا تھا اور ولنگٹن کی قیادت میں تھوڑی سی برطانوی فوج پرتگال کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ برطانیہ اس نظام سے آزاد رہا۔ نپولین نے اپنے ابتدائی دور حکومت میں انگلستان پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ دو مرتبہ اس نے خلیج کے ساحل پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں جمع کی تھیں فرانسیسی مرقع حملۂ انگلستان کا ایک عجیب نقش موجود ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سپاہی بے شمار غباروں میں لدے ہوئے فرانس کے ساحل سے ساحل انگلستان کی طرف اڑ رہے ہیں جہاں مدافعت کا سامان بہت کم ہے۔ فرانسیسی بیڑا خلیج کو عبور کر چکا ہے اور اسی درمیان میں فرانسیسی سپاہی نیچے سرنگ سے بندوقیں چست جا رہے ہیں جنگ ٹرافلگار کے بعد فرانس پر حملہ کرنے کی دھمکی بے معنی سی ہو گئی تھی۔ اس وقت نپولین نے برطانیہ پر براہ راست حملہ کا خیال چھوڑ دیا اور بری یورپی نظام کے ذریعے سارے یورپ پر برطانوی تجارت کو مسدود کرنا چاہا تاکہ اس طریقہ سے تجارت بند ہو کر اقتصادی تباہی پھیلے اور وہ صلح پر غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ نپولین نے برطانیہ کو بھوکوں مارنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ برطانیہ کا سمندروں پر پورا تسلط تھا نیز اس کی صنعتیں اس وقت اتنی نہیں بڑھی تھیں کہ ماکولات کی کمی پڑ جائے۔

فرانسیسیوں نے یورپ پر اقتدار محض اپنی فوجی قوت سے حاصل نہیں کیا تھا۔ نپولین جو ملک بھی فتح کرتا تھا وہاں کے باشندوں کی امداد پر بھروسہ رکھتا تھا فرانسیسیوں کی حامی جماعتیں گو اقلیت میں تھیں لیکن جرمنی اور خاص طور سے رہائن لینڈ اور شمالی اٹلی میں ان کی حیثیت بہت وسیع تھی۔ اس کے علاوہ مفتوحہ اور ماتحت ملکوں میں نپولین نے بہت سی مفید اصلاحیں کیں جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے حامی ہو گئے اس نے اپنی بعد کی لڑائیوں میں اطالوی، پول، جرمن اور دوسرے غیر فرانسیسی سپاہیوں سے بھی کام لیا اگرچہ ان پر فرانسیسیوں کے برابر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن بہرحال وہ کام تو دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے فرانسیسیوں کو ان ممالک کے انتظام اور پولیس کے کام کے لیے رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ان ممالک میں ابتدا ہی سے بے چینی کے اثرات نمایاں ہو چلے تھے۔ اسپین میں عوام پر کبھی قابو حاصل نہیں کیا جا سکا۔

جب جزیرہ نمائی مہم ۱۸۰۸ء میں اسپین کو انگریزوں سے بچانے کے لیے شروع ہوئی اور جب جوزف فرانسیسی فوج کی مدد سے میڈرڈ میں تخت نشین ہو گیا تو یہ مہم سطحی طور پر کامیاب معلوم ہونے لگی۔ فرانسیسی حکومت

کے خلاف پہلا احتجاج میڈرڈ والوں کی بغاوت تھی اسے سختی سے دبا دیا گیا ڈاس ڈی مایو نے جس تحریک کا آغاز کیا وہ نپولین کے زوال تک جاری رہی۔ اسپین میں برطانوی فوج ہمیشہ رہی اور اسی کے بل پر عوام بھی نپولین کی بہترین فوج سے برابر برسرپیکار رہے اور رفتہ رفتہ اسے بالکل ناکارہ کردیا۔ زار اسکندر نے ۱۸۱۲ء میں برطانوی تجارت پر پابندی عاید کرنے سے انکار کردیا چنانچہ نپولین نے اس سے تعلقات منقطع کرلیے اور ماسکو پر دھاوا بول دیا۔ اس کا انجام قریب آچکا تھا۔ ماسکو کی مشہور پسپائی میں فرانسیسی فوج تباہ ہوگئی یورپ کی تمام حکومتوں نے ہمت اور استقلال سے کام لے کر نپولین کے خلاف متحدہ محاذ قایم کیا۔ یہ اتحاد بہت وقت سے اور دیر میں قایم ہوا۔ نپولین کی حیثیت اس قدر بلند تھی اور اس کو ایسا ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا کہ برطانوی مدبر دل اسکندر میٹرنش اور پروشیا کے لیڈروں کی بہترین قابلیت اور انتھک مشقت ہی سے نپولین کے خلاف یہ اتحاد قایم کیا جا سکا اور رفتہ رفتہ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۱۴ء کے عرصہ میں نپولین کو جرمنی اور مشرقی فرانس سے نکالا جا سکا۔ بالآخر وہ فونٹینے لیبو میں مستعفی ہوگیا۔ اس کے بعد "جنگ صدروز" اور واٹرلو نپولین نے لڑیں یہ لڑائیاں جس قدر بہادرانہ کہی جائیں درست ہیں مگر یہی اس کے اقتدار پر کاری ضرب ثابت ہوئیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام واقعات موجودہ حالات سے کچھ مناسبت ضرور رکھتے ہیں ہٹلر کی پارٹی کو یعقوبی جماعت، گسٹاپو کو فرانس کی انقلابی پولیس، پانچویں کالم والوں کو فرانس کی حامی اٹلی اور جرمنی کی جماعتیں بلٹزکریگ کو حملہ جینا اور نئے نظام کے لیے جدوجہد کرنے والے ہٹلر کو نپولین سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے اگر معاہدہ امیان کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ دلچسپ بات معلوم ہوگی کہ میونخ پیکٹ کی طرح اس میں بھی برطانیہ نے مخالف یعنی نپولین کو دلاسا دینے کی کوشش کی تھی۔ انقلابی تحریکوں سے عوام میں ضبط ونظم قایم ہوا اور انھیں کی مدد سے نپولین اور ہٹلر نے تمام یورپ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا انھیں اس میں یہی دشواری پیش آئی کہ وہ اپنی افواج کو اس طرح منظم کریں جس سے اپنے مقبوضات برقرار رکھے جاسکیں۔ نپولین برطانیہ جیسے اہم ملک فتح کرنے سے قاصر رہا۔ وہ فرانسیسی اقتدار کے تحت یورپ میں ایک اعلیٰ اور مثالی حکومت بھی قایم نہ کرسکا۔ ان متوازی واقعات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بالآخر ہٹلر بھی ناکام رہے گا۔ انقلاب فرانس

اور نپولین کے زمانے کے آخر تک تقریباً پچیس برس کا عرصہ لگا تھا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان یکساں واقعات کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکے اور ممکن ہے کہ آج کل ایسے اہم اور نمایاں عناصر موجود ہوں جس کی وجہ سے بیان کردہ حقایق پر مستند کلیئے قایم نہ کیے جا سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عناصر موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ اس نوعیت کے ہیں کہ ہمیں اپنا ... ہٹلر ناکام رہے گا تبدیل کر دینا پڑے۔

ایک سال ہی پہلے لوگ بہت اہم واقعہ کے منتظر تھے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہٹلر برطانیہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لے گا ایسی صورت میں اس کا آخری دشمن بھی ناکارہ ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا پھر بھی ہمیں بہت ... خود اعتمادی کو دخل نہ دینا چاہیے ایسا حملہ آج بھی ناممکن نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ خلیج کے کئی میل ... سمندر نے ہٹلر کی افواج کو اسی طرح روک رکھا ہے جس طرح اس نے نپولین کو باز رکھا تھا۔ برطانوی تجارت کے خلاف اس وقت نپولین کے زمانے سے زیادہ سخت جنگ ہو رہی ہے۔ برطانیہ ماکولات کے لیے بھی دوسرے ممالک کا محتاج ہے۔ نپولین کا مقصد برطانوی تجارت کو تباہ کرنا تھا اور ہٹلر کی جنگی اسکیم ان جزائر کو بھوکا مارنے کی معلوم ہوتی ہے۔

گو یہ مضمون لکھتے وقت جنگ اطلانتک، برطانیہ نے اگرچہ جیتی نہیں ہے تو بھی اس کے حق میں بہتر ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ ہٹلر کا ایسا دشمن ہے جیسا نپولین کا کوئی نہ تھا۔ اور غیر جانبداری کے باوجود ہٹلر کے خلاف بہت نمایاں اور اہم جنگ کر رہا ہے ایسی جنگ نپولین کے خلاف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر بدقسمتی سے صورت حال دگرگوں ہو جاتی ہے اور برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ جنگ سے نکل جاتے ہیں تو بھی امریکہ آخر تک ہٹلر کے خلاف لڑتا رہے گا۔ اور اس کے یو۔ پی نظام کے خلاف برسرپیکار رہے گا۔ اسی کے ساتھ برطانوی نوآبادیات اور مقبوضات بھی لڑتے رہیں گے ۱۷۹۹ء سے ۱۸۱۲ء تک برطانیہ کبھی یورپ کی زمین پر لڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی طرح امریکن لوگ اس وقت ہٹلر سے لڑنے کے لیے آمادہ نہیں تھے ... بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس وقت ہمارے جسمانی اور روحانی وسائل کی مجموعی حالت ایسی ... سے ہم نے ہٹلر کے خلاف زبردست محاذ قایم کر رکھا ہے ایسا ہی نپولین کے خلاف برطانیہ نے

قایم کر رکھا تھا ہم شاید معاہدہ امیان کی طرح بظاہر دشمن کی تشفی کے لیے کوئی سمجھوتہ کرلیں لیکن ایسی صلح کے لیے جرمنی، برطانیہ اور امریکہ کو بالکل بدل جانا ہوگا۔

ایک اور عنصر بھی ہے۔ سائنس اور صنعتوں میں بہت ترقی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے طریقہ حرب اور محکوم آبادی کو دبائے رکھنے کے طریقوں میں بہت تبدیلی ہوگئی ہے۔ بہت سے لوگ ہٹلر اور نپولین کی مماثلت سے اسی بنا پر انکار کرتے ہیں۔ اول تو ان کا کہنا یہ ہے کہ ہیلی ہوائی جہازوں، ٹینکوں، توپوں اور دوسری ایجادوں کے باعث حالات اس قدر بدل گئے ہیں کہ جرمنوں کا ایک چھوٹا سا رسالہ جس کے پاس یہ اسلحات ہوں مفتوح ملک کو ایک عرصے تک دبائے رکھ سکتا ہے۔ ہسپانیوں، جرمنوں اور دوسرے ممالک کی بغاوت نے نپولین کے عروج کو زوال سے بدل دیا تھا لیکن اب یہ ناممکن ہے۔ گوریلا جنگ اور شہری مخالفت محال ہے کیونکہ جرمنوں کا ان پر اجارہ ہونے کی وجہ سے موجودہ اسلحہ حاصل نہیں کیے جاسکتے وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ رائے عامہ پر قابو حاصل کرنے کے طریقے بھی بدل گئے ہیں چنانچہ کچھ تو ریڈیو کی امداد سے عوام کے دماغ آسانی سے متاثر کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھپائی سستی ہوگئی ہے تعلیم عام ہے، عوام کی ذہنیت سمجھ لی جاتی ہے اور اس کے علاوہ بھی اور بہت سے طریقے ہیں۔ ان سب نے ہٹلر کے پاس ایسا مسالہ فراہم کر دیا ہے جس سے ایسی مخالفتیں نہیں ہوسکتی ہیں جو نپولین کے خلاف ہوئیں، اور جس نے اسے تباہ کر دیا۔ ہمیں ان بیانات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہیں تو ہٹلر اور نپولین کی مماثلت بہت کم رہ جاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عوام نے اسپین میں نپولین کی مخالفت جس وسیع پیمانے پر کی وہ آج کل ممکن نہیں یہ بھی درست ہے کہ چھوٹے اسلحے کی طرح ٹینک وغیرہ پوشیدہ طور پر تیار کر کے تقسیم نہیں کیے جاسکتے۔ لیکن نپولین کے زمانے میں بھی عوام کی مخالفت اس وقت تک بیکار رہی جب تک فوج نے ان کی مدد نہیں کی ماسکو سے پسپائی کے بعد نپولین کے ناقابل تسخیر ہونے کا خیال کمزور پڑ گیا۔ اس وقت ولنگٹن کی زبردست فوج کی مدد سے مفتوحین نے آبنائے آئبیریا میں آزادی کا علم بلند کیا۔ جرمنی روس سے لڑنے میں مصروف ہے اور برطانیہ فضائی برتری حاصل کر کے آسانی سے سارے یورپ پر تسلط حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عوام بھی اُس زمانے سے زیادہ تباہی پھیلا سکتے ہیں نظم و نسق کی وسعت کی وجہ سے یہ برما د؟

ست معزت رساں ثابت ہوگی اور جو یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ جرمنوں کا ایک دستہ موجودہ اسلحہ سے آراستہ ہو کر کسی مقام پر عرصے تک تسلط قایم رکھ سکتا ہے۔ اس میں شاید یہ امر فراموش کر دیا گیا ہے کہ جرمن بھی تو آخر انسان ہیں اور ان سے لغزشیں ممکن ہیں وہ بھی آدمی ہیں اس لیے اس کا امکان ہے کہ وہ اکثر لاپروائی برتیں اور اپنے بہترین ضبط و نظم کو فراموش کر دیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مفتوحین سے دوستی کر لیں جرمنوں کا دیرپا عرصہ دراز تک محاصرہ رکھنا محال ہے۔ ان کے جید نوجوان سپاہی ضبط و نظم میں پکے اور عقاید میں ثابت قدم ہوں مگر ایسے منتخب سپاہی تو محاصرے کے لیے نہیں بھیجے جا سکتے۔ اگر یہ بھی ممکن ہو تو وہ ان اثرات سے کبھی نہیں بچ سکتے جو گزشتہ زمانے میں مفتوح اقوام فاتحین پر ڈالتی رہی ہیں۔ اسپارٹا والوں کی مثال لے لیجیے۔ انھوں نے جنگ پیلو پونیا کے بعد یونانیوں کو گھیرے رکھنا چاہا تھا۔ سپارٹن سپاہی بھی چیدہ اور ضبط و نظم میں بہترین تربیت یافتہ تھے۔ وطن پرستوں نے تھیبا کے محاصرین کے لیے خطرناک جال بچھایا آخر وہ اس میں پھنس گئے اور ان کا ضبط و نظم چند ہی سال میں اتنا خراب ہو گیا کہ انھیں وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ جن لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ موجودہ اسلحہ کے باعث جرمن مفتوح ممالک کی بغاوتوں پر پورا قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ شاید اس اہم نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ یہ اسلحہ بھی تو آدمی ہی استعمال کرتے ہیں۔ توپوں ٹینکوں اور غوطہ زن بمباروں اور اس کے برعکس نیزوں اور بندوقوں میں فرق درجے کا نہیں بلکہ نوعیت کا ہے۔ مگر کیا کوئی یہ بھی یقین کر سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۱۰ء کے فرانسیسی اور سنہ ۱۹۴۲ء کے سپاہی میں بھی اتنا فرق ہے یہ ہرگز ممکن نہیں ایسا ہونا عجائبات میں سے ہوگا۔

مفتوح اقوام کو قبضے میں رکھنے کے لیے جرمنوں کے پاس دوسرا ہتھیار ریڈیو کا پروپیگنڈا ہے جو لوگ نپولین اور ہٹلر کی مشابہت سے انکار کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے سحر سمجھتے ہیں ان کا قول ہے کہ جرمن موجودہ اسلحہ سے فائدہ اٹھا کر مفتوح اقوام بغاوت کی تمام صورتیں خاک میں ملا دیں گے۔ اس کے بعد ریڈیو پروپیگنڈا ان کے دلوں سے بغاوت کے تصور کو بھی مٹا دے گا۔

اس موضوع پر بہت کچھ فضول باتیں لکھی اور کہی جا چکی ہیں ایک سال ہی پہلے اکثر لوگ یہ بھی بحث کرتے تھے کہ نازی یورپ کے انقلاب عام کے علمبردار ہیں ہر ملک میں آبادی کا پست طبقہ نجات دلانے

والوں کی حیثیت سے ان کا استقبال کرتا ہے۔ عادات، رسوم، مفاد اور نصب العین جیسی چیزیں خاک میں مل جائیں گی
آج کل تمام اخبارات ایسی چیزیں شائع کرتے رہتے ہیں جن سے یہ دلائل باطل ثابت ہوتے ہیں۔ جرمنوں کی مخالفت کرنے کا جذبہ اور ہمت جسے قومی روح کہا جا سکتا ہے، ناروے جیسے ملک میں پیدا ہو رہی ہے جہاں یہ اب تک مفقود تھی۔ پروپیگنڈا نازی بھی کر رہے ہیں اور ہم بھی کرتے ہیں اور آج کل ہم ہی بہتر کر رہے ہیں۔ جرمنی کے مفتوحہ ممالک میں ہم ریڈیو پر پروپیگنڈا ابھی کرتے ہیں اور ممنوعہ ادب بھی پہنچا رہے ہیں۔ نپولین کے زمانہ میں فرانسیسی جرمنوں کو آرنٹ کی نظمیں گانے سے باز نہ رکھ سکے اسی طرح نازی اس پروپیگنڈے کو بھی نہیں روک سکتے۔
یہاں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جرمنوں نے اپنی حکومت منوانے کے لیے کوئی جادو نہیں کیا ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے فرانسیسیوں سے کہیں بدتر کام کیے ہیں۔ فرانسیسیوں نے اپنے عمل سے اپنے مقولے "آزادی برادری اور مساوات" کی تردید کی ہو مگر یہ دوسری یورپی اقوام کے لیے جاذب نظر ضرور رہا۔ جرمن نسلی اور تہذیبی اعتبار سے اپنے برتر اور افضل ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور انھوں نے زیک، پول، سرب اور فرانسیسی حتیٰ کہ اطالویوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ ان کے انھیں اصولوں کے مطابق ہے۔ ان کے نہ تو اصول ایسے ہیں اور نہ حرکات جس سے مفتوحہ اقوام ان سے وابستہ ہو سکیں۔
یہ واقعی ممکن ہے کہ آئندہ چند سال میں جرمن وہ چیز حاصل کر لیں جو نپولین کبھی پوری طرح سے نہ پا سکا۔ یعنی ان کا سارے یورپ پر تسلط ہو جائے۔ نازیوں کے پاس موجودہ اسلحہ ہیں اور ابھی تک انھوں نے مفتوحہ اقوام کے ساتھ باقاعدہ طور پر ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ جرمن مدبروں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ لیڈروں کے قتل عام سے عوام بے حس اور کمزور ہو جائیں گے لیکن ان [illegible] کی زبردست طاقت رکھتے ہیں اور جب ان کی روایات شاندار اور بلند ہوں تو یہ قوت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بہت زیادہ امکانات ہیں کہ وہ جلد سنبھل کر پہلے سے زیادہ جوش، ملت اور قوت سے اٹھ کھڑے ہوں۔
جرمنوں کی موافقت میں تیسرا عنصر اقتصادی مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ اقتصادیات
کی رو سے [illegible]

[illegible] لیتے ہیں کہ جس طرح عہد وسطیٰ میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے زمینداری زوال پذیر ہو گئی تھی اسی [illegible] صنعتی ترقی کی وجہ نئے سیاسی معاملات کا ہونا ضروری ہے۔ ابھی تک اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ ہٹلر جو نیا نظام قائم کر رہا ہے وہ انہی اقتصادی تبدیلیوں کی وجہ سے ترقی کرتا ہے اس کی یہ اسکیمیں بیشتر خیالی اور بے محل معلوم ہوتی ہیں۔ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

مشہور جرمن مصنف ہرمن راشنگ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہٹلر رک نہیں سکتا۔ یہاں [illegible] بارے میں بھی کچھ کہنا ہے یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ جب تک [illegible] اور اس کے آدمی ختم نہ ہو جائیں ہٹلر اپنے وسائل کی مدد سے فتح کرتا چلا جائے۔ واقعی نپولین بھی وقت پر نہیں رکا۔ اسکندر اعظم کو اس کی فوج نے مجبور کیا اور وہ رک گیا تھا اور اس کی سلطنت بھی اس کے مرتے دم تک برقرار رہی۔ اگر ہٹلر یا اس کے جانشین اس حالت پر رک جائیں جو انہوں [illegible] میں پیدا کر لی ہے تو یہ محال ہے کہ وہ اسے بین الاقوامی حکومت بنا کر برقرار رکھ سکیں گے۔ اگر ایسی حکومت [illegible] دور بھی رکھے جا سکیں تب بھی اندرونی تغیرات اور تصورات اسے تباہ کر دیں گے۔

تمام حکومتوں کی بنیاد مفتوحین کی رضامندی پر ہوتی ہے اگر یہ بیان سطحی اور جذباتی معلوم ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی بنیاد مرضی اور عادت پر ہے لیکن عادات بہت آہستہ آہستہ اور ان حالات میں پیدا ہوتی ہیں جو فاتح کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں اور یہ غیر ممکن ہے کہ برطانیہ اور امریکہ جرمنوں کو اتنا وقت دیدیں کہ وہ مفتوحین کو نئے نظام کا عادی بنا لیں۔ یہ بات نپولین کی مماثلت سے نہیں بلکہ تاریخ حاضرہ سے اچھی طرح حل ہو سکتی ہے۔

عہد وسطیٰ کے بعد پانچ صدیوں سے یورپ میں بہت سے قومی طبقے رہے ہیں جن میں اٹلی، فرانس جرمنی، اسپین اور روس بڑے بڑے ہیں۔ ان کے درمیان میں بلجیم، ہالینڈ، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ اور بوہیمیا کے چھوٹے طبقات ہیں۔ ان طبقات کی سرحدوں میں کافی ردوبدل ہوتا رہا ہے اور چھوٹے طبقے تو اکثر نقشے سے مٹ بھی گئے مگر مختلف زمانوں کے نقشوں کو دیکھنے سے تعجب ہوتا ہے کہ ان طبقات کی شکل بیشتر کس قدر یکساں رہی آئرلینڈ ہی کو لے لیجیے برطانیہ نے اسے بارہویں صدی میں فتح کیا اور آئرش زبان تک کو مٹا دینا چاہا لیکن آٹھ سے [illegible] ء کے بعد آج پھر یہ آزاد، خود مختار ملک کی حیثیت سے نقشے پر نمودار ہو گیا۔

یہ طبقات صدیوں تک آپس میں لڑتے اور قوی ہو کر دوسروں کو فتح کرتے رہے ہیں۔ نپولین نے

اپنے اقتدار کے شباب پر سارے یورپ کو بلا واسطہ یا بالواسطہ زیر نگیں کر لیا تھا۔ یہ یورپ کا پہلا تجربہ نہیں تھا۔ چارلس پنجم، نپولین اعظم اور ولیم نے اسی طرح کی کوششیں کر کے یورپ کے طبقاتی نظام کو درہم برہم کر دینا چاہا۔ ہٹلر بھی یہی کوشش کر رہا ہے جو اس وقت بظاہر کامیاب نظر آتی ہے۔ یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ فرانس کی شہنشاہیت برگنڈی اکوئین کی طرح مٹائی جا سکتی ہے۔ سارے یورپ کی ایک وسیع سلطنت تسخیر اور الحاق سے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ کوئی کامیاب اور منظم شہنشاہ ایسا کر سکتا ہو۔ واقعات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جرمنوں میں یہ صلاحیت ہے اور وہ رومیوں کی مثال پر جرمن سلطنت قائم کر سکتے ہیں۔

تاریخ نے ہمیں سبق دیا ہے کہ یورپ کا اتحاد یا انضباط جلد نہیں ہو سکتا۔ انسانی عادات اور جذبات پر تمام سیاسی امور کی بنیاد ہے اور وہ دفعتاً بدلے نہیں جا سکتے۔ اس کے لیے دن اور سال تو کیا ایک پشت بھی کافی نہیں۔ جابر اپنے افعال سے مفتوحین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایسی عادات اور جذبات کے خلاف عمل پیرا ہوں۔ اس کا ردعمل یہ ہوگا کہ یہ کروڑوں لوگ اپنے روزمرہ دستور پر واپس آنا چاہیں گے اور یہ واپسی کا طریقہ اچھا نہیں ہوگا کیونکہ ان میں انہیں اسی قدر نفرت اور تشدد سے کام لینا پڑے گا جس سے ان کی عادات چھڑائی گئی تھیں۔ اس کی ابتدا ہو چکی ہے اور موسیو لاوال اور مارسل ڈیٹ اس کے شاہد ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر کو ہرایا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ امریکی منتظر ہیں کہ تاریخ اور فطرت اپنا طریق کار اختیار کرے۔ ایسا نہیں ہے۔ امریکہ والے ہٹلر کے خلاف لڑنے والوں میں اس کے خلاف جنگ کرنے اسے ہرانے کا جذبہ اور مشتعل کرنا چاہتے ہیں۔ ہٹلر کے ہارنے کا ہمیں یقین ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے ہمارے دل میں اس کے ہرانے کا جذبہ کم نہیں ہو سکتا۔ جمہوریتوں میں اکثر لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ہٹلر ناقابل تسخیر ہے اور تاریخ فتوحات میں اس کی مدد کر رہی ہے۔ یہ خیال مہمل اور بالکل بے بنیاد ہے۔ نپولین بھی سنہ ۱۸۱۲ء میں سارے یورپ میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

(ترجمہ از فارین افیرس) شفقت اللہ کرمانی ایم، اے (علیگ)

گورکی اور ٹالسٹائی

اس کو خواہ اتفاق کہیے خواہ قدرت کا طریقۂ کار خیال کیجیے کہ بیشتر مشاہیر کی زندگی دنیاوی اعتبار سے مصائب و آلام کا شکار ہی رہی۔ ایسے لوگ تو بہت کم ہیں جو آسودہ گھروں میں پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی انہوں نے بھی عسرت کی زندگی اختیار کر لی۔ شاید عسرت اور مصائب کی زندگی ہی انسان میں وہ خاص ادراک اور نفسی پختگی پیدا کرتی ہے جو اس کو دنیا کا امام بنا دیتے ہیں۔ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی شاید انسان اسی وقت مکمل ہوتا ہے جبکہ وہ آسودگی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر دوامی اقدار کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا لیتا ہے۔

گورکی بھی مثل دیگر مشاہیر کے ایک نادار گھر میں پیدا ہوا اور ابھی بچہ ہی تھا کہ یتیم ہو گیا۔ گورکی کے نانا نانی اس حادثے سے بہت پریشان ہوئے کچھ دن تو وہ خاموش رہے پھر انہوں نے اپنی بیٹی (گورکی کی ماں) کا نکاح ایک گھڑی ساز سے کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہ گھڑی ساز اتفاق سے اتنا بدصورت تھا کہ گورکی کی ماں اس سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوتی تھی گورکی اپنے بچپن کے حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے "اس زمانے میں میری ماں بڑی [illegible] . . . اس کی رنگت اڑنے لگی تھی مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا اس بچپن کے زمانے میں مجھے یوں ہی سا خیال تھا کہ نانا میری ماں سے زبردستی کچھ کرانا چاہتے ہیں جس کو میری ماں پسند نہیں کرتی اس زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک روز نانا نے دروازے سے سر نکالا اور میری ماں سے کہا "وہ آ گیا ہے ذرا کپڑے پہن کر آ جاؤ" میری ماں نے یہ سن کر جنبش تک نہ کی اور گردن نیچے کیے ہوئے دریافت کیا "کہاں آ جاؤں؟" نانا بولے "خدا کے لیے آ جاؤ وہ اچھا آدمی ہے اپنے گھڑی سازی کے کام میں ہوشیار ہے اور الیکسی (گورکی) کے ساتھ باپ کا سا سلوک کرے گا۔" ماں نے تیزی سے جواب دیا "میں کہہ رہی ہوں میں نہیں کروں گی"، اس جواب پر نانا لال پیلے ہو گئے اور چلائے "چلتی ہو تو چل ورنہ میں تیری چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا"، اس پر میری ماں چلائی "مجھے گھسیٹو گے؟" وہ غصہ میں کھڑی ہو گئی اور اس نے سوائے ایک کپڑے کے باقی تمام کپڑے اتار ڈالے اور کہا "ہاں اب مجھے گھسیٹو" اور وہ خود دروازہ کھول کر اسی حالت میں باہر جانے لگی۔ میرے نانا ابا بہت تلملائے انہوں نے بہت

دانت پیسے اور کہا میری عزت خاک میں ملاتی ہو تو ہمیں تباہ کرے گی۔ نانی اماں پہلے ہی سے دروازہ روکے کھڑی تھیں اور میری ماں کو پیر سے اس طرح دھکیل رہی تھیں جیسے مرغیوں کو ڈربے میں دھکیلتے ہیں۔ میری ماں نے نانی سے کہا: کان کھول کر سن لو میں اس کے پاس نہیں جانے کی۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گورکی کس طبقہ کا آدمی تھا اور اس کی پرورش کس ماحول میں ہوئی تھی۔

اگر مصائب صرف یہیں ختم ہو جاتے تب بھی غنیمت تھا لیکن گورکی کی قسمت میں جلد ہی یتیم ہونا بھی لکھا تھا۔ چنانچہ اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد گورکی کی ماں فطری جذبات سے متاثر ہو کر ایک شریف زادے کے ساتھ ماسکو بھاگ گئی۔ وہ میاں ابھی کالج ہی میں تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ جب تک روپیہ رہا ماسکو میں خوب عیش کرتے رہے جب روپیہ ختم ہو گیا تو رومانیت بھی ختم ہو گئی اور دولہا صاحب بھی اس پر مجبور ہوئے کہ اس کے سسر کے پاس پناہ لیں گورکی کی زندگی کا یہ زمانہ بہت تاریک گزرا ہے کیونکہ اس کا سوتیلا باپ نہ صرف گورکی کے ساتھ بلکہ اس کی ماں کے ساتھ بھی برا سلوک کرتا تھا اب اس نوجوان کا دل محبت سے سیر ہو چکا تھا۔ گورکی کی ماں جب ماسکو سے واپس آئی تو حالت امید میں تھی اور کچھ اس وجہ سے اور کچھ مالی مشکلات اور شوہر کی بے رحمی کے سبب اپنی رونق کھو رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کی صورت کا مذاق اڑاتا اور چڑانے کے لیے اپنی نئی عیاشیوں کے افسانے اس کے سامنے فخریہ بیان کرتا۔ ورورا اس کی ان باتوں سے اس قدر کڑھی کہ اس کو دق ہو گئی۔ ایک دن کا ذکر ہے گورکی دیوار کے پاس کھڑا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو نوجوان سے یہ درخواست کرتے سنا کہ وہ بھی اس عورت کو دیکھنا چاہتی ہے جو نوجوان کی محبت کی مالک ہو گئی ہے۔ گورکی اپنی سوانح میں لکھتا ہے "میں یہ سن ہی رہا تھا کہ دیوار کے پیچھے سے گھونسے کی آواز آئی میں فوراً لپکا دیکھتا کیا ہوں کہ میری ماں گھٹنوں کے بل گری پڑی ہے۔ اس کی بری حالت ہے اور میرا سوتیلا باپ چمکدار بوٹ پہنے پاس کھڑا ہے اور اس کے سینے پر ٹھوکریں مار رہا ہے" گورکی کو یہ منظر دیکھ کر تاب نہ رہی اور اس نے میز سے چھری اٹھا کر اپنے سوتیلے باپ کے ماری جس سے کپڑے تو پھٹے لیکن چوٹ نہ آئی۔ گورکی آگے چل کر لکھتا ہے کہ اسی روز شام کو اماں جان میرے پاس آئیں۔ پیار کیا اور رو رو کر کہنے لگیں۔ میں خود کو مجرم محسوس کرتی ہوں مجھے معاف کرو۔ یہ اس زمانے کے واقعات ہیں جب گورکی چھ سال کا تھا۔

جب [illegible] ۱۲ سال کا ہوا اس وقت لکھتا ہے "چالیس برس گزر گئے لیکن آج بھی میں اس کمینہ پیر کو ایک عورت کی چھاتی پر ضرب لگاتے دیکھتا ہوں" اس چھری کے واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد گورکی کا سوتیلا بھائی پیدا ہوا۔ ماں زچگی کے زمانے ہی میں رخصت ہوگئی اور ماں کے مرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ بچہ بھی چل بسا۔

ماں کے بعد گورکی کا نانا نانی کے سوا کون تھا چنانچہ وہ وہیں رہنے لگا۔ یہاں کا ماحول بڑا خراب تھا۔ گورکی کے ماموں شرابی، کبابی اور عیاش تھے۔ ہر وقت یا تو آپس میں یا اپنے ماں باپ سے جھگڑتے رہتے تھے ایک دن ایسی لڑائی ہوئی کہ گورکی کی نانی کی بانہہ ٹوٹ گئی۔ گورکی کا ابتدائی بچپن ان ہی لڑائی جھگڑوں میں گزرا جب ذرا بڑا ہوا تو نانی نے اسکول میں داخل کرا دیا لیکن اسکول کے وقت کے علاوہ گورکی ایک بوری لیے سڑکوں پر ردی، دھجیاں اور کیلیں وغیرہ چنتا پھرتا اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا نانی اماں کو لا کر دے دیتا۔ لڑکپن شروع ہوا تو تعلیم ختم ہوگئی نانی نے ایک جوتے والے کی دوکان پر نوکر کرا دیا اس دوکان پر پہلا سبق یہ ملا "بے ایمانی کے بغیر دوکانداری نہیں ہوتی" گورکی اس زمانے کا ایک واقعہ بیان کرتا ہے "دوکان کے نوکر بے ایمان تھے دوکان کی چیزیں اڑا لیتے تھے۔ ایک دن قریب کے گرجے کا دربان میرے پاس آیا اور مجھے پھسلانے لگا کہ اس کے پیر کا ایک جوتا چرا کر اس کو دے دوں۔ میں نے کہا اچھا تم بڑے آدمی ہو تمہارے سفید بالوں کی خاطر مجھے یہ بھی کرنا پڑے گا۔ یہ بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دربان بولا اگر میں تمہاری چوری کا ذکر مالک سے کر دوں تو کیا ہو؟ دربان کی اس دھمکی سے میں بہت ڈرا۔ میرا خوف دیکھ کر وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور چوری کے ارادہ پر مجھے برا بھلا کہنے لگا پھر کہا "میاں لڑکے کیا یہ خیال کرتے ہو کہ انسان انسان کے ساتھ برائی نہیں کر سکتا۔ ہا ہا تم بڑے بیوقوف ہو" گورکی ملازمت چھوڑ کر نانا نانی پر بار ہوگیا۔ اب نانی اور نواسے جنگل میں جاتے اور وہاں سے رس بھری اور خشک [illegible] چن لاتے اور ان کو فروخت کر کے جو کچھ ملتا وہ نانی نانا کو لا کر دیتے تھے۔ اس پر بھی نانا آنکھیں نکالتے، غراتے اور کہتے "تم تو کھانا جانتے ہو کمانا نہیں جانتے" کچھ دن بعد نانی نے اپنی بہن کے لڑکے کے دفتر میں گورکی کو ۲۰ روپے سالانہ پر رکھوا دیا۔ وہاں رشتہ کی نانی نے گورکی کو اتنا پریشان کیا کہ ایک روز جب اس نے صبح کا ناشتہ لانے کے لیے گورکی کو پیسے دیے تو بجائے ناشتہ لے کر دفتر جانے کے وہ دریائے والگا کے کنارے نکل گیا اور ایک جہاز پر ملازمت کر لی۔ خدا کی قدرت کہ اس

جہاز کے بڑے باورچی کو کتابیں سننے کا شوق تھا اس نے گورکی کو یہ خدمت سپرد کی۔ اس طرح گورکی کو افسانے پڑھنے کا خوب موقع ملا اور شوق بھی بڑھ گیا۔ کیونکہ یہ ملازمت ایک خاص میعاد تک کی تھی اس لیے جب وقت پورا ہوگیا تو ملازمت بھی ختم ہوگئی اور گورکی کے سامنے پھر روزگار کا مسئلہ آگیا وہ تلاش معاش میں شہر بہ شہر پھرتا پھرتا مفلس پہنچا جہاں حسن اتفاق سے اس کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس کی ہمدردی نے گورکی کی زندگی بنا دی۔ یہ شخص کلی آزنی نامی ایک انقلابی تھا جو سائبیریا میں چھ سال کی قید بامشقت کاٹ چکا تھا اس کا ایک بہت اچھا ذاتی کتب خانہ بھی تھا۔ یہ شخص گورکی کا شفیق ہوگیا اور اس نے آوارہ گرد گورکی کو اپنے کتب خانے سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی جب دوستی بڑھی تو ایک دن کلی آزنی نے گورکی کو کمرے میں بند کر دیا اور کہا کہ جب تک اپنی زندگی کے حالات ایک مضمون کی شکل میں قلمبند نہ کروگے دروازہ نہ کھلے گا چنانچہ گورکی نے حکم کی تعمیل کی اور وہ مضمون مقامی سرکاری اخبار میں ۴؍ دسمبر ۱۸۹۲ء کے پرچے میں طبع ہوا گورکی نے جب اپنی خود نوشتہ سوانح حیات سرکاری اخبار میں دیکھی تو بہت مسرور ہوا۔ اب وہ کہانیاں لکھنے لگا اور رسائل میں بھیجنے لگا جس سے اس کی کچھ کچھ شہرت بھی ہونے لگی لیکن آمدنی کی کوئی صورت نہ نکلی اس زمانہ میں ایک وکیل کی محرری کرلی۔ تنخواہ ملی تو عشق کی سوجھی ایک پولینڈ کی عورت سے شادی کر بیٹھے ایک مکان دو روبل مہینہ کرایہ پر لیا وہاں عسرت میں بسر کی نتیجہ یہ نکلا کہ پھیپھڑوں کی دق ہوگئی۔ بھلا دماغی انسان اور بے دماغ عورت کی کب نبھ سکتی ہے ایک دن گورکی اور اس کی بیوی ہم آغوش تھے تو گورکی نے اس کو محبت کے متعلق اپنا نظریہ سمجھانا شروع کیا۔ گورکی لکھتا ہے۔ "وہ میری باتیں سن کر بھونچکی سی ہوگئی اور کہنے لگی کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے۔ کیا واقعی تم یہ خیال کرتے ہو؟" وہ گورکی کی ہم خیال نہ تھی اس کا نظریۂ محبت محض تفریحی تھا۔ وہ گورکی کے دوستوں سے بے تکلف تھی جس سے اس کو حسد ہوتا تھا۔ گورکی اپنی اس کمزوری کو فلسفہ کے رنگ میں ڈھال کر یوں بیان کرتا ہے۔ "مرد کی زندگی میں چند لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب وہ اپنا دل عورت کے سامنے اس طرح کھول کر رکھ دیتا ہے جس طرح کہ خدا کا پرستار خدا کے سامنے اپنا ظاہر و باطن بے نقاب کرتا ہے جب عورت کے روبرو مرد کا باطن بے نقاب ہوجاتا ہے تو مرد خود اپنے آپ سے اجنبی سا محسوس کرنے لگتا ہے شاید مردوں میں حسد اس خوف سے پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس کی شریک حیات دوسرے مرد

سے اتنی مایوس نہ ہو جائے کہ وہ شوہر کی راز کی باتیں دوسرے سے کہہ دے۔ قصہ کوتاہ کچھ عرصے بعد گورکی اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہوگئی اور گورکی از سر نو آوارہ گردی کرتا سمارا پہنچ گیا جہاں اس نے اخبار کے دفتر میں ملازمت کرلی۔

اخباری دنیا میں داخل ہو جانے سے زیادہ میل جول اور شہرت ہوتی جاتی ہے چنانچہ گورکی کی بھی بہت سے لوگوں سے شناسائی ہوگئی۔ اگر ایک طرف شہرت بڑھی تو دوسری طرف اس کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورکی سنہ [illegible]ء میں بہت سخت بیمار ہو گیا پھیپھڑوں کی دق تو دق کر ہی رہی تھی لیکن جب کمزوری بڑھی تو ایک اور دکھ عود کر آیا۔ افلاس و مصائب کے زمانہ میں گورکی نے خودکشی کی نیت سے اپنے گولی ماری تھی جو کمر میں ہی رہ گئی تھی اب اس گولی نے بھی تکلیف دینی شروع کر دی۔ حرارت ۱۰۳ درجہ رہنے لگی۔ ڈاکٹروں نے کچھ دن تو علاج کیا پھر زندگی سے ناامیدی ظاہر کی لیکن گورکی کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ وہ بیماری کو سنبھال لے گیا صحت ہوگئی تو دوستوں نے زور دیا کہ افسانوں کا مجموعہ طبع کرا دیا جائے تاکہ اس سے گزارے کے لیے کچھ رقم وصول ہو جائے۔ بڑی مشکل سے افسانے طبع ہوئے اور اس سے زیادہ دشواری سے دوکاندار ان کو ۵۰ فیصدی کمیشن لے کر فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ لیکن کتب فروشوں کی توقع کے خلاف ایک سال ہی میں ساری کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ جب افسانے دوسری مرتبہ شایع ہوئے اور ناشروں نے گورکی کو ایک ہزار روبل روانہ کیے تو اس غیر متوقع خوش قسمتی پر گورکی بہت خوش ہوا اس کے پڑوسی کا بیان ہے جب گورکی کو ایک ہزار روبل ملے تو اس کو خوشی کی بہ نسبت حیرت زیادہ ہوئی وہ میری ماں کے پاس آئے اور ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "دیکھو! دیکھو!! انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ شیطان ان کو سمجھے انھوں نے مجھے پورے ایک ہزار روبل بھیجے ہیں۔ میں اس رقم کا کیا کروں گا" اسی دن سے گورکی کی فضول خرچیاں شروع ہو گئیں۔ سمارا میں گورکی کو ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کو اس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ایک روز دریائے والگا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ آواز آئی "مدد کرنا! ارے بھائیو مدد کرنا!" رات اندھیری تھی کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا مجھے اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی دریا میں ہاتھ پیر مار رہا

ہی میں فوراً دریا میں کود پڑا تیرتا ہوا ڈوبنے والے کے پاس پہنچا اتفاق سے اس کے بال میرے ہاتھ میں آ گئے
میں بال پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا لے آیا جب کنارے پر آ گئے تو اس آدمی نے اچانک میرا گلا پکڑ لیا اور کہنے لگا
[illegible] تجھے کیا حق تھا کہ میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچا، میں نے جواب دیا، ارے بھائی تم ڈوب رہے تھے۔ مدد کے
[illegible] وہ بولا، اے احمق پانی تو میرے کندھوں تک تھا۔ رسی میں نے پکڑ رکھی تھی پھر میں کیسے ڈوبتا؟
کیا تو اندھا ہے؟ میں نے جواب دیا لیکن تم مدد کے لیے تو چلا رہے تھے کیا نہیں چلائے؟ اس نے کہا، پھر کیا ہوا
اگر میں مدد کے لیے چلایا۔ فرض کرو کہ میں چلاؤں تو احمق ہے۔ تو احمق ہے تو کیا تو اس کا یقین کرے گا اچھا اب یا تو
[illegible] ایک روبل دے ورنہ تھانے چل۔ میں نے کچھ دیر تو اس سے حجت کی پھر احساس ہوا کہ اپنے نقطۂ نگاہ سے
یہ بھی درست کہتا ہے۔ میرے پاس تانبے کے کچھ سکے تھے وہ اس کو دے کر جان چھڑائی اور گھر ہو لیا۔ اس تجربہ کی
بنا پر دنیا کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے لگا۔"

گورکی کی شہرت ہوئی تو ایک دوست چیخوف نامی نے گورکی کو غیر معروف وطن ترک کرنے اور ماسکو
کی رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا لیکن گورکی نہ مانا۔ آخر کار چیخوف کو ایک ترکیب سوجھی اس نے گورکی کو لکھا۔

"کل میں ٹالسٹائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا انھوں نے تمہاری بڑی تعریف کی اور یہ خیال
ظاہر کیا کہ تم قابل قدر مصنف ہو انھیں تمہارے دو افسانے "گو لٹوا فیرا" اور "دی۔ رافٹ"
بہت پسند ہیں لیکن "ماتوا" پسند نہیں آیا۔ وہ فرماتے تھے کہ جو کچھ تمہارا دل چاہے تم ایجاد کرو لیکن
نفسیاتی کیفیات ایجاد نہیں ہو سکتیں۔ تم ایسی نفسیاتی کیفیات ایجاد کرتے ہو جو کم از کم ٹالسٹائے کے
تجربہ میں نہیں آئیں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ جب بھی تم ماسکو آؤ گے تو تم
[illegible] میں ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ٹالسٹائے تمہارے [illegible] دریافت کرتے [illegible]
[illegible] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہاری بابت بہت اچھا خیال رکھتے ہیں۔"

یہ معلوم ہو کر کہ ٹالسٹائے ملنا چاہتے ہیں کسی نوخیز مصنف کے لیے باعث فخر تھا چنانچہ اس اطلاع کے
ملتے ہی گورکی نے ماسکو جانے کی ٹھان لی لیکن اس زمانہ میں اخباری زندگی کے انقلابی مقالے رنگ لا رہے
تھے اور پولیس پیچھے پڑی ہوئی تھی ایک مدت بعد جب پولیس سے رہائی ملی تو جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں گورکی

[illegible] ٹالسٹائے سے ملنے گیا۔ ٹالسٹائے اس ملاقات کے متعلق اپنی ڈائری میں اندراج کرتے ہیں۔

"گورکی ملنے آئے۔ ان کے ساتھ باتوں میں اچھا وقت گزرا۔ مجھے گورکی پسند آئے۔ ایک عام [illegible] کی نفسیاتی کیفیت کے پورے ترجمان ہیں اور خود بھی انھیں میں سے ایک ہیں [illegible]"

گورکی اس پہلی ملاقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ٹالسٹائے مجھے کتب خانے میں لے گئے۔ مجھے بٹھایا اور خود میرے سامنے جگہ لے کر میرے افسانے [illegible] "وارنکا" کی تحلیل کرنے لگے۔ کہنے لگے۔ تمہارے افسانے کی وہ لڑکی وارنکا صحت کی اچھی [illegible] عمر بھی پندرہ سال لیکن وہ تخلیقی محبت سے بے پروا [illegible] اور وہ نوجوان پروفیسر سے ہم آغوش تک نہیں ہوئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نفسیاتی طور پر غلط ہے۔ پندرہ سال کی نوجوان لڑکی یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسکو چھیڑے اور اس سے ہم آغوش ہو۔ ٹالسٹائے نے دوران گفتگو میں ایسی بے حجابی برتی کہ میں پریشان سا ہو گیا۔ کبھی کبھی ان کی گفتگو صرف نامناسب ہی نہیں بلکہ گندی تک ہو جاتی تھی"۔

ٹالسٹائے کی اس غیر متوقع طرز گفتگو پر پہلے پہلے تو گورکی کو یہ گمان ہوا کہ شاید ٹالسٹائے اس کی سطح پر آکر اس سے گفتگو کرتے ہیں۔ شاید یہ روسی ادب کے جنرل اس کو دیہاتی خیال کر کے اس سے گانو والوں کی سی گفتگو کرتے ہیں۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد گورکی پر یہ راز افشا ہوا کہ ٹالسٹائے اصولاً دیہاتی زبان بولنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہوتی وہ زباں دانی اور شہری زبان کے تکلفات کو اچھا نہیں سمجھتے جب دوستوں سے باتیں کرتے ہیں تو پھکڑ بن جاتے ہیں۔ گورکی کا بیان ہے "بعض مرتبہ ٹالسٹائے ایسی عریاں گفتگو کرتے تھے کہ ہمارے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے"۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ٹالسٹائے، گورکی اور چیخوف ٹہل رہے تھے کہ دفعتاً ٹالسٹائے نے چیخوف سے اس کے نسوانی تجربات بیان کرنے کی فرمائش کر دی۔ چیخوف بہت پریشان ہوا۔ جب ٹالسٹائے نے چیخوف کی گھبراہٹ دیکھی تو خود اپنے نسوانی تجربات ایک خاص لطف اور رنگینی کے ساتھ بیان کرنے شروع کر دیے۔ گورکی لکھتا ہے "اس وقت گندے سے گندا لفظ بھی جو ان بالوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹوں سے نکلتا تھا وہ اپنی غلاظت کھو دیتا تھا اور سادہ و قدرتی معلوم ہوتا تھا"۔ کریمیا کا ایک اور واقعہ گورکی کا ایک دوست گورکی کی زبانی

اس طرح بیان کرتا ہے

"ایک دن میں اور ایک دوست سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر بالشے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک سمت کسی شے کو آنکھ مار رہے ہیں ہم نے ادھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کبوتر کا جوڑا بیچ سڑک پر تخلیقی محبت میں مشغول ہے اور جہاں دیدہ لطف آشنا بڈھا ان کی طرف آنکھ مار رہا ہے"

کرتمیا سے واپسی پر گورکی اور ٹالسٹائے میں خط و کتابت شروع ہو گئی چند خطوط نمونتاً پیش ہیں۔

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام۔

"لیونیکولیوچ اس حسن اخلاق کا جو آپ نے مجھ سے روا رکھا شکریہ مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی اور آپ سے نیاز حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہوں اگرچہ مجھے پہلے سے اس کا علم تھا کہ آپ ہر مہمان سے سادہ اور پرخلوص طریقہ پر ملتے ہیں لیکن جو محبت آپ نے میرے ساتھ روا رکھی اس کی مجھے امید نہ تھی۔ اگر نامناسب خیال نہ فرمائیں تو اپنی ایک تصویر روانہ فرمائیں۔ میں ملتجی ہوں کہ تصویر سے محروم نہ فرمائیں"

میں ہوں آپ کا نیازمند

اے۔ پشکوف (گورکی کا نام)

ٹالسٹائے کا خط گورکی کے نام

"معاف کرنا کہ میں ایک عرصہ کے بعد جواب دے رہا ہوں اور ہنوز تصویر بھی روانہ نہ کر سکا مجھے تم سے مل کر اور تم کو زیادہ قریب سے جان کر بہت خوشی ہوئی اور میرے دل میں جو تمہاری محبت ہے وہ مجھے مسرور کرتی ہے۔ اکسا کوف کہا کرتا تھا کہ چند مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتے ہیں اور چند خراب میں تمہاری تصانیف کا مداح ہوں لیکن ان سے زیادہ تمہارا مداح ہوں میرے اس جملہ سے سمجھ جاؤ کہ میں تمہارا کس درجہ مداح ہو گیا ہوں۔ تمہاری نسبت میری تعریف اگر قابل قدر ہے تو صرف اس لیے کہ یہ بے لوث ہے۔ اچھا رخصت میں خلوص سے اپنا ہاتھ تمہارے مصافحہ کے لیے پیش کرتا ہوں"

گورکی کا خط ٹالسٹائے کے نام

"آپ کی تصویر اور محبت بھرے الفاظ کا بہت بہت شکریہ۔ لیو نیکولیویچ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی ذات میری تصانیف سے بہتر ہے لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ہر مصنف اپنی تصنیف سے بہتر ہوتا ہے۔ آخر کتاب ہے کیا؟ ایک معرکۃ آرا کتاب بھی مردہ الفاظ کا مجموعہ ہے جو صرف حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برخلاف اس کے انسان کی زندہ ذات خدا کی صفات کی حامل ہوتی ہے۔ میرا خدا کا مفہوم وہ جذبہ ہے جو انسان کو حقیقت شناسی، انصاف اور اپنے آپ کو مکمل بنانے پر ابھارتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ایک برا انسان بھی ایک اچھی کتاب سے بہتر ہوتا ہے کیا ایسا نہیں ہے؟ میرا یہ راسخ یقین ہے کہ اس زمین پر انسان اشرف المخلوقات ہے اور مجھے ڈیموکریٹس کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ صرف انسان کا وجود حقیقت ہے باقی سب زاویۂ نگاہ ہے۔ میں انسان کا پرستار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا (لیکن) میں اس جذبہ کو پوری طاقت سے ادا نہیں کر سکتا۔ میں تجدید ملاقات کے لیے مضطرب ہوں اور مجھے افسوس ہے کہ فوراً ہی اپنی آرزو پوری نہیں کر سکتا مجھے کھانسی ہے اور دورانِ سر کی شکایت ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میں پوری تیزی سے کام کر رہا ہوں۔ آج کل ضرورت سے زیادہ عقلمند لوگوں کے متعلق ایک افسانہ لکھ رہا ہوں میرے خیال میں ایسے افراد جو اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتے ہیں ارذل المخلوقات ہوتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ مزید تحریر کہیں آپ کو اکتا نہ دے۔ اچھا رخصت میں مودبانہ آپ سے مصافحہ کرتا ہوں۔ میری طرف سے گھر والوں کو آداب۔

میں ہوں آپ کی صحت کا دعا گو

اے پیشکوف

کچھ عرصے بعد گورکی پھر روسی قلندر کے پاس آگئے اور اس کی ہر ادا کا بغور مطالعہ کرنے لگے دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تو ٹالسٹائے گورکی کے افسانوں کے کرداروں کا بڑا مذاق اڑاتے اور کہتے۔ گورکی تم اپنے کردار ایجاد کرتے ہو کبھی کہتے "تمہاری تصانیف سے تمہاری باتیں زیادہ دلچسپ ہیں"، ایک دفعہ کہنے لگے گورکی تم ۔ ۔ انیت پسند ہو۔ موحد ہو، اس قسم کے لوگ اشتراکی نہیں ہوتے بلکہ ملوکیت پسند ہوتے ہیں۔ ہیوگو، ہیوگو بال

فضول بکواس۔ ہاں تمھارا افسانہ مسافر مجھے پسند ہے کیونکہ اس میں تم نے ایجاد سے کام نہیں لیا ہے ورنہ وہ تمھارا دوست چیخوف شیکسپیر سے بھی خراب ڈرامے لکھتا ہے۔ ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "ہم سب ادیب بے تکے ہوتے ہیں مجھے دیکھو جب میں افسانہ لکھتا ہوں تو کسی کردار پر مجھے رحم آنے لگتا ہے اور اس میں چند اچھی خصوصیات پیدا کر دیتا ہوں اور کبھی کسی کردار کو اچھی خصوصیات سے محروم کر دیتا ہوں تاکہ سب کردار ایک دوسرے سے گھل مل نہ پائیں" اور پھر سنجیدہ لہجہ میں کہا "اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ادب جھوٹ ہے ایک دھوکا ہے اور اس وجہ سے مذموم ہے"

سنہ ۱۹۰۱ء میں حکومت کی مخالفت کی بنا پر گورکی اپنے ہی شہر کی جیل میں قید کر دیا گیا۔ جب ٹالسٹائے کو گورکی کے بھتیجے نے اس حادثہ کی خبر دی تو ٹالسٹائے نے فوراً ہی زار روس کے بہنوئی اور وزیر خارجہ کو خطوط لکھے جو حسب ذیل ہیں:-

ٹالسٹائے کا خط زار کے بہنوئی کے نام

جناب نواب صاحب!

وہی مصنف گورکی جس کی بابت گزشتہ سال میری اور آپ کی باتیں ہوئی تھیں اور جس کی تصانیف کی آپ نے تعریف فرمائی تھی اس پر ایک حادثہ گزر رہا ہے۔ وہ اپنے اہل و عیال سے چھین لیا گیا ہے اور بلا کسی عدالتی سماعت کے نوگورود کی جیل میں ڈال دیا گیا ہے اس کی بیوی حالت امید میں ہے جیل کے صحت شکن ماحول کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں اور خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک دق کے مریض کے لیے کتنا مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ گورکی کی بیوی اور ان کے دوستوں کو چونکہ اس کا علم ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور مصنف کے میں گورکی کو پسند کرتا ہوں اس لیے انھوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ اس مصیبت میں جو کچھ بھی ان کی مدد کر سکتا ہوں کروں یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو تکلیف دے رہا ہوں مجھے امید ہے کہ گورکی کو اس مصیبت سے نجات دلانے میں آپ [illegible] فرمائیں گے اور نیکی کرنے کا جو یہ موقع ملا ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

آپ کا مخلص تابعدار
لیو ٹالسٹائے

انا سے کا خط وزیر خارجہ کے نام

جناب عالی۔ گورکی کی بیوی اور اس کے دوستوں نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ پیشتر اس کے کہ وگورود جیل میں بلا سماعتِ مقدمہ گورکی کو قتل کر دیا جائے میں اس کی رہائی کی کوشش کروں جو اس خاص جیل کے صحت شکن حالات مجھے معلوم ہوئے ہیں ان کی بنا پہ مجھے یقین ہے کہ ایک دق کا مریض ان حالات میں زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں گورکی کو صرف اسی حیثیت سے نہیں جانتا کہ وہ یورپ کا ایک مشہور ادیب ہے بلکہ میں اس کو ایک ... ہونے کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔

اگرچہ مجھے ذاتی طور پر آپ سے نیاز حاصل نہیں ہے لیکن مجھے امید ہے کہ گورکی اور اس کے اہل میاں سے آپ ہمدردی فرمائیں گے اور جو کچھ آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے اس سے دریغ نہ فرمائیں گے ... ہے کہ مجھے ناامید نہ فرمائیں گے۔ ....

لیو تالستائے

ان خطوط کا یہ اثر ہوا کہ گورکی کو جیل سے نکال کر صرف حراست میں رکھا گیا اس حراست کے دوران میں گورکی ٹالسٹائی کو خط لکھتے ہیں۔

- لیو نکولیوچ۔ میرے معاملہ میں آپ نے جو سعی فرمائی اس کا بہت بہت شکریہ۔ میں جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں لیکن حراست میں ہوں میری بیوی حالت امید میں ہے۔ اس لیے حراست بھی رحمت ہے شاید ایک ماہ جیل میں رہا ہوں گا اس عرصے میں میری صحت پر کوئی خاص برا اثر نہیں پڑا اور نہ میری بیوی کی صحت پر۔ عدالتی تحقیقات جاری ہے۔ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس تحقیقات کا نتیجہ نکلے گا کہ وہ مجھے وطن سے دور کہیں پھینک دیں گے اور پولیس کی نگرانی میں رکھیں گے۔ دوبارہ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ اس معمولی سے معاملہ میں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑی۔

یہ حراست بڑی مضحکہ خیز ہے اگر ایک سپاہی باورچی خانہ میں ہے تو دوسرا کھڑکی پر اور تیسرا سڑک پر۔

میں گھر کے قریب چہل قدمی کر سکتا ہوں لیکن پولیس کا سپاہی سایہ کی طرح ساتھ ہو مجھے ان سڑکوں پر جانے کی اجازت نہیں جہاں آمد و رفت زیادہ ہو سپاہی کو بھی ایک ایسے انسان کی نگرانی کرنا مضحکہ معلوم [illegible] جس کا ارادہ کبھی بھی وطن سے فرار ہونے کا نہیں۔ اچھا رخصت آپ کو صحت، [illegible] اور سکون قلب حاصل ہو میں خلوص کے ساتھ آپ کے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ پیش کرتا ہوں۔

اے چیخوف

۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۰۱ء کو جب ٹالسٹائے ایک خطرناک علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تو دنیا کی ہر سمت سے تہنیت و مبارکباد کے تار آئے گورکی کے وطن سے بھی حسب ذیل تار آیا جس پر سب سے پہلے دستخط گورکی کے تھے

"سب لوگ بےحد مسرور ہیں کہ آپ رو بصحت ہیں۔ اے بزرگ انسان ہماری یہ دلی تمنا ہے کہ حق پرستی کے لیے تو اس دنیا میں صحت یاب رہے تاکہ تیرے انتھک شمشیر کف الفاظ جھوٹ، کینہ اور افترا کے خلاف ہمیشہ جہاد کرتے رہیں"۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ٹالسٹائے صحت کے خیال سے کریمیا گئے تو اس زمانہ میں دونوں دق کے مریض گورکی اور چیخوف بھی روسی قلندر کے پاس پہنچ گئے گورکی نے ایک یادداشت چھوڑی ہے جس کے حسب ذیل اندراجات دلچسپ ہیں

"ایک دن گورکی نے دیکھا کہ ٹالسٹائے اپنی مٹی میں ہاتھ دبے کھڑے ہیں اور ایک گوہ دبڑی قسم کی چھپکلی) سے جو دھوپ کھا رہی تھی کہہ رہے ہیں مزا آ رہا ہو نا، پھر چاروں طرف دیکھا اور گوہ سے کہنے لگے میں ہوں کہ زندگی میں کوئی لطف محسوس نہیں کرتا"

گورکی لکھتا ہو کہ باوجود اس امر کے کہ ٹالسٹائے نے اپنے پوشیدہ سے پوشیدہ واقعات بے کم و کاست سپرد قلم کر دیے ہیں اور ان کا ذہنی رجحان شدت سے مذہبی تھا لیکن وہ زندگی کا معمہ نہ حل کر سکے تھے اور ان کی نگاہ جب بھی اٹھی تھی تو خلا کے سوا کچھ نہ دیکھتی تھی۔ گورکی لکھتا ہو "یہ خلا میں دیکھنا ٹالسٹائے کے ہر اثبات کی نفی کرتا ہو وہ جب اپنے بے تکلف دوستوں میں بیٹھتے تھے تو کبھی کبھی اس پردہ سے نقاب اٹھتا تھا" ایک دن چیخوف نے لیوشیٹوف کی کتاب "نشئے" اور ٹالسٹائے کی تعلیمات میں خیر و شر کا تخیل" کا ذکر کیا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مجھ کو کتاب پسند نہ آئی۔ ٹالسٹائے نے اس کی فوراً مخالفت کی اور کہا "کتاب دلچسپ ہے میں سڑی [illegible] کے

لوگوں کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ ان کے دل میں خلوص ہو شپنہوور کہتا ہے کہ حقیقت کی جستجو فضول ہے وہ درست کہتا ہے۔ حقیقت کس معرفت کی، حقیقت معلوم ہو یا نہ ہو آخر مرجاتا ہے" پھر تیزی سے بولے" ایک مرتبہ انسان فکر کرنے کا عادی ہو جائے پھر وہ خواہ کسی مسئلہ پر بھی غور کیوں نہ کرے دراصل وہ موت کے مسئلہ پر غور کرتا ہے ہر فلسفی جب مختلف مسائل پر غور کرتا ہے تو دراصل وہ موت پر غور کرتا ہے اور جہاں موت ہے وہاں کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔"

ایک دن ٹالسٹائے کہنے لگے "خلیفہ عبدالرحمٰن کہا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ان کے چودہ دن خوشی سے گزرے ... اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ میں کبھی اپنے لیے زندہ نہیں رہا ...... دکھاوے اور نمود و نمائی کے لیے زندہ رہا ہوں" اس خود نمائی کے سلسلہ میں گورکی اور ٹالسٹائے کا حسب ذیل مکالمہ دلچسپ ہے

ٹالسٹائے: گورکی اسکو کب جا رہے ہو؟

گورکی:۔ اب تک چلا جاتا لیکن نوجوانوں کی لیگ نے مجھے دعوت دی ہے کہ ان کے جلسہ میں اپنا کوئی افسانہ پڑھوں

ٹالسٹائے:۔ کیا تم بہت اچھا پڑھتے ہو؟

گورکی:۔ نہیں تو۔

ٹالسٹائے:۔ تب دعوت قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے کیا خود نمائی مقصود ہے؟

گورکی:۔ (شرم سے سرخ ہوکر) نوجوانوں کی لیگ مصر ہے اس لیے مجھے دعوت قبول ہی کرنی پڑی۔

ٹالسٹائے:۔ چاہے کوئی مصر ہی کیوں نہ ہو لیکن اس طرح صرف خودنمائی کے لیے کہیں جانا ناجائز ہے۔ ایک دفعہ ماہرین سائنس کی کانگرس ہوئی ایک دوست مجھے بھی لے گئے جب میں صدر مقام پر پہنچا تو حاضرین نے مجھے پہچان لیا اور میرا استقبال کرنے کے لیے تالی بجائی میرے دوست نے مجھے کہنی ماری اور کہا لیو تمہارا استقبال ہو رہا ہے۔ حاضرین کے سامنے مجھکو اس نے کہا کیوں مجھکو میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

... اگلے روز گورکی کے ایک دوست پوسی ٹالسٹائے سے ملنے آئے تو ٹالسٹائے نے کہا بھئی کل میں نے تمہارے دوست کا دل دکھا دیا میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے ہمارے سامنے ایک آوارہ انسان کا جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے۔ دوستوفسکی نے ایک مجرم کا اور گورکی نے ایک آوارہ انسان کا قابل داد مرقع پیش کیا ہے جو دنیائے ادب میں یادگار

رہے گا گورکی میں صرف یہ کمی ہے کہ وہ بہت کچھ ایجاد کر دیتے ہیں نفسیاتی کیفیات کو وہ قدرتی نہیں رکھتے۔ ٹالسٹائی سے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں "گورکی شاید غیر شعوری طور پر نٹشے کی مقبول تعلیم سے متاثر معلوم ہوتے ہیں مجھے نٹشے کی تعلیم بے حد مکروہ معلوم ہوتی ہے۔"

گورکی کے جو افسانے ٹالسٹائی کی نظر سے گزرے ان کے حواشی پر ٹالسٹائی کے قلم کے اس قسم کے نوٹ درج ہیں "غلط، نفرت آمیز، مکروہ، جب ٹالسٹائی نے گورکی کی تصنیف "اعترافات" پڑھی تو فرمایا "یہ عقل سے بالاتر ہے۔" وفات سے دو سال قبل ٹالسٹائی اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں "گورکی کی تصانیف پڑھیں بہت برا لگا۔ ان کی ایجاد و اختراع بہت غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اگر گورکی سے لطف اندوز ہونا ہے تو ان کی سقم پر نہیں بلکہ ان کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے" ڈائری میں دوسرا اندراج ہے "گورکی کی تصانیف ختم کیں۔ ایک مصنوعی خیالی طوفانی جذبات جو سب غلط اور اختراع معلوم ہوتے ہیں لیکن گورکی قلم کے دھنی ہیں ان کو شاعری کرنی چاہیے کیونکہ شاعری میں خیال اور دماغ کے لیے آوارہ گردی کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔ شاعری میں ہر قسم کا اختراع نبھ جاتا ہے یا پھر ڈراما لکھنا چاہیے کیونکہ اس میں بھی منظر اور ایکٹر ڈرامے کے سقم چھپا لیتے ہیں۔"

ایک دن چیخوف اور ٹالسٹائی باتیں کر رہے تھے دوران گفتگو میں گورکی کا ذکر آگیا۔ چیخوف نے کہا "گورکی بڑا رحمدل انسان ہے" ٹالسٹائی نے فوراً گردن ہلائی اور بولے "نہیں نہیں۔ ان باتوں کو میں تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس کی بطخ کی سی ناک ہے ایسے لوگ دل کے بڑے خراب ہوتے ہیں اور ہاں دوسری بات یہ ہے کہ عورتیں گورکی کو پسند نہیں کرتیں اور جس طرح کتا نیکدل انسان کو ذرا سونگھ لیتا ہے اسی طرح عورتیں بھی ایک نیکدل انسان کو سونگھ لیتی ہیں کیونکہ عورتیں گورکی سے محبت نہیں کرتیں اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک دل نہیں ہے۔"

ایک دن ٹالسٹائی اور گورکی ٹہل رہے تھے کہ جھاڑی میں سے ایک چڑیا کے بولنے کی آواز آئی ٹالسٹائی نے اس کی آواز کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ گورکی چڑیمار رہ چکا تھا اس لیے چڑیوں کی بابت اس کی معلومات کافی تھی گورکی نے اس چڑیا کی یہ خصوصیت بیان کی کہ یہ چڑیا بہت حاسد ہوتی ہے۔ اس پر ٹالسٹائی بولے "صرف ایک راگ سینے میں ہے اور اس پر بھی حاسد ہے کیا ظلم ہے کہ انسان کے سینہ میں ہزاروں نغمے ہیں اور جب وہ حسد کرتا ہے تو دنیا اس کو برا کہتی ہے" پھر حسد کی بابت گفتگو ہونے لگی اور ٹالسٹائی نے اپنے پہلے خیال سے جس کا اظہار وہ اپنے ناول "کرٹزر سوناٹا" میں کر چکے تھے اختلاف کیا۔ گورکی نے کہا "کرٹزر سوناٹا میں تو آپ نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے" اس پر ٹالسٹائی نے ہنس کر جواب دیا "میں چڑیا نہیں ہوں کہ ایک ہی راگ گائے جاؤں۔"

اگرچہ ٹالسٹائے گورکی کی تصانیف پر سخت تنقید کرتے تھے تو گورکی بھی ٹالسٹائے کے فلسفہ پر تنقید کرنے میں کچھ کم نہ تھا گورکی کا خیال تھا کہ ٹالسٹائے کا فلسفہ (Nihilism) نراجی اور چینیوں کا فلسفہ ہے۔ ان کا عدم تشدد اور اہنسا کا تصور وقت گل کو متاثر کرتا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گورکی، ڈاکٹر والکوف اور ٹالسٹائے باتیں کر رہے تھے کہ ٹالسٹائے نے ایک مغربی مصنف کے ناول کے ایک سین کی بڑی تعریف کی جس میں ایک شرابی میاں نے اپنی بیوی کو زدوکوب کیا تھا لیکن باوجود خاوند کے اس تشدد کے شریف بیوی نے میاں کا بستر کیا اس کو آرام سے لٹایا اور اس کے سر کے نیچے تکیہ ٹالسٹائے کی رائے تھی اس سین میں ادبی جوہر موجود ہے گورکی اس وقت تو ٹالسٹائے کی رائے سنتا رہا لیکن جب ڈاکٹر والکوف کے ساتھ گھر واپس ہوا تو خیال میں مستغرق خود ہی خود طنز سے کہنے لگا تکیہ سر کے نیچے رکھ دیا! یہ ادبی جوہر ہے! ایک ... تھا کہ کھوپڑے پر مارتی" باوجود ان اختلاف کے گورکی ٹالسٹائے سے بہت محبت کرتا تھا۔ کریمیا کے حالات میں لکھتا ہے۔

"ایک روز چہل قدمی کر رہا تھا کہ دیکھا ٹالسٹائے پتھروں میں گھسے بیٹھے ہیں . ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے ... جان پڑ گئی ہو . ایک پتھر پر کہنی ٹکی ہوئی ہے ٹھوڑی پر ہاتھ ہے ڈاڑھی کے سفید بالوں میں سے انگلیاں نکلی ہوئی ... اور سمندر کے پار نظر ڈال رہے ہیں . سمندر کی موجیں اس پہاڑ سے ٹکرا رہی ہیں . . . . ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک جادوگر سمندر کی موجوں کو حکم دے رہا ہے . . . . . اس سین نے میرے قلب پر عجیب اثر کیا . . . . . . اس وقت مجھے ایسا احساس ہوا کہ جس وقت تک یہ انسان روئے زمین پر موجود ہے میں یتیم و لیسر نہیں ہوں" جب ٹالسٹائے کی وفات کی خبر آئی تو گورکی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور اس وقت واقعی اس کو یہ احساس ہوا کہ وہ یتیم و لیسر ہو گیا ہے۔

گورکی اگرچہ ٹالسٹائے کے مذہبی تخیلات سے بیزار تھا لیکن اتنا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے گورکی لکھتے ہیں ... ٹالسٹائے نے اچانک مجھ سے دریافت کیا گورکی تم خدا کو کیوں نہیں مانتے ؛ میں نے عرض کیا لیو نیکولیوچ ... یقین پیدا نہیں ہوتا اس پر وہ فرمانے لگے یہ غلط ہے تم فطرتاً خدا میں یقین رکھتے ہو۔ خدا کو مانے بغیر چارہ نہیں تم ... ہی عرصے میں اس حقیقت کا احساس کر لوگے دنیا ویسی نہیں جیسا کہ تم اس کا ہونا چاہتے ہو تمہارا نہ ... یقین نہ رکھنا صرف ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے۔ کچھ لوگ صرف شرم کی وجہ سے خدا پر یقین نہیں رکھتے جیسے چند نوجوان ... کہ عورت ان کو پسند تو ہوتی ہے لیکن شرم یا کم ہمتی کی بنا پر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے یقین مثل محبت کے

حمایت چاہتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے کہے میں یقین کرتا ہوں تو سب کام درست ہو جائیں تم اپنی پیدائش سے خدا پر یقین رکھتے ہو اب یہ کہنا بیکار ہے کہ تم یقین نہیں رکھتے۔ تم کہتے ہو جمال!! اور جمال کیا شی ہے؟ یہ خدا کا بلند تر اور مکمل ترین ہے۔ کیونکہ ٹالسٹائے نے اس سے قبل کبھی مجھ سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی تھی اس لیے اس غیر متوقع گفتگو نے مجھے متحیر سا کر دیا اور میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر ٹالسٹائے نے ہنس کر انگلیاں میری طرف ہلاتے ہوئے کہا تم چپ رہ کر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہرگز نہیں چھڑا سکتے" اس بیان کے بعد گورکی لکھتے ہیں۔

"میں اگرچہ خدا پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت میں نے دل میں کہا کہ یہ انسان خدا سے قریب تر ہے"

ایک خط جس سے گورکی کی طبعی شرافت کا پتہ چلتا ہے حسب ذیل ہے جب گورکی کی تصانیف کی شہرت تمام دنیا میں پھیل چکی تھی اور وہ دنیائے ادب کا ایک درخشندہ ستارا مانا جا چکا تھا اس وقت اپنے دوست اور مربی کلی آزنی کو جس نے گورکی کو سوانح حیات لکھنے پر مجبور کیا تھا لکھتا ہے۔

میرے حبیب دوست اور استاذ!

آج ۴۳ سال گزر چکے ہیں جب مجھے پہلی مرتبہ آپ سے نیاز حاصل ہوا تھا جب آپ اور میں آخری مرتبہ ملے تھے اس کو بھی آج ۲۲ سال ہو چکے ہیں اس طویل عرصے میں مجھے سینکڑوں انسانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن میں امیر بھی تھے اور عالم بھی لیکن یقین کیجیے کہ ان میں سے کسی کی محبت نے اس جذبہ کو مدھم نہیں کیا جو آپ کے لیے میرے دل میں موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پہلے شخص تھے جس نے میری طرف خاص انسانی ہمدردی کی نظر ڈالی۔

آپ پہلے انسان تھے جس نے مجھ میں خود شعوری پیدا کی اور یہ آپ کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ ۳۰ برس سے میں روسی ادب کی خدمت کر رہا ہوں اس امر کے تحریر کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کرتا ہوں تاکہ دنیا پر روشن ہو جائے کہ انسان کی انسان سے ہمدردی کرنا کتنی عجیب شے ہے۔ میرے دیرینہ دوست۔ میرے حبیب استاد میں محبت اور تشکر سے اپنا ہاتھ آپ کے مصافحہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

الیکسی پیشوف (گورکی کا اصل نام)

ایم ایم جوہر میرٹھی

اخگر مرادآبادی (مرحوم)

پچھلی بقرعید کے کچھ دن پہلے ایک دوست کی زبانی یہ افسوسناک خبر ملی کہ حضرت اخگر مرادآبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ۱۲ر دسمبر کی صبح کو مرادآباد سے دہلی کا ارادہ کرکے گھر سے نکلے ابھی اسٹیشن تک نہیں پہنچے تھے کہ راستے میں طبیعت گھبرائی۔ وہیں سے لوٹے اور گھر جا کر لیٹ گئے پانچ بجے شام یکایک دل کی حرکت بند ہو گئی اور اس طرح اردو زبان کے ایک ایسے بلند پایہ شاعر کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جو اپنے حقیقی مرتبے کے مطابق مشہور نہ تھا تو گمنام بھی نہ تھا۔ انھوں نے کوئی جتر بہتر برس کی عمر پائی۔ آغاز شباب میں رامپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں نام پیدا کیا جہاں داغ و امیر غزلیں پڑھتے تھے۔ وسط عمر میں اپنی اصلاحی نظموں پر وقار الملک، محسن الملک، مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی سے داد پائی۔ شملے میں جب کبھی یہ بزرگ تشریف لاتے تو حضرت اخگر کی ان سے دوستانہ ملاقاتیں رہتیں۔ اور عموماً جن جلسوں میں ان کی تقریریں ہوتیں ان میں اخگر کی نظمیں بھی گرمئ محفل کا سامان بنتیں۔ آخری ایام میں رباعیات پر مولوی عبدالحق صاحب اور علامہ اقبال سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اگر ابتدائی دور کی بنا پر ان کے ذکر نے خمخانۂ جاوید مولفہ سری رام میں جگہ پائی تو اسی دور میں اُن کا کلام تعلیم، نگار، ادبی دنیا، طلوع اسلام، جامعہ اور معارف اکثر علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا لیکن اکثر اردو جاننے والوں کو یہ معلوم کرکے تعجب ہو گا کہ جہاں ہمارے اردو زبان کے رسالے حضرت اخگر کی محض غزلیں اور رباعیاں چھاپنے پر اکتفا کرتے رہے وہاں ہندی کے بعض رسالوں نے اُن کے کلام کے انتخاب کے ساتھ ان کی تصویریں اور سوانح حیات بھی شائع کیے۔ ان کی رباعیاں عام طور پر ایسی سیدھی سادی اردو میں ہوا کرتی تھیں جن کو ہندی رسم الخط میں لکھ دینا ہی انھیں ہندی بنانے کے لیے کافی تھا۔

آخر عمر میں وہ اگرچہ مشاعروں کے قائل نہیں رہے تھے اور اکثر ان کے ہنگاموں پر مخصوص محفلوں کو ترجیح دیتے تھے پھر بھی وہ لوگ جو ان کی نرم طبیعت سے واقف تھے انھیں مشاعروں میں شرکت

پر مجبور کر ہی لیتے تھے چنانچہ شملہ اور دہلی کے اکثر چھوٹے بڑے مشاعروں میں شامل ہوتے رہے ۱۹۳۵ء میں حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ پر پانی پت میں جو مشاعرہ ہوا اُس میں مولانا حسرت موہانی کے اشارے پر کرسی صدارت حضرت یگانہ چنگیزی کے حوالے کی گئی۔

ان کی شاعری کے نمونے پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر اُن کی زندگی کے حالات بیان کر دیے جائیں اور خاص طور پر ان کی شخصیت، طبیعت اور خیالات کو نمایاں کر دیا جائے تاکہ اُن کی شاعری کا پس منظر مکمل ہو جائے۔

ان کا نام امداد حسین تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء کے قریب بمقام مرادآباد پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بہت بے قاعدہ ہوئی البتہ جب ہوش سنبھالا تو کانپور جا کر مشن اسکول میں کچھ عرصہ پڑھتے رہے۔ بیس برس کی عمر میں اِدھر اُدھر روزگار کی تلاش میں پھرتے پھراتے شملہ پہنچے۔ کچھ عرصہ تصویروں کی ایک انگریزی دوکان میں ملازم رہے۔ بعد ازاں گورنمنٹ آف انڈیا پریس میں جگہ مل گئی جہاں کافی ترقی حاصل کی لیکن بیس برس کی ملازمت کے بعد یکایک اس سے دل برداشتہ ہو گئے اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ بڑھانے اور لاطینی زبان سیکھنے کے شوق میں اسے خیرباد کہہ دیا۔ اس کے بعد کسب معاش کے لیے انگریزوں کو اُردو پڑھانے کا مشغلہ شروع کر دیا جو آخر عمر تک جاری رہا۔ درمیان میں کچھ عرصہ سینٹ بیڈس کالج شملہ میں بھی اردو زبان کے استاد رہے جہاں زیادہ تر یورپین راہبات کو پڑھانے کا کام ہوتا تھا بہرحال سرکاری ملازمت کے بعد کسب معاش کا کوئی قابل اطمینان سلسلہ نہ رہ سکا جس کی سب سے بڑی وجہ ان کی غیر مستقل مزاجی تھی۔ اچھا خاصا کام ہو رہا ہوتا۔ یکایک طبیعت اُچاٹ ہو جاتی اور چھوڑ کر چل دیتے بڑے بڑے انگریز شاگرد انھیں چھوڑنا نہ چاہتے تھے مگر ان کی آزاد طبیعت سے واقف ہونے کے باعث انھیں مجبور نہ کر سکتے۔

آزادیٔ طبیعت کا یہ عالم تھا کہ چند برس ہوئے حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی اور امجد حیدرآبادی سے ملنا جلنا ہوا آخرکار انھیں مہاراجہ سرکشن پرشاد کے دربار تک پہنچا دیا گیا جہاں

ان کی بے حد پذیرائی ہوئی اور مہاراجہ صاحب بہادر کو ہم خیال اور ہم مذاق ہونے کے باعث ان سے دلی تعلق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے اثر صاحب کے لیے غالباً حضور نظام کے ہاں سے کچھ وظیفہ کا انتظام کرادیا اور انھیں خوش خبری دیدی تاکہ معاش کی طرف سے مطمئن ہو کر وہیں مقیم ہو جائیں لیکن وہ کچھ تو اس خیال سے کہ وظیفہ حاصل کرنے کی دفتری کارروائی کے جھنجھٹ میں کون پڑے اور کچھ اس ڈر سے کہ کہیں آزادی پابندی سے نہ بدل جائے چپکے سے حیدرآباد چھوڑ کر وطن واپس آگئے اور پھر کبھی کچھ کا رُخ نہ کیا۔ [illegible]

کوئی ان گیارہ برس ہوئے کہ حضرت اثر کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ میرے مرحوم دوست محمد احمد ندوی ان کا اکثر ذکر کرتے اور اشعار سناتے رہتے جس سے میرے دل میں ان کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ شملہ آئے۔ سینٹ ٹامس کے گرجا گھر سے ملحقہ ایک کوٹھری میں مقیم تھے۔ مجھے اطلاع ملی اور ایک شام میں محمد احمد کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پڑی ہے ایک چھوٹی سی تپائی پر ایک دھندلا سا لمپ جل رہا ہے۔ انگریزی کے کسی شاعر (غالباً ٹینی سن) کے کلام کا مجموعہ پاس رکھا ہے۔ موٹے کپڑے کا ایک کوٹ دیوار پر لٹک رہا ہے اور معمولی سی چارپائی پر فقیرانہ بستر بچھائے کمبل اوڑھے منحنی اور مختصر سے جسم کے ایک بزرگ بیٹھے ہیں چھوٹی سی سفید ڈاڑھی، اونچی مفکرانہ پیشانی، گہری آنکھیں اور جھرّیوں سے بھرا ہوا دبلا سا چہرا ہے۔ رات کے وقت، لمپ کی دھندلی روشنی ان کی فقیرانہ ہیئت اور بے سروسامانی کے ماحول نے میری آنکھوں کے سامنے اُنھی کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دی ؎

سمجھو پہلے ہی سے دنیا کو مسافر خانہ　　جیو اس طرح کہ مرنا تمھیں دشوار نہ ہو

بعد میں جب اُن سے تعلقات بڑھے اور ان کی زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو یہی شعر اُن کی تمام زندگی کا مرقع ثابت ہوا۔ مصیبت بھری تلخ زندگی۔ حد سے زیادہ حساس دل اور غیر معمولی مفکرانہ دماغ نے انھیں غم کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ یاس اور بیدلی کا عنصر ان کے کلام میں غالب ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

کب کبھی تبسم کے ہے موتی شبنم | منھ آنسوؤں سے اپنا ہے دھوتی شبنم
تی جو خوشی باغ جہاں میں آخر | پھولوں سے گلے مل کے نہ روتی شبنم

لیکن پھر بھی مصائب سے گھبراتے نہیں اور دل کی تسلی کا پہلو اس طرح پیدا کرتے ہیں ؎

مصیبتوں میں نہ ہوتیں جو راحتیں پنہاں ۔ خدا نہ بھیجتا یہ تحفے انبیا کے لیے

حضرت آنگر کی حد سے زیادہ حساس طبیعت کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ ان کی ہمدردی بنی نوع انسان سے گزر کر جانوروں تک پہنچی ہوئی تھی کسی نے بیل کو چھڑی ماردی اور وہ بے قرار ہوگئے۔ تانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے بلکہ گھوڑے کا تانگے میں جتا ہوا ہونا ہی ان کے دل کو رنج پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ چنانچہ اس احساس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تانگے کی سواری سے ہمیشہ اجتناب کرتے۔ اور صرف اسی وقت بادلِ ناخواستہ مجبور ہو جاتے جب انکار سے کسی دوست کو ناراض کرنے کا احتمال ہوتا۔ جانوروں سے اس غیر معمولی ہمدردی نے ان سے بہت سی رباعیاں اور اشعار بھی کہلوائے۔

ان کی طبیعت کی نرمی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی جسے قوتِ ارادی کی انتہائی کمزوری کہا جا سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اکثر معاملات میں اُن کی قوتِ فیصلہ بالکل گم ہو جاتی۔ ایک رباعی میں اپنی اس حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

طوفانِ مصائب کا جھکولا ہوں میں | صحرائے تلوّن کا بگولا ہوں میں
جھونکوں میں حوادث کے اُڑا پھرتا ہوں | سوکھا ہوا اک گھاس کا تنکا ہوں میں

دنیائے عمل میں ایسی طبیعت یقیناً ایک کمزوری قرار دی جائے گی لیکن اسی حساس طبیعت نے انھیں ہمہ تن دل بنا دیا تھا۔ "ہمہ تن دل ہونا" شاعرانہ الفاظ کی دنیا میں تو ایک معمولی سی بات ہے لیکن واقعات کی دنیا میں ایک نہایت کمیاب چیز کم از کم میرے محدود تجربے میں تو اس کیفیت کا مجسم نمونہ حضرت آنگر کے سوا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ واقعی وہ اپنی اس رباعی کے پورے پورے مصداق تھے ؎

اچھا ہے کسی علم میں قابل ہونا | اچھا ہے کسی فن میں بھی کامل ہونا
اچھے ہیں دلائل بھی دماغی لیکن | ان سب سے ہے اچھا ہمہ تن دل ہونا

مذہب کے متعلق اُن کے خیالات بظاہر وہ تھے جنہیں آج کل کا نا تی" کہہ دیا جاتا ہے۔ تصوف کے اثرات نے انہیں بالکل صلح کل بنا رکھا تھا فلسفہ نے اُن میں جانچ پڑتال کی صلاحیت پیدا کر دی تھی عیسائی مشنریوں کے ساتھ ایک عمر تک سابقہ رہنے کے باعث ان کے خیالات سے بھی بیگانہ نہ تھے ہندو اربابِ فکر سے بھی ربط رہا تھا۔ تھیاسوفی کی طرف بھی مائل تھے اور اس کی مجلسوں میں اکثر شریک ہوتے تھے موسیقی سے بہت لگاؤ تھا اور جس طرح قوالی کا شوق تھا اسی طرح گرجا گھر کی ارغنونی ... جاتوں کو بھی پسند کرتے تھے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسلامی عقاید پر نہایت پختگی سے قائم تھے۔ یہ پختگی نسلی یا رسمی اثرات سے متاثر نہیں بلکہ گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔

... کے بہترین مشاغل سیر اور مطالعہ تھے۔ مطالعۂ کتب بھی اور مطالعۂ فطرت بھی بس کوئی کتاب جیب میں ڈال لیتے اور آبادی سے دور نکل جاتے جنگل، سبزہ زار، باغ اور کھنڈر انہیں بہت مرغوب تھے ... انڈین کے میدان اور دہلی میں کوٹلہ فیروز شاہ، قدسیہ باغ اور روشنی پارک میں زیادہ وقت ... وقت میں پڑھتے رہتے یا چلتے رہتے دن بھر میں بیسیوں میل چل لیا کرتے تھے غالباً ... کو ... وفت تک تندرست رکھا۔ دہلی میں آخری بار ۱۹۴۰ء کے شروع میں آئے ... کے باعث انہیں راہ چلنے میں دقت محسوس ہونے لگی۔ ایک دفعہ تو تانگے سے گر ... اور چوٹ کھائی، کچھ دن بستر پر پڑے رہنا پڑا اور جب پھر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے تو مراد آباد ... بینائی کے کمزور ہو جانے پر سخت مایوس تھے کہ اس سے ان کے دونوں محبوب مشغلے یعنی ... چھوٹ جاتے تھے۔

... شاعری کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کے ارتقا کو اردو شاعری کی عمومی تاریخ ... ستر برس کی عمر پائی اور اس میں وہ شاعری کے مختلف دوروں سے گزرے ... تھا۔ اس طبیعت ہر زمانے کا اچھا اثر قبول کرتی رہی لیکن آخر کار ایک خاص ... شاعری کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب داغ اور امیر کا تغزل زوروں پر تھا انہوں بھی اسی میدان میں جولانی طبع دکھانے لگے شیخ مصحفی کے سلسلۂ تلمذ میں نواب شبیر علی خاں تنہا کی

شاگردی اختیار کی اور مشاعروں میں اساتذہ کی غزلوں پر معرکے کی غزلیں لکھ کر خوب چمکے۔ اس دور کے کلام کا نمونہ یہ ہے جو کبھی کبھی یوں ہی تفریحاً عہدِ جاہلیت کا کلام کہہ کر سنایا کرتے تھے ؎

تڑپتا ہے دل ہو کے مضطر ہمارا نہیں جب سے پہلو میں دلبر ہمارا
ستم کے مزے دل اٹھائیگا کیا کیا سلامت رہے یہ ستمگر ہمارا
تڑپتے ہیں بسمل تو کہتا ہے قاتل تماشے دکھاتا ہے خنجر ہمارا
بھیجیں گے نامہ کہ اس رشکِ گل کا نہ بن جائے بلبل کبوتر ہمارا
عدو جلتے ہیں جب وہ کہتے ہیں ہنس کر ہمیں سب سے پیارا ہے اکبر ہمارا

اسی رنگ کی ایک اور غزل ہے ؎

بلاکش ہوں میرا گزارا نہ ہوتا جو اُن کے ستم کا سہارا نہ ہوتا
لگا لیتے خنجر ہی کو ہم گلے سے جو قاتل پہ قابو ہمارا نہ ہوتا
جو چشمِ حقیقت خدا ہم کو دیتا تو پھر یہ ہمارا تمھارا نہ ہوتا
جلاتے نہ غیروں کو تعریف کر کے جو اکبر انھیں دل سے پیارا نہ ہوتا

ان دونوں غزلوں سے ظاہر ہے کہ داغ کی بہ نسبت امیر مینائی کا اثر زیادہ غالب تھا ایک اور غزل کے تین شعر ہیں ؎

دیکھنے والے ان کی صورت کے آئینے بن گئے ہیں حیرت کے
دیکھو ہنس ہنس کے فاتحہ نہ پڑھو لوٹے جاتے ہیں پھول تربت کے
حال دل آج اُن سے کہہ ہی دیا اے میں قربان اپنی ہمت کے

ان میں سے آخری شعر قابلِ توجہ ہے۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ فرمایا ہے ؎

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

یہی مضمون کو اکبر الہ آبادی نے اپنے رنگ میں یوں ادا کیا ہے ؎

غزل میں حالِ دل کو نظم کر سکتا ہوں اے اکبر مگر اُن سے کہوں اتنی دلیری ہو نہیں سکتی

[illegible] اصغرؔ کا یہ شعر دوبارہ پڑھیے۔ دوسرے مصرع کے زبانِ انداز بیان کے باوجود مضمون میں کس قدر [illegible] ثبوت دیا ہے

حال دل آج ان سے کہہ ہی دیا [illegible] قربان اپنی ہمت کے

اسی دور کا ایک یہ شعر بھی ہے

اللہ رے [illegible]

مگر اس زمانے کے شوخ رنگ کا اچھا نمونہ اس شعر میں ملتا ہے

اصغرؔ کو کئی روز سے دیکھا نہیں شاید کمبخت کہیں ڈوب مرا چاہِ ذقن میں

اس ابتدائی دور میں ایک دیوان بھی "نشاطِ اصغرؔ" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ داغؔ نے اس کو بہت پسند کیا اور شائع کرنے پر زور دیا۔ غالباً یہ شائع بھی ہوا لیکن بعد میں جب حضرت اصغرؔ کی طبیعت شاعری کے اس رنگ سے برگشتہ ہو گئی تو اس دیوان کو بھی تلف کر دیا۔

رامپور اور لکھنؤ کے اس دور کے بعد شملہ میں بھی اسی رنگ کا ایک دور رہا۔ اصغرؔ اس زمانے میں وہاں سب سے بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ شاگردوں کی خاصی تعداد ہو گئی تھی۔ بڑے معرکے کے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ طوائفیں بھی ان میں اس غرض سے شریک ہوتیں کہ گانے کے لیے حضرت اصغرؔ کی تازہ ترین غزلیں میسر آسکیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوا۔ ان کی طبیعت اس قسم کی رسمی اور رجعتی شاعری سے بالکل متنفر ہو گئی۔ اب انھوں نے قومی اصلاح کے مقصد سے نظمیں لکھنا شروع کیا یہی زمانہ تھا جب شبلیؔ و حالیؔ سے ہم خیالی ہوئی۔ ان کی صحبت میں اصلاحی شاعری کا شوق ترقی پکڑتا گیا۔ اس دور میں اردو زبان، تعلیم، محنت اور اسی قسم کے دیگر موضوعوں پر لمبی لمبی نظمیں لکھیں ان میں سے جس ایک آدھ نظم کے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا اس سے یہی اندازہ ہوا کہ اس دور کی نظموں میں خلوص اور سادگی تو زیادہ ہوئی مگر رنگینی اور شعریت کم۔

[illegible] یہ دور بھی گزر گیا اور ایک ایسا رنگ پختہ ہونے لگا جو آخر دم تک قایم رہا۔ اس رنگ میں رنگینی تو نظر نہیں آتی لیکن گہرے احساس اور بلند فکر کے امتزاج نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی جو

شوریت سے جاری نہیں کی جا سکتی۔ اس پر طرہ یہ کہ بلند مضامین اور گہرے خیالات کو ایسے سیدھے سادے لفظوں میں ادا کر دیتے کہ سننے والوں کے دل و دماغ یکساں متاثر ہوتے۔ ان کی ابتدائی تربیت صوفیانہ حلقوں میں ہوئی۔ جو دان کے استاد حضرت تنہا ایک پاکباز صوفی منش بزرگ تھے۔ اس صوفیانہ تربیت، شاعرانہ طبیعت اور فلسفیانہ دماغ نے مل کر حضرت آنگر کی شاعری میں ایک انفرادی خصوصیت پیدا کر دی تھی جو ان کے آخری عمر کے کلام میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ اس دور میں حضرت آنگر کا نظریۂ شاعری اُن کی اس رباعی سے ظاہر ہے جس میں شاعروں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

اوباش جوانوں کو بنانا چھوڑ دو　　　شربت کے عوض زہر پلانا چھوڑ دو

اے شاعرو! نبیوں کے ہو تم نائب　　　اللہ سے بندوں کا چھڑانا چھوڑ دو

اس دور میں انھوں نے چند نظمیں بھی کہیں اور کچھ غزلیں بھی لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی رباعیاں ہیں جن کا ایک مختصر سا مجموعہ ۱۹۳۲ء میں محمد احمد ندوی مرحوم نے مرتب کیا اور جو جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شایع ہو گیا تھا ان رباعیات کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے بہت اچھی رائے ظاہر کی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت علامہ اقبال نے ان رباعیات کی تعریف فرمائی۔ ایک دفعہ تو ایک مجلس میں اپنی بات کی تائید میں حضرت آنگر کی ایک رباعی پڑھ دی جس سے ظاہر ہوا کہ وہ رباعی پسند آ جانے کے باعث ان کے ذہن میں محفوظ رہ گئی تھی اگست ۱۹۳۵ء کے نیرنگ خیال میں آنگر کی شاعری پر حضرت جگر مرادآبادی کا ایک مختصر مگر جامع مضمون نکلا جس کے یہ ٹکڑے خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔

"حیرت ہوتی ہے کہ اس سن و سال کے باوجود آپ کے کلام میں دورِ حاضرہ کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں　　　یہی نہیں کہ موجودہ زمانے کے شعرا کی طرح (جن میں اساتذۂ شعرا کی اکثریت شامل ہے) صرف شعر موزوں کر لیتے ہیں، متواتر اور مسلسل مشق کی وجہ سے الفاظ پر ایک طرح کی قدرت حاصل ہو گئی ہے یا صرف کتابوں میں بکھرے ہوئے چند اصولی مسائل کو پیش کر دیتے ہیں اور ان کی جزئیات و تفصیلات سے بے خبر بلکہ جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے اور میں اسے کامل یقین و اعتماد کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جناب موصوف ایک

زبردست مفکر اور ایک کامیاب متجسس انسانیت اور قدیم و جدید نظریات اور ان کی نفسیات پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ آپ کی زندگی (جس حد تک میں نے محسوس کیا ہے) اعلیٰ ترین صفات انسانیہ سے متصف ہے جس کے مختصر معنی یہ ہیں کہ آپ کی زندگی آپ کا کلام ہے اور آپ کا کلام آپ کی زندگی . . . . حضرت اصغر جیسی منچلی ہستی نے اس رنگ کو کچھ گوارا نہ کیا جسے عام اصطلاح میں تقلید محض کہا جاتا ہے یہی سبب ہے کہ آپ کے کلام میں کامل انفرادیت پائی جاتی ہے اور آپ کا رنگِ کلام سب سے جدا . . . .

اس آخری دور میں حضرت اخگر نے جو نظمیں لکھیں اُن میں سے غالباً بہترین وہ تھی جو "فضائے بسیط" کے عنوان سے نگار میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں شاعر نے زمین سے آسمان کی فضاؤں میں اڑ کر کائنات کی وسعت کے متعلق اپنے تاثرات کا نقشہ کھینچا ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ نظم علامہ اقبال کے جاوید نامہ کا پیش خیمہ تھی۔

اس دور میں جو غزلیں کہیں اُن کے عمومی رنگ کا اندازہ ان چند اشعار سے لگایا جا سکتا ہے

تو برائی سے بُرِ دل سے تری تکرار نہ ہو ۔۔ جیسے بیماری کو بیمار سے بیزار نہ ہو
یوں کو جینا ہو جیسے وعدۂ فردا پہ ترے ۔۔ میں تو مر جاؤں جو دم بھر ترا دیدار نہ ہو
پہلے ہی سے دنیا کو مسافر خانہ ۔۔ جیو اس طرح کہ مرنا تمھیں دشوار نہ ہو
اللہ اللہ رے اخگر یہ نظام ہستی ۔۔ ایک سیارہ بھی اس پار سے اس پار نہ ہو

ایک اور غزل کے چند اشعار جو انھوں نے بزم اردو شملہ کے ۱۹۳۴ء والے مشاعرے میں پڑھی تھی

سامنے جب آپ کے آتا ہوں میں ۔۔ آپ رہ جاتے ہیں مٹ جاتا ہوں میں
تم ہی تم ہو مجھ میں خود میرا ہے کیا ۔۔ نام ہی کو میں تو کہلاتا ہوں میں
آپ کو اپنا بنانے کے لیے ۔۔ اپنے دشمن کو بھی اپناتا ہوں میں
[illegible] ہاتھ میں ۔۔ لیجے دیوانہ بنا جاتا ہوں میں
تیرے اخگر کے دل بیتاب میں ۔۔ بجلیاں ہی بجلیاں پاتا ہوں میں

یہ تین شعر اس غزل کے ہیں جو جنوری ۱۹۳۵ء کے جامعہ میں شائع ہوئی ہے ؎

طلسمِ زیست اک عبرت کدہ ہے ۔۔۔ نہ دل ہے اور نہ میں ہوں اور نہ تو ہے
اگر ہو تم ہی تم ہر ایک دل میں ۔۔۔ تو پھر کوئی کسی کا کیوں عدو ہے
خدا سے لوٹ کر پایاں نہ [illegible]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اُن کا بہترین کلام رباعیات کی صورت میں ہے ان رباعیوں میں مذہب تصوف۔ اخلاق۔ مناظرِ فطرت۔ نفسیاتِ انسانی وغیرہ سے متعلق ہر قسم کے مضمون ادا کیے ہیں بعض رباعیوں میں نئے نئے مضمون پیدا کیے ہیں اور بعض میں پرانے مضمونوں کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر دورِ حاضر کے رباعی کہنے والے شاعروں پر نگاہ ڈالی جائے تو شاید امجد حیدرآبادی کے سوا اور کوئی شاعر اس میدان میں حضرت اخگر کا ہم پلّہ نظر نہ آئے۔ اب اُن کی چند رباعیاں سنیے۔

ایک رباعی میں علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کو کس سادہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں ؎

پردہ مرے عارض سے اٹھائے کوئی ۔۔۔ مجھ کو مرا دیوانہ بنادے کوئی
بچھڑا ہوا ہوں آپ سے میں ہی اخگر ۔۔۔ اے کاش مجھے مجھ سے ملادے کوئی

کثرت میں وحدت کے فلسفے کو اس عام فہم طریقے میں بیان فرماتے ہیں ؎

سو رنگ کے ہیں پھول چمن ایک ہی ہے ۔۔۔ سو طرح کے اشجار ہیں بن ایک ہی ہے
کثرت میں چھپی رہتی ہے وحدت اخگر ۔۔۔ اعضا تو بہت سے ہیں بدن ایک ہی ہے

مقصودِ عبادت کے عام مضمون کو کس شوخی کے ساتھ لکھتے ہیں ؎

مزدور نہ سمجھا کریں سرکار مجھے ۔۔۔ کیجے نہ عبادت ہی سے بیزار مجھے
کام آئے گا فردوس کسی زاہد کے ۔۔۔ دیدار دکھا دیجیے دیدار مجھے

اسی جنت اور دیدار کے مضمون کو ایک اور رباعی میں بھی کھپایا ہے۔ بنی نوعِ انسان [illegible] رکھنے والے شخص کے حق میں کیسی نازک اور بلیغ بد دعا کی ہے ؎

[illegible] دکھ درد میں اور دل کا جو غمخوار نہ ہو ۔۔۔ بے یار و مددگار کا جو یار نہ ہو

جنت تو ملے اس کو گھرائے آخگر — جنت میں ...

... رباعی میں اپنے آپ کو مسخیٰ خیز انداز میں آبی گراؤ کی گالی دیتے ہیں ؎

نادار ہو جائیں تو پریشان ہو تو — انساں نظر آتا ہوا حیران ...
تو مل نہ سکے حسن کے تو کہہ دوں آخگر ...

... کے متعلق اُن کی یہ رباعی بہت مقبول ہو چکی ہے ؎

جب سامنے تیرے کوئی بر ہو گئے — تجھ میں نہ ذرا فرق سر مو آئے
آخگر سے سیکھو دیکھو خوش خلقی سیکھ — جو تجھ کو جلائے اُسے خوشبو آئے

... کے لیے ایک نئی ایجاد کی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں ؎

اعمال کی تاثیر دکھائے کوئی — آیندہ دائمی کو لادے کوئی
... نار میں انجام دکھانے والی — عینک سی آنکھوں پہ لگادے کوئی

... کے متعلق انھوں نے ایک نیا مضمون پیدا کیا ہے ؎

... کی تماشا گاہ میں آیا ہوں میں — جلتا ہوا ڈھلتا ہوا سایہ ہوں میں
... میں کیا جی لگے اپنا آخگر — ساتھ اپنے ٹکٹ واپسی لایا ہوں میں

جہاں ان کی رباعیوں میں مصیبت، غم اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین پائے جاتے ہیں وہاں انھوں نے ... کے پہلو بھی نظر انداز نہیں کئے ہیں۔ مثلاً دو رباعیاں ملاحظہ ہوں

آرام کی خواہش ہے تو محنت بھی کرو — سرگرمِ صنعت و حرفت بھی کرو
لو کام عناصر سے جنابِ آخگر — انساں ہو تو فطرت پہ حکومت بھی کرو

بے کش مکش زیست ... اچھا — گر ... ہوتے تو ... اچھا
ہر قطرے جو مفت میں مل جائے کہیں — محنت سے جو بہتا ہو پسینا اچھا

باوجودیکہ ان کی رحمدلی اور ہمدردی حیوانوں تک کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے وہ جنگ کی ضرورت کو بھی

محسوس کرتے ہیں اور صلح و جنگ دونوں کو جلوۂ دوست سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جلوہ ترا سر روپ میں ہر رنگ میں ہے
شیشے میں جھلک ہے تری تو سنگ میں ہے
آخر کیسے اچھا کہے اور کس کو برا
اک شان تری صلح میں اک جنگ میں ہے

مگر دنیا میں قیام امن کی کوشش کے لیے مادی تشدد سے زیادہ روحانی و اخلاقی انقلاب کی اہمیت پر زور دیتے ہیں یعنی زور دلبری کو زور قاہری سے بہتر جانتے ہیں۔ چنانچہ جب موجودہ جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے یہ رباعی لکھ بھیجی تھی ؎

خود بینی کی گردن کو مروڑا نہ گیا
سر نخوت اقوام کا پھوڑا نہ گیا
نسلوں کے تکبر نے قیامت کر دی
چھینا گیا تلوار کو توڑا نہ گیا

ویسے اس بارے میں تلوار کے بیکار ہونے پر اُن کا ایک پُرانا شعر بھی ہے ؎

قبر کے کیڑوں نے چنگیز و ہلاکو سے کہا
ہم کو بھی جوہر دکھائے ہوتے کچھ شمشیر کے

سائنس اور مذہب کا مقابلہ ان کی شاعری کا ایک دلچسپ موضوع رہا ہے اس سلسلہ میں ان کی رباعی ایک انوکھے انداز میں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہے ؎

کہتے ہیں کہ عادات بدل جائیں گی
آفاتِ عبادات بھی ٹل جائیں گی
مذہب کو مٹا ڈالیں گے سائنس پرست
چمگادڑیں سورج کو نگل جائیں گی

اردو ہندی کی بحث میں وہ ہندی زبان کی شیرینی کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اردو کو اس کی ترقی یافتہ صورت سمجھتے ہیں اس پر ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

سچ ہے کہ ہے اردو کی سہیلی ہندی
ساتھ اس کے ہمیشہ سے ہے کھیلی ہندی
کس طرح نہ ہو اس سے زیادہ میٹھی
اُردو ہے شکر گڑ کی ہے بھیلی ہندی

خاص طور پر پنجاب کی خدمت اُردو کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں یہ رباعی اُنھوں نے حالیؔ کی صد سالہ برسی پر پڑھی تھی ؎

اردو نے کہا [illegible] حالیؔ [illegible] پنجاب نے کہا پھولوں کی ڈالی ہوں میں

پنجاب ہنسا اور کھاسن خستگر: حق یہ ہے کہ اس باغ کا مالی ہوں میں

فلسفیانہ طبیعت کے باعث ہمیشہ غور و فکر میں لگے رہتے تھے اور ہر مسئلے پر ایک خاص جچی تلی محققانہ
نظر رکھتے تھے۔ زندگی کے پیچیدہ معموں کے متعلق اُن کی یہ رباعی محض رسمی اظہار خیال نہیں بلکہ حال ہے

ہر شے ترے کوچے کی طلسماتی ہے مٹی ہو سنا دیتی ہو مست جاتی ہے
جس گتھی کو سلجھاتا ہوں اتنا ہی مجھے اور یہ اُلجھاتی ہے

چونکہ ان کی شاعری میں بلند مفکرانہ پہلو زیادہ ہے۔ اس لیے اکثر اوقات رومی، عرفی، غالب اکبر
اور اقبال کے اشعار سے توارد ہو جاتا جب کبھی وہ تازہ شعر سناتے اور میں کہہ دیتا کہ یہ تو فلاں مضمون کا سرقہ
ہو تو بہت حیران ہوتے اور یقین دلاتے کہ یہ شعر پہلے کبھی نظر سے نہیں گزرا تھا میں کہتا کہ آپ مجھے یقین
دلا دیجیے لیکن دنیا کو کس طرح قائل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک دن کوئی تقریب تھی۔ شہر کے ہنگامے میں اپنے
آپ کو سب سے الگ پا کر یہ شعر کہا ؎

میں ہوں اک موج تنہا گود میں رہ کر بھی دریا کی اکیلا پھر رہا ہوں اس بھری محفل میں دنیا کی

جب مجھے سنایا تو میں نے کہا کہ اس مضمون کو تو اقبال نے ایک مصرع میں ادا کر دیا ہے ؏

درمیان انجمن تنہاستم

اسی طرح ایک دن جب یہ رباعی سنائی ؎

دنیا نے مجھے چھوڑ دیا خوب کیا رُخ تیری طرف موڑ دیا خوب کیا
میں دوڑا تھا سایے کو پکڑنے کیلیے پیروں کو مرے توڑ دیا خوب کیا

میں نے رومی کے یہ اشعار پڑھ دیے ؎

مرغ بر بالا پراں و سایہ اش می رود بر خاک پرّاں مرغ وش
ابلہے صیادِ آں سایہ شود می دود چندانکہ بے مایہ شود

اس قسم کی نکتہ چینی پر آخر وہ یہ کہنے لگ گئے تھے کہ ان بڑے بڑے شاعروں سے پہلو بچا کر شعر کہنا مشکل ہے
دنیا کچھ کہتی رہے اس کی پرواہ نہیں۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے کہ توارد کا اتفاق ان بڑے بڑے

شاعروں ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان کی شاعری کا بیان نامکمل رہے گا اگر اس سلسلے میں ان کی انگریزی شاعری کا ذکر نہ کیا جائے۔ ان کی صورت وہیئت کو دیکھ کر تو کسی کو یہ اندازہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ انگریزی زبان بھی جانتے ہیں۔ انگریزی کی رسمی تعلیم بھی انھوں نے بالکل نہ پائی تھی لیکن محض ذاتی شوق اور فطری ذہانت سے انھوں نے اتنی قابلیت بہم پہنچائی تھی کہ انگریزی میں اشعار بے تکلف کہہ سکتے تھے۔ اگرچہ ان کی انگریزی شاعری کا ذخیرہ محض چند نظموں پر مشتمل ہے لیکن ان کے بلند پایہ ہونے کا اعتراف خود انگریز ادیبوں کی طرف سے ہو چکا ہے۔ ان کی نظمیں ہندوستان میں اور کچھ انگلستان کے رسائل میں نکلتی رہیں۔ ان میں سے کچھ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظمیں میری نظر سے گزریں ان کے عنوان یہ ہیں: تاج محل۔ بادل۔ سورج۔ لودھی کا مقبرہ۔ اقبال۔ ایک عجیب بات یہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی تاج محل دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اشعار خود بخود انگریزی زبان میں موزوں ہونے لگ جاتے ہیں اور اس وقت کوشش کے باوجود بھی اردو میں شعر نہیں کہے جا سکتے۔ اس کیفیت پر انھیں خود بڑا تعجب تھا کیونکہ اس کی کوئی معقول توجیہ ممکن نہیں۔ ویسے عام طور پر وہ بعض اوقات انگریزی شاعری کی طرف اس لیے بھی متوجہ ہو جایا کرتے تھے کہ اردو کی بہ نسبت اس کی قدر دانی زیادہ ہوتی تھی۔ دو تین برس کی بات ہے انھوں نے یہ رباعی لکھی تھی ؎

اردو مجھے ٹھکراتی ہے ٹھکرانے دو — خدمت کو مری خاک میں مل جانے دو
انگلش تو تکبر نہیں کرتی مجھ سے — جی اس کی گلی میں مجھے بہلانے دو

پچھلے دو برس سے وہ اپنے وطن میں عزلت گزیں ہو گئے تھے۔ بینائی کمزور ہوتی جاتی تھی چلنا پھرنا کم ہو گیا تھا اور دنیا سے چل دینا قریب تر نظر آنے لگا تھا چنانچہ پچھلے سال خط میں یہ رباعی لکھ بھیجی ؎

دن رات کی دنیا میں دو رنگی دیکھو — کنعاں کا حسین حبش کا زنگی دیکھو
وسعت یہ خدائی کی ذرا غور کرو — اور اس پہ مری قبر کی تنگی دیکھو

اور اب اطلاع آئی ہے کہ انتقال کے روز آخری شعر یہ موزوں ہوا تھا ؎

جو کچھ کرنا ہے کر اے دل مگر اتنا سمجھ لینا — فرشتے جھانکتے ہیں عالم بالا کی محفل سے

آن کی وفات اُن کے احباب و اقربا کے لیے بالخصوص اور دنیائے ادب کے لیے بالعموم کتنی ہی [illegible] خود ان کے لیے اس میں ایک خوشگوار پہلو بھی موجود تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اپنی [illegible] معیبت بھری زندگی سے چھٹکارا مل گیا بلکہ اس لیے کہ وہ ایک طالب معرفت کی حیثیت سے اس انتظار میں تھے کہ کب یہ پردہ اُٹھے اور معلوم ہو جائے کہ موت کے بعد کی زندگی کیسی ہے۔ آخر انھیں اس تجربے کا موقع مل گیا اور وہ اپنی منزل مقصود تک جا پہنچے ؎

پہنچ جائیں گے اک دن منزل مقصود تک آخر … کہ چلتے ہی رہیں گے عمر بھر آہستہ آہستہ

میں نے ان کی سیرت اور شاعری کے بہت سے دلچسپ پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے بھی آخر انھیں کے الفاظ میں اعتراف کرنا پڑتا ہے ؎

میں کھنچ گیا پر مری حقیقت نہ کھنچی
صورت تو مری کھنچ گئی سیرت نہ کھنچی
کوشش تو مصور نے بہت کی لیکن
گل کھنچ گیا تصویر میں نکہت نہ کھنچی

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

اسد ملتانی

بچوں کے لیے فلمیں

بہت ہی کم ایسے بچے ہوں گے جنھیں سینما دیکھنے کا شوق مطلق نہ ہو، ورنہ کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ تو وہ کسی نہ کسی طرح سینما ہال کے گھپ اندھیرے میں پہنچ کر اپنے محبوب شوق کی تکمیل کا موقع نکال ہی لیتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سینما بینی کا اثر جتنا اور جس طرح والدین پر ہوتا ہے اتنا ہی اور اسی طرح ان کے بچوں پر بھی ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل میں دلچسپی لینے والے حضرات نے بچوں کو سینما بینی کے مہلک اثرات سے بچانے کے لیے اگر کبھی کچھ کیا بھی ہے تو وہ اتنا ہی کہ بچوں کو خطرناک اور مخرب اخلاق فلموں کے دیکھنے سے باز رکھا جائے۔ انھوں نے ہمت کر کے کبھی اتنا بھی آگے قدم نہیں بڑھایا کہ وہ بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مناسب و معقول فلمیں تیار کرنے کے لیے خداوندانِ فلم انڈسٹری کو مجبور کرتے۔

کسی فلم کو مخرب اخلاق پہلوؤں سے بچانے کے لیے عام طور سے ہمارے ملک میں جو طریقہ رائج ہے وہ نام نہاد ایک محتسبوں کی جماعت کی طرف سے فلم کے حسن و قبح پر غور و پرداخت کا ہے اور اس طریقہ میں کتنی جان ہے یا یہ طریقہ کس قدر پیچ در پیچ ہے اسے اس طریقہ کے مطابق عمل کرنے والے ہی عام لوگوں سے کچھ زیادہ سمجھتے ہیں۔ محتسبوں کی یہ جماعت جس اندھا دھند طریقہ سے اپنے فرائض انجام دیتی ہے اس کا نتیجہ چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ سینما ہال کے گھپ اندھیرے میں روز روشن کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ بہت سے والدین مسئلہ کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں لیکن ذرا ان کی ادا ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ اگر آپ ان سے کبھی راستہ میں جبکہ وہ اپنے معہ دو چار چھوٹے چھوٹے بچوں کے سینما ہال کی طرف جلد جلد قدم بڑھاتے ہوئے جا رہے ہوں دریافت کریں کہ حضرت یہ کیا؟ تو جواب ملے گا "بھئی کیا بتایا جائے، بچوں کو مکان پر اکیلا کس طرح چھوڑیں، گھر سے نکلتے وقت دامن سے لپٹ گئے مانتے ہی نہیں"۔ جب خوش فکر اور تعلیم یافتہ والدین کے تساہل کا یہ عالم ہے تو پھر سینما کے نتیجہ جان

یہ توقع رکھنا بھی کچھ کم مضحکہ خیز نہیں ہو کہ وہ اپنے سینما ہاؤسوں کے پھاٹکوں پر چوکیدار صرف اس غرض سے بٹھائیں گے کہ وہ اُن فلموں (جو بچوں کی طبیعت پر بُرا اثر چھوڑ سکتے ہیں) میں خاص عمر کے بچوں کو داخل نہ ہونے دیں [illegible] اور یہ واقعہ ہو کہ فلموں کی بیشتر تعداد ایسی ہی ہوتی ہے جن کا دیکھنا بچوں کے لیے زہر قاتل سے کسی طرح کم نہیں ہوتا

ضرورت ہے | اکثر لوگوں کی نظر کسی فلم کے مخرب اخلاق پہلوؤں پر تو زیادہ رہتی ہو اور اگر کوئی فلم اخلاق کے اعتبار سے بہت زیادہ گرا ہوا نہیں ہو تو پھر وہ اس کا بچوں کو دکھا دینا برا خیال نہیں کرتے۔ حالانکہ ہماری نظر اس سے کہیں زیادہ وسیع ہونی چاہیے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے اہم مسئلہ کا بطور خاص خیال رکھتے ہوئے ہمیں اپنی نظر کو کسی فلم کے صرف اخلاقی پہلو تک ہی محدود نہیں کر دینا چاہیے بلکہ ہمیں بچوں کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے لیے ایسی فلمیں درکار ہیں جو انھیں بیک وقت حظ ذہنی کر سکیں -- ذہنی سبق بھی دے سکیں اور ان کی قوت متخیلہ کو بیدار کر کے ان کو انسانیت اور عالمگیر ہمدردی کا درس دے سکیں۔ بچوں کے لیے فلمیں تیار کرنے کے لیے ان کی فطرت اور رجحان کا بہت گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہو۔ بچے بھی اسی طرح اپنا خاص مذاق رکھتے ہیں جس طرح کہ بڑے آدمی۔ وہ عام طور سے ہنگامہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نازک خیالی اور درد انگیزی کی طرف وہ مطلق توجہ نہیں کرتے وہ جہاں سیر و شکار کے واقعات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں وہاں وہ زندگی کے پیچیدہ واقعات کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتے۔ یہاں ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہو کہ آیا فلم کی تیاری و ترتیب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے رجحانات کا فرق مد نظر رکھنا بھی ضروری ہو یا نہیں؟ اگر ہم غور سے چھوٹے لڑکوں اور چھوٹی لڑکیوں کے رجحانات کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ دونوں کے رجحانات میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا لہذا قیاس یہ ہو کہ ایسی فلموں کا تیار کر لینا ممکن ہو جو لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے متفقہ طور پر مفید اور کارآمد ثابت ہو سکیں گی۔

مناسب اور موزوں فلموں کی تیاری | لیکن ساتھ ہی ہمیں ایک اور خاص بات پر نظر رکھنی ہوگی اور وہ یہ کہ آیا یہی ملک کی کسی ذمہ دار جماعت یا حلقۂ منتظمین کے لیے یہ ممکن بھی ہو یا نہیں کہ وہ بچوں کے لیے مناسب

موزوں فلمیں تیار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ یہ واقعہ ہے کہ ناطق فلموں کی ایجاد کے بعد بچوں کے مناسب و موزوں فلموں کی تیاری اور بھی مشکل ہو گئی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ دن بدن فلموں کا مذاق و معیار گرتا چلا جا رہا ہے اور اسی چیز میں بچوں کے مستقبل کی تباہی کا راز زیادہ سے زیادہ مضمر ہے۔ بچوں کے لیے خاص طور سے فلمیں تیار کرنے کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مغربی ممالک میں بھی یہ تحریک برابر جاری ہے مغرب میں یہ مسئلہ ان دنوں بڑے بڑے مدبرین کی توجہ کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسئلہ کی جانب سے بہت زیادہ غفلت اختیار کرنا کسی ملک کے لیے ہرگز سود مند ثابت نہیں ہوگا بلکہ اس سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا بہت زیادہ امکان ہے لیکن ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ بچوں کے لیے مناسب و موزوں فلمیں اس وقت تک تیار نہیں ہو سکیں گی جب تک کہ ملک کے باشندگان کی طرف سے اجتماعی شکل میں کوئی موثر قدم نہ اٹھایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ فلم تیار کرنے والی مجلس (اراکین) کے فلم کی تیاری کے نتیجہ کے طور پر مالی اعتبار سے کسی طرح پست ہمت اور مایوس کن ثابت نہ ہو۔ فلم کی تیاری کے بعد اس کا استقبال ایسے پیمانے پر ہو اور کسی شان سے کیا جائے کہ فلم تیار کرنے والی جماعت کو نفع توقع سے بہت زیادہ ہو تاکہ اس کی ہمت افزائی ہو اور وہ ایک فلم کے بعد دوسری فلم تیار کرنے کے لیے مستعد رہے۔ جب ہم بچوں کے رجحان اور ان کی ذہنی قوت کا خیال رکھتے ہوئے ان کے لیے نصاب کی ایسی کتابیں تیار کرتے ہیں جو ان کے لیے ہر لحاظ سے مناسب و موزوں بھی جاتی ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بچوں کے لیے مناسب موزوں فلمیں تیار کرنے کی طرف خاص توجہ نہ دیں۔ (ماہ جنوری [illegible])

توکل ڈبائیوی ایم اے

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ اُن سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے خیا[illegible] مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت کے لئے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک [illegible] ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر

حنا بلڈنگ، لکھنؤ

اگر آپ

سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی کا حال اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔
سائنس کی نئی ایجادات اور انکشافات سے واقف ہونا چاہتے ہیں
سائنس کے ماہرین کے کارخانے اور موجدوں کی کہانیاں سننا چاہتے
سائنس کے علم اور عمل سے اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں
سائنس کی دنیا سے بے خبر رہنا نہیں چاہتے۔

انجمن ترقی اردو کے ماہوار رسالے

سائنس

کے مستقل خریدار بن جائیے

اس رسالہ کو سررشتۂ تعلیمات حیدر آباد دکن، پنجاب، بہار، مدراس، سی پی، صوبہ سرحد اور سندھ نے اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لئے منظور کیا ہے۔ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے۔ اس میں ہر ماہ عام فہم زبان میں مختلف مضامین، دلچسپ معلومات، سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔

قیمت سالانہ پانچ روپے (عہ) سکہ انگریزی، پانچ روپے ۱۴ آنے (۵/۱۴) سکہ عثمانیہ

نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے سکہ انگریزی دس آنے (۱۰/) سکہ عثمانیہ

اگر آپ

اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو

سائنس

میں اشتہار دیجیے

یہ رسالہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں کالجوں اور اسکولوں میں جاتا ہے۔ ہر ماہ ہزاروں اشخاص بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یا جو میں اسلامی خدمت بجا لانے والا ماہوار میگزین

[ریویو] آف ریلیجنز (انگریزی)

[…] ۱۹۰۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور ہر ماہ کی [… تا]ریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور [… او]ر غلط فہمیاں دیگر مذاہب نے اسلام کے متعلق پھیلائی [ہیں ان کو] دور کر کے اس عالمگیر مذہب کو اصلی رنگ میں پیش [کرنا او]ر دیگر مذاہب پر تحقیقی تبصرہ اور موجودہ زمانے کے [… ز]مانہ اور مذہبی رجحانات پر نظر رکھنا ہے

[چند]ہ سالانہ صرف چار روپے (للعہ)

[نمو]نہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہے

[د]فتر ریویو آف ریلیجنز (انگریزی)

قادیان (پنجاب)

ترجمان سرحد پشاور

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

۱۔ جنوری ۱۹۱۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور صوبہ کے صدر مقام پشاور سے شائع ہوتا ہے۔

۲۔ آزادی وطن کا داعی اور اسلامی حکومت کا نگہبان ہے۔

۳۔ [یہ] سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاست کا آئینہ ہے۔

۴۔ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے

سرحد اور ہندوستان کی قومی تحریکات کا ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار [بن] کر سرحد کی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں

اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد و افغانستان اور بلوچستان پنجاب [و] ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار دینے والوں کے لئے تشہیر کا بہترین ذریعہ ہے

چندہ سالانہ چار روپے (للعہ)

[شش]ماہی دو روپے آٹھ آنے (عہ/)

منیجر ترجمان سرحد (پشاور)

اخبار خالد کشمیر

[خا]لد کشمیر میں واحد پرچہ ہے جو وسیع ترین اشاعت رکھتا [ہے اپنی] سنجیدگی اور مقبولیت کی وجہ سے تمام اونچے حلقوں اور [… ع]ام ناظرین کی فہرست میں شامل ہے۔ ریاست کے تمام [… ا]ور دیگر بڑے بڑے عہدہ دار خالد کا مطالعہ پابندی سے [کرتے ہیں۔ خ]الد کی گوناگوں خصوصیات کے باعث اس پرچہ کو ریاست [کے محکمہ ت]علیم کے ڈائرکٹر صاحب نے ریاست کے تمام سکولوں، لائبریریوں [کے لئے منظو]ر فرمایا ہے۔

[ریاس]ت جموں و کشمیر میں خالد تجارتی مال و اشیاء کے لئے بہترین ذریعہ [ہے۔ ری]است میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے خالد سے بہتر [کوئی ذریعہ نہی]ں ہے۔ اجرت اشتہارات بہت کم ہے [آج ہی] خط و کتابت [کیجئے …]ت تاکہ آپ اپنی فرموں اور دیگر تجارتی مال و اشیاء [… د]وسری جگہ میں دیکھ کر اپنی تجارت کو بڑھائیں۔

منیجر شعبہ اشتہار خالد سرینگر کشمیر

مقتدر اخبار خدمت امیرا کدل سرینگر

خدمت کشمیر کا بہترین ہفتہ وار جریدہ ہے جس کا طرز تحریر کار اور لائحہ عمل [… م]قبولیت پیدا کر چکا ہے۔

خدمت سیاسیات کشمیر کا بیباک ترجمان اور ذمہ دار نظام حکومت کا نقیب ہے

خدمت اردو زبان کی خدمت کرنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بلند پایہ ادیبوں کے رشحات قلم اشاعت پذیر ہوتے ہیں اور جدید مطبوعات پر فاضلانہ تنقیدیں لکھی جاتی ہیں۔

خدمت کا حلقہ اشاعت بہت وسیع ہے اور ریاست جموں و کشمیر کے شہروں سے لیکر دور دراز دیہاتوں تک اس کی رسائی ہے۔

خدمت صلح کل پالیسی کی وجہ سے مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور بدھوں وغیرہ ریاستی فرقوں میں یکساں ہر دلعزیز اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

خدمت کو پڑھنے والوں کے زمرے میں حکومت کے ذمہ دار ہائی کورٹ اور دوسری عدالتوں کے جج تعلیمی مدارس کے ہیڈ ماسٹر۔ تجار صنعت [و حرفت]، [ک]ارخانوں کے مزدور اور دیہات کے کسان بھی شامل ہیں۔

خدمت میں اشتہار دینا تجارتی مال کی شہرت کو چمکانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اشتہارات کے نرخ کی تفصیلات چٹھی لکھ کر منگائیے۔ منیجر


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس … قیمت سو گولیاں بڑا بکس …
اوکاسا ہر اچھے دوافروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک مشن دہلی گیٹ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

جدید مطبوعاتِ جامعہ

طریقۂ تعلیم عام: - جناب سلامت اللہ صاحب معلم، استادوں کا مدرسہ جامعہ نگر نے زیر تربیت اساتذہ کی ضروریات اور ان کی دشواریاں پڑھانے کے طریقے، بچوں کی نفسیات اور ہندوستان کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے مرتب کیا ہے۔ قیمت عہ

بجلی کی کہانی: - جناب علی احمد خاں صاحب استاد سائنس مدرسہ ثانوی جامعہ نے کہانی کے انداز میں بتایا ہے کہ بجلی کیا چیز ہے، کب ایجاد ہوئی اور کن لوگوں نے اس کی ترقی میں حصہ لیا۔ بہت دلچسپ اور بچوں کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔ قیمت ۲ر

مقناطیس کی کہانی: - یہ بھی بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ زبان بہت آسان اور انداز بیان بہت دلچسپ۔ مصنفہ جناب علی احمد خاں صاحب بی۔ ایس سی۔ قیمت ۲ر

بجلی اور مقناطیس کے کھیل (حصہ اول): - اس مزیدار کتاب میں بچوں کے لئے بجلی اور مقناطیس کے ایسے دلچسپ کھیل بتائے گئے ہیں کہ انھیں پڑھتے ہی بچے ان کا تجربہ کرنے کے لئے بیقرار ہو جاتے ہیں۔ مصنفہ جناب علی احمد خاں صاحب بی۔ ایس سی۔ ۴ر

صحت و صفائی (حصہ دوم): کتاب کے اس حصے میں متعدی بیماریوں کا حال ہے یعنی یہ کہ متعدی بیماریاں کیا ہوتی ہیں ان سے کیسے بچا جائے اور ایسے مریض کی کس طرح تیمار داری کی جائے۔ قیمت ۵ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی نمبر ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

چند کتابیں

آخری فیصلہ :- از قیسی رام پوری۔ یہ ناول دراصل رومان کی کربیہ آواز کو دبانے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ فواحش پسندی، دوشیزاؤں کی پراسرار اور پُراثر ڈائریاں کنواروں کی خلوتوں کو برانگیختہ کرنے والے سستے ناول کی جگہ ایسا سچا فنا اور شریفانہ لٹریچر ہے جو نوجوانوں کے حسین خیالات کو بارسنگ سے وابستہ رکھتا ہے جس سے وہ کسی مدعا بے حصول یا با حصول کی تلاش میں شب گردوں سے بچے رہتے ہیں۔ عہ

دل کی آواز :- قیسی رام پوری صاحب نے اس میں بھی اپنے فلسفہ عشق کو کامیاب بنانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

افادات سلیم :- مجموعہ کلام ابوالحاسن مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم پانی پتی لٹریری اسسٹنٹ سر سید احمد خاں مرحوم و پروفیسر ادب اردو عثمانیہ یونیورسٹی۔ قیمت ۶؍

شان خدا :- مؤلفہ مولانا عبدالرحمن عاقل رحمانی۔ اس میں وجود خالق کے تمام حالات جدید علم کلام اور سائنس کی روشنی میں نہایت اہم اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ عہ

نئے مسائل :- یورپ کے مشہور مفکرین کے اچھوتے خیالات، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نئی صداقتیں، نوجوانوں، طلبا، اور والدین کے لئے فکر و عمل کی نئی راہیں۔ ۱۱۲ صفحے، قیمت صرف ۱؍

جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۷، نمبر ۵ | بابتہ ماہ نومبر ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۵ روپے، فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

لکھنؤی ادب کا سماجی پس منظر

(واجد علی شاہ کا اثر)

واجد علی شاہ کے عہد میں اودھ کی علمی، اخلاقی اور اقتصادی حالت کیا تھی؟ اس سوال کا جواب ڈبلیو ایچ سلیمن کی زبان سے سنیے۔ سلیمن صاحب نے واجد علی شاہ کی حکومت کے زمانے میں سارے اودھ کا دورہ کیا تھا۔ ٹھگی اور ڈکیتی کے انسداد کا جو محکمہ انگریزی حکومت نے قایم کیا تھا اس کے سب سے بڑے افسر یہی سلیمن تھے اس طرح وہ اودھ کے حالات سے بخوبی واقف تھے وہ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"یورپی آدمی جو مختلف پارٹیوں کے انگریزی اخبارات پڑھ پڑھ کر یہ خیال قایم کرے کہ انگلستان میں بے اطمینانی، بد امنی اور بدنظمی کے سوا کچھ نہیں وہ اگر انگلستان پہنچے اور اپنے چاروں طرف امن اور میل ملاپ کی کیفیت دیکھے تو اس کو اتنا تعجب نہ ہوگا جتنا اس انگریز کو جو ہندوستانی اخبار پڑھنے کے بعد مشرقی سرحد کے انگریزی علاقوں سے اودھ میں داخل ہوتا ہے۔ وہ توقع کرتا ہے کہ ملکی بدنظمی کے سوا اودھ میں کچھ نہ ملے گا۔ مگر اسے اپنے سامنے ایک ایسا ملک دکھائی دیتا ہے جہاں کی سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی کی قلمرو سے کہیں بہتر اور آبادی کہیں گنجان ہے وہ دیکھتا ہے کہ اودھ کے کسان زیادہ دلیر اور اسی کے ساتھ زیادہ مہذب اور خلیق ہیں اور اجنبیوں کے ساتھ مہمان نوازی کے فرایض ادا کرنے کے لیے زیادہ بے چین رہتے ہیں۔"

یہی سلیمن صاحب کہتے ہیں کہ:۔

"کمپنی کو بہادر سپاہی اور تعلیم یافتہ افسر زیادہ تر اودھ کی سلطنت سے ملتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے خطے میں جس کی وسعت اودھ کے برابر ہو ایسے بہادر کسان اور اتنے تعلیم یافتہ شرفاء اور امرا نہیں ہیں۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اودھ کے باشندوں میں تعلیم، صلاحیت اور قابلیت کی کمی نہیں ہے ہماری فوج کے سپاہی اور افسر

جن میں ہم ہیں قدر جرأت، وفاداری اور جاں نثاری پاتے ہیں وہ زیادہ تر اودھ کے رہنے والے ہیں۔ اسی طرح وہ نہایت قابل اور اعلیٰ تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہندوستانی عہدہ دار جو ہمارے دیوانی، فوجداری اور مال کے محکموں میں نیکنامی سے کام کر رہے ہیں اور ہندوستانی رعایا اور حکومت ہند کو فائدہ پہنچا رہے ہیں ... اودھ کے باشندے ہیں۔"

... اودھ کی رعایا کا اطمینان، کسانوں کی خوش حالی و خوش اخلاقی، علمی اور عملی سطح کی بلندی کا حال جو آپ نے ابھی سر سلیمن کی زبانی سنا اس کا مقتضا یہی تھا کہ اس زمانے میں علم و ادب کے چرچے اور تصنیف و تالیف کے مشغلے عام ہوں۔ مگر ۱۸۵۷ء کا وہ انقلاب جو غدر کے نام سے مشہور ہے ایک ایسا سیلاب تھا اور بہت سی چیزوں کے ساتھ اودھ کے علمی اور ادبی کارناموں کو بھی بہا لے گیا۔ بہرحال واجد علی شاہی اودھ کے ادبی سرمایہ میں سے جو کچھ زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گیا ہے اس کی مختصر کیفیت سنیے اور دیکھیے کہ وہ واجد علی شاہ کی شخصیت سے کہاں تک متاثر ہوا ہے۔

اودھ کے آخری تاجدار سلطان عالم واجد علی شاہ خود بہت ذی علم تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔ ان کی قابلیت اور علمی قدر دانیوں کا ذکر بہت سے مصنفوں نے کیا ہے ان میں سے ایک سندیلہ کے فاضل تعلقدار راجہ درگا پرشاد صاحب مرحوم ہیں جنھوں نے الحاق اودھ کے برسوں بعد اودھ کی ایک تاریخ فارسی میں لکھی جس کا نام بوستان اودھ ہے وہ اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں :-

"سرزمین ہند پر کوئی بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس میں واجد علی شاہ کی طرح علوم و فنون جمع ہوئے ہوں اور ہندوستان کی مملکت میں ایسے فضل و کمال والے فرماں روا نے بادشاہی کا علم بلند نہیں کیا۔ ان دنوں اگرچہ آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی کی وجہ سے خاطر اقدس طرح طرح کی فکروں میں گھری رہتی ہے لیکن ان کا وقت زیادہ تر علمی تذکروں میں گزرتا ہے اور اپنی تازہ تصنیفوں اور نئی تالیفوں سے اپنے ملک کو فیض پہنچاتے رہتے ہیں۔ اگر باغوں کی سیر کے لیے جاتے ہیں تو خادم اساتذہ کی تصنیفیں ساتھ رکھتے ہیں کیونکہ سیر و تفریح کی حالت میں بھی اکثر شعر و سخن کا ذکر رہتا ہے اور اساتذہ کی کتابیں ملاحظہ کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔"

واجد علی شاہ کو ابتدا میں فوجی زندگی سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی اپنی فوجوں کی درستی کی طرف خاص توجہ شروع کر دی اور کئی پلٹنوں اور رسالوں کا اضافہ کر دیا جن کے نام انھوں نے بانکا رسالہ ترچھا رسالہ، اختری پلٹن، نادری پلٹن، گھنگھور پلٹن وغیرہ رکھے تھے۔ فوج کو قواعد خود کراتے تھے اور فوجی قواعد کی اصطلاحیں فارسی میں خود بنائی تھیں۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا تاریخی نام میر حاتم علی بیگ مہر نے مجاہدۂ اختری تجویز کیا تھا۔ اس زمانے کے لکھنؤ میں بادشاہ سے لے کر متوسط طبقے کے لوگوں تک میں فنون جنگ کا خاص ذوق تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کو عام طور پر شاہنامہ اور حملۂ حیدری کی رزمی کتابوں سے بہت دلچسپی تھی چنانچہ منشی ہردھیان سنگھ نے شاہنامہ کا خلاصہ فارسی نثر میں لکھ کر واجد علی شاہ کے نام سے معنون کیا اور رجب علی بیگ سرور نے بادشاہ کی فرمائش سے شمشیر خانی کے ایک قدیم فارسی خلاصہ کا جس کا نام شمشیر خانی ہو اردو میں ترجمہ کر کے اس کا نام سرور سلطانی رکھا۔ حملۂ حیدری کا ترجمہ خود بادشاہ نے اردو نظم میں کیا اور اس کا نام بہت حیدری رکھا۔ جنگ اور بہادری کے قصوں کی مانگ جب بہت بڑھی تو امیر حمزہ کی پرانی داستان جو فارسی زبان میں تھی اردو کے لباس میں پیش کی گئی اور اسے اتنا پھیلایا گیا کہ ہزار ہزار آٹھ آٹھ سو صفحات کی پچاس ساٹھ جلدیں تیار ہو گئیں میرے لڑکپن تک لکھنؤ میں یہ منظر جگہ جگہ دکھائی دیتا تھا کہ کسی دوکان پر یا کسی مکان میں داستان پڑھی جا رہی ہے اور لوگ شام سے آدھی آدھی رات تک بیٹھے سن رہے ہیں۔ اردو کے رزمی ادب میں سب سے بہتر چیز مرثیہ ہے اگرچہ عہد واجدی کے نامی مرثیہ گو ان سے پیشتر کے دور کی پیداوار تھے مگر اس میں شک نہیں کہ اس عہد میں مرثیہ نے بے حد ترقی کی اور بہترین مرثیے اسی عہد میں لکھے گئے۔ واجد علی شاہ خود بھی مرثیے کہتے تھے اور اگرچہ ان کے مرثیے شاعری کے اعتبار سے کچھ بہت اچھے نہیں ہیں مگر مقدار میں اتنے ہیں جتنے کسی باقاعدہ مرثیہ گو شاعر نے بھی شاید ہی کہے ہوں باقاعدہ مرثیہ گویوں کے علاوہ اس عہد کے دوسرے شاعروں نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ان میں اسیر اور امانت کے مرثیے مقدار میں اوروں سے زیادہ ہیں۔

واجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ میں شعر و شاعری کا بڑا زور تھا۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا آدمی شعر و سخن کا شوقین تھا واجد علی شاہ کو بھی کم سنی ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کا ایک دیوان شاہزادگی ہی کے زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ وہ بڑے زود گو تھے خود کہتے ہیں ؎

بہ جلدی غزل کہنا بہت دشوار ہو کب کوئی دنیا میں اختر آپ سا پیدا ہوا

سکے اس دعوے کی تصدیق کئی مصنفوں نے کی ہو سوانح عمری کے مصنف محمد کاظم کا بیان ہو کہ واجد علی شاہ اتنی جلد شعر کہتے تھے کہ دو کاتب مل کر بھی ان کو نہ لکھ سکتے تھے مولانا شرر مرحوم نے بھی بادشاہ کی حیرت خیز زود گوئی کے بارے میں اپنی عینی شہادت پیش کی ہو۔ بادشاہ خود مشاعرے کرتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ بہت سے شاعران کے دربار سے وابستہ تھے جن میں ذکی، برق، قلق، درخشاں، اسیر، امیر، قبول خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں درباری شاعروں کے علاوہ اور بھی بہت سے خوشگو شاعر اس عہد کے لکھنؤ میں موجود تھے مثلاً صبا، رند، وزیر، امانت، شہید، شوق، نسیم، یہ اور ان کے علاوہ لکھنؤ سے باہر کے شاعر مثلاً مرزا غالب دہلوی واجد علی شاہ کے خوان کرم سے فیض پاتے رہتے تھے۔ بادشاہ کی کئی بیگمیں شعر کہتی تھیں جن کے تخلص یہ ہیں۔ عالم، صدر، محبوب، بیگم، عشرت، قمر، حور۔ ان کے کئی شاہزادے بھی شاعر تھے جن میں سے ہر کوکب، انجم کے دیوان چھپے ہوئے موجود ہیں جب تک واجد علی شاہ بادشاہ رہے لکھنؤ میں شاعروں کا جمگھٹ رہا مگر ان کے کلکتہ چلے جانے کے بعد یہ مجمع منتشر ہو گیا اور شعر و سخن کے چرچے بہت کم ہو گئے۔ وہ خود کہتے ہیں

جب سے قیدی ہوا کلکتہ میں آکر اختر شاعر ہند بہت لطف سخن بھول گئے

عہد واجدی کے ایک استاد مولوی محمد بخش شہید گزشتہ شاعرانہ صحبتوں کو یاد کر کے اپنی دلی حسرت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

فصل گل کب آئے گی کب ہوں گے آکر نغمہ سنج ایک مدت ہو چکی مرغان گلشن کو گئے

واجد علی شاہ کے منظوم کلام کی مقدار اتنی زیادہ ہو کہ وہ تیس پینتیس جلدوں میں سما سکا ہو انھوں نے قصیدے بہت کم کہے اور غزلیں بہت زیادہ اور یہی حال اس عہد کے دوسرے شاعروں کا بھی ہو۔ امن و اطمینان عیش و عشرت کے زمانے میں عشقیہ شاعری خوب پھولتی پھلتی ہو۔ غزل میں عشق کی طولانی داستانیں بیان نہیں کی جا سکتیں، اس لیے عہد واجدی میں عشقیہ مثنویوں کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ خود بادشاہ نے کئی بڑی بڑی مثنویاں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں افسانۂ عشق، دریائے تعشق، بحر الفت اور عشق نامہ وغیرہ زمانے کے دوسرے شاعروں نے بھی بہت سی مثنویاں کہیں جن میں سے یہ تین بہت مقبول ہوئیں

...نگر نسیم کی گلزار نسیم اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق اور آفتاب الدولہ قلق کی طلسم الفت ...
مثنویہ شاعری کی ایک خاص صنف واسوخت ہے۔ فارسی میں وحشی یزدی واسوخت کا موجد سمجھا جاتا ہے
...یں میر تقی میر نے واسوخت کی ابتدا کی۔ اس صنف سخن نے واجد علی شاہ کے عہد میں بڑی ترقی کی۔ امانت
...سن کے واسوخت بہت مشہور ہوئے۔ نواب مرزا شوق اور امیر مینائی کے بھی واسوخت خوب بکے۔

شاعری کے عام چرچے کے ساتھ فن شعر گوئی کی طرف توجہ ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ خود واجد علی شاہ نے اس موضوع پر میر شمس الدین فقیر کے ایک فارسی رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس میں جگہ جگہ اپنی طرف سے ...سافے بھی کیے۔ بادشاہ کی اس کتاب کا نام ارشاد خاقانی ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کی تاریخ کپتان ...دی علی خاں قبول نے کہی اور خوب کہی ہے

آں میر شمس دیں کہ تخلص فقیر داشت — در شعر یادگار جلال اسیر را
کرد او عروض و قافیہ در فارسی رقم — تا فایدہ دہد شعرائے خبیر را
[illegible] کرد پئے نفع خاص و عام — اردو نمود آں رقم دلپذیر را
تاریخ طبع کرد قبول ایں چنیں رقم
[illegible]طبوس دادہ نوشۂ اقدس فقیر را

...خاقانی کے علاوہ واجد علی شاہ نے فن عروض پر تین رسالے اور بھی لکھے ہیں۔ اس عہد کے بعض دوسرے شعرا نے بھی اس فن پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اسیر اور ذکی کے رسالے بہت مقبول ہوئے۔

واجد علی شاہ کو موسیقی اور رقص کا بے حد شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کی ایک نئی صورت انھوں نے یہ نکالی کہ ایک طرح کا ڈراما ایجاد کیا جس کے تمام ایکٹر گانے اور ناچنے کے فن میں پوری مہارت رکھتے تھے یہ ڈرامے رہس کے جلسے کہلاتے تھے۔ واجد علی شاہ نے متعدد رہس تصنیف کیے۔ کنھیا اور رادھا کی محبت کے افسانوں کو ان سب کا موضوع قرار دیا۔ رہس کے جلسے لاکھوں روپوں کے صرف سے تیار ہوتے اور باغ میں کھیلے جاتے تھے۔ ان جلسوں کی تعریفیں سن سن کر لکھنؤ کے عام باشندوں کے دلوں میں بھی انھیں دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا مگر شاہی جلسوں میں ان کی رسائی ممکن نہ تھی۔ آخر ان کا شوق پورا ہونے کا سامان بھی ہو ہی گیا۔

یعنی لکھنو کے ایک ممتاز شاعر آغا حسن امانت نے اپنے ایک شاگرد کے کہنے سے شاہی رہس کے نمونہ پر ایک ناٹک لکھا اور کنھیا اور ان کی گوپیوں کی جگہ راجہ اندر اور اُن کی پریوں کو دی اور اندر سبھا اس کا نام رکھا دو برس کی محنت میں اندر سبھا کا جلسہ تیار کر کے پبلک کے سامنے پیش کیا گیا یہ جلسہ اتنا پسند کیا گیا کہ شہر بھر میں جگہ جگہ کھیلا جانے لگا، جہاں یہ جلسہ ہوتا تھا وہاں ہزاروں کی تعداد میں تماشائی ٹوٹ پڑتے تھے۔ اندر سبھا کی یہ غیر معمولی مقبولیت دیکھ کر دوسرے مصنفوں نے بھی اس کی تقلید میں ناٹک لکھنے شروع کر دیے کئی ناٹک کے جلسے بھی تیار ہو گئے۔ امانت کی اندر سبھا کے بعد مداری لال کی اندر سبھا سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ ان اندر سبھاؤں سے ملتے جلتے دو جلسے اور بھی مقبول ہوئے جن کے نام بزم سلیماں اور جشن پرستان تھے۔ اس طرح واجد علی شاہ کے زیر اثر اردو میں ڈرامے کی بنیاد پڑی۔

مختصر یہ کہ واجد علی شاہ کے عہد میں اردو کے ادبی ذخیرے میں اس وقت کے مذاق کے مطابق کافی اضافہ ہوا۔ بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ خود واجد علی شاہ نے نظم اور نثر میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں اب تک ان کی ستر بہتر کتابوں کا پتا لگا چکا ہوں اور ان میں سے کوئی چالیس کتابیں میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔

سید مسعود حسن ر…

گورکی اور لینن

گورکی اور لینن کی دوستی سنہ ۱۹۰۷ء میں لندن کے دوران قیام میں شروع ہوئی۔ اس ابتدائی زمانے میں چونکہ ان دونوں کا سیاسی تخیل ایک تھا اس لیے گورکی کے کپری واپس ہو جانے کے بعد بھی خط وکتابت جاری رہی اور جب دونوں کے ایک مشترکہ دوست نے یہ تجویز پیش کی کہ انقلابی اخبار پرولتاری کا ایک علمی شعبہ قایم کیا جائے اور گورکی کو اس کا مدیر بنایا جائے تو لینن کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس نے جواب میں دوست کو لکھا۔

"تمھاری رائے بہت صائب ہے اور مجھے بے حد پسند ہے لیکن مجھے خود کبھی یہ تجویز پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لیے کہ نہ تو مجھے یہ معلوم ہے کہ گورکی آج کل کس کام میں مشغول ہیں اور نہ اس امر کا اندازہ ہے کہ وہ اس قسم کا کام کر بھی سکتے ہیں یا نہیں اگر وہ کوئی مفید اور اہم کام کر رہے ہیں تو یہ مجرمانہ حرکت ہوگی کہ ان کو اس ضروری کام سے ہٹا کر اخبار نویسی کے غیر اہم کام میں لگا دیا جائے تاہم اگر تم یہ سمجھو کہ یہ اخباری ذمہ داری گورکی کے اصل کام میں مخل نہ ہوگی تو ضرور کوشش کرو کہ گورکی مان جائیں۔"

چنانچہ جب گورکی نے پرولتاری میں مضامین دینے پر رضامندی ظاہر کی تو لینن نے ان کو بھی لکھ بھیجا

"اگر دوسرے اہم کاموں میں فرق نہ آئے تو خیر ورنہ زیادہ مفید کام ہی کرتے رہنا چاہیے۔"

کچھ دن بعد کپری سے لینن اور اس کی بیوی کے نام دعوت نامہ آیا لیکن سیاسی مصروفیتیں اتنی تھیں کہ ان دونوں کو اس دعوت سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ اس اثنا میں خط وکتابت برابر جاری رہی جس سے لینن کو یہ اندازہ ہوا کہ گورکی کے سیاسی تخیلات میں وہ سختی نہیں ہے جو لینن کی جان ہے۔ گورکی مخالف سیاسی پارٹیوں سے مصالحت، تعاون اور سمجھوتہ ضروری خیال کرتا تھا اس کے برخلاف لینن سیاسی تخیلات اور عمل میں سخت گیر تھا چنانچہ جب گورکی نے مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو مصالحت کی نیت سے کپری آنے کی دعوت دی اور لینن کی شرکت پر اصرار کیا تو لینن نے جواب دیا۔

"مونشویک سے مصالحت کرنا بے سود ہے۔ میں نے تم سے پیرس ہی میں کہہ دیا تھا کہ اگر مصالحت کے

…نہ بلائی گئی تو سوائے شرمندگی کے کچھ حاصل نہ ہوگا جہاں تک میری ذات کا تعلق …ت ڈیموکریٹک کا لیڈر رہتے ہی طور پر بھی گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوں"

یہ وہی مارتوف ہے جو کسی زمانہ میں لینن کا دست و بازو تھا اور جس کی بابت باوجود بعد کی مخالفت کے بھی لینن کہا کرتا تھا "افسوس کہ مارتوف ہمارے ساتھ نہیں" سنہ ۱۹۲۰ء میں جب گورکی اور لینن کی ملاقات ہوئی اور مارتوف کا ذکر آیا تو گورکی کا بیان ہے کہ لینن نے کہا "مارتوف عجیب انسان ہے کتنا صاف دل ہے" اور جب کسی نے لینن کے سامنے مارتوف کا یہ جملہ دہرایا "روس میں صرف دو بالشویک ہیں ایک لینن اور دوسرا کولنتائی" تو لینن نے ایک ٹھنڈا سانس کھینچا مارتوف کی یاد لینن کو برابر ستاتی رہی۔

جب گورکی کی صلح کی کوشش ناکامیاب ہوئی تو انھوں نے اخبار پرولتاری کے لیے ایک مضمون روانہ کیا جس کو مصالحت آمیز لہجہ ہونے کی بنا پر لینن نے مسترد کر دیا نہ صرف اسی پر اکتفا کیا گیا بلکہ مصالحت کے تخیل کی تردید میں کیمونیف نے ایک مضمون بعنوان "ہماری راہیں مختلف ہیں" نکالا لیکن اس اخباری جنگ کے باوجود گورکی نے اپنی رائے نہیں بدلی اور مصالحت کی برابر کوشش کرتا رہا اس نے دوبارہ لینن کو خط لکھ اور مختلف سیاسی پارٹیوں سے مصالحت پر پھر زور دیا جس کے جواب میں لینن نے لکھا۔

"مجھے آپ کے جذبات کا احترام ہے لیکن آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب ایک سیاسی کارکن کسی سیاسی تخیل کو سچے دل سے غلط خیال کرتا ہے تو اس کو غلط تخیل کی صاف طور سے مخالفت کرنی چاہیے مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ دوسری پارٹیوں کا سیاسی تخیل نہ صرف بیکار ہے بلکہ حقیقتاً ضرر رساں ہے اگر مجھے اس کا یقین نہ ہو گیا ہوتا تو میں ہرگز یہ طوفان برپا نہ کرتا اس وقت مصالحت کا تصور بے معنی ہے سوائے کش مکش کے چارہ نہیں۔"

جب مخالف پارٹی کا لیڈر بوگدانوف کیپری پہنچا تو گورکی نے پھر لینن کو بلایا تا کہ بالمواجہ گفتگو ہو جائے اور کسی طرح مصالحت کی شکل نکل آئے لیکن لینن نے دعوت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور لکھ بھیجا۔

"میرا کیپری آنا اور بحث و مباحثہ کرنا بے سود ہے میں ان لوگوں سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا جو … اور … کر کے تبلیغ کرتے ہیں ان لوگوں سے کوئی نتیجہ خیز بحث نہیں ہو …

"میرا نیاز خاص طور پر میرا [illegible] گورکی کی بیوی، کو پیش کرنا کیا وہ بھی دیوتاؤں کی پجاری ہو گئی ہیں؟"

[illegible] دوسرے خط میں گورکی کو لکھتا ہے۔

"تم خود سمجھ سکتے ہو کہ سیاسی اختلاف کی [illegible] سے علیحدگی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے لیکن کیا کیا جائے [illegible]"

گورکی نے جب کچھ مدت بعد کیپری میں ایک سیاسی اسکول جاری کیا تو لینن کا ماتھا ٹھنکا اور اس کو خیال ہوا کہ شاید گورکی اور دوسرے مخالفین اس اسکول کے پردے میں تمام مخالف رجحانات کو ایک مرکز پر لانا چاہتے ہیں [illegible] اپنے اخبار پرولیتاری میں گورکی کے خلاف ایک مضمون بعنوان "شرمناک ناکامی" نکال دیا جس کی بنا پر تمام سرمایہ دار اخباروں نے یہ خبر اُڑا دی کہ بالشویک پارٹی میں بڑا زبردست اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس [illegible] کرتے ہوئے لینن نے اپنے اخبار کے ایک نوٹ میں لکھا۔

"[illegible] اخباروں کا یہ خیال کہ گورکی کو پرولتاری پارٹی سے نکال دیا سراسر غلط ہے گورکی نے [illegible] بلکہ تمام دنیا کی پرولتاری جماعت کی ادبی خدمت سے اپنے وجود کو مزدور طبقہ میں مدغم کر دیا ہے پرولتاری طبقہ سے گورکی کو کوئی اختلاف جدا نہیں کر سکتا۔"

گورکی اور لینن کے آپس کے اس مجادلہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ کیپری کا اسکول ختم ہو گیا۔ اسکول ختم ہونے پر طبیعتیں صاف [illegible] میں اور لینن کچھ دن آرام کرنے کے خیال سے کیپری پہنچ گیا۔ گورکی اس زمانہ میں لینن کی بابت لکھتا ہے

"لینن میں ایک قسم کی مقناطیسی کشش ہے جو مزدور طبقہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے اگرچہ وہ اطالوی زبان نہیں جانتا اس پر بھی کیپری کے تمام مچھیرے اس سے محبت کرنے لگے ہیں لینن کی ہنسی میں بھی جاذبیت ہے وہ سادہ دل لوگوں کی سادہ باتوں پر خوب ہنستا ہے۔"

اس ملاقات سے یہ خوشگوار نتیجہ نکلا کہ ایک دوسرے نے گلے شکوے کر کے اپنی اپنی طبیعتیں صاف کر لیں لیکن لینن کیپری سے واپس ہی ہوا تھا کہ گورکی نے ایک مخالف اخبار کو اپنے مضامین دینے کا وعدہ کر لیا جب لینن کی نظر سے یہ اشتہار گزرا تو پھر اس نے گورکی کو لکھا [illegible]

"آج میں نے ایک اشتہار دیکھا کہ تم اخبار ہمعصر کو باقاعدہ مضمون دیا کرو گے اس کے کیا معنی ہیں؟

ایسا رسالہ جس کا کوئی نقطۂ نگاہ نہ ہو وہ ایک نفرت انگیز جرم ہے۔ وہ نہ صرف خود تباہ ہوگا بلکہ اپنے مضمون نگاروں کو بھی شرمندہ کرے گا۔ تمھاری جانب سے یہ بڑا غلط اقدام ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔"

اس پر گورکی نے لینن کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لکھا:۔

"گرد و پیش کے حالات یہ چاہتے ہیں کہ ہم [illegible]"

اس کا جواب لینن نے تیزی سے یوں دیا۔

"تم میرے سامنے واقعیت، جمہوریت اور عمل کے الفاظ دہرا کر مجھے جلانا چاہتے ہو کیا یہ صاف الفاظ ہیں؟ نہیں، یہ نفرت انگیز الفاظ ہیں تمام مکار سرمایہ دار ان الفاظ کو استعمال کر رہے ہیں [illegible] روس میں، بریان فرانس میں اور لائڈ جارج انگلستان میں شی شی"

لیکن باوجود ان سیاسی اختلافات کے دونوں ایک دوسرے کے مددومددگار اور ہم راز تھے ۱۹۰۷ء میں لینن نے روس کے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک کے وہی انقلاب کی بابت ایک کتاب لکھی چھپوانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی آخرکار ۱۹۱۷ء میں گورکی کو لکھا کہ وہ اپنے چھاپہ خانہ میں (گورکی کا چھاپہ خانہ بھی تھا) چھپوا دیں لیکن اس معاملہ کے متعلق دوسرا خط لکھنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ میریا کا خط آیا جس میں تحریر تھا کہ منیجر نے پریس پر قبضہ کر لیا ہے اور گورکی کی ملکیت ختم ہو گئی ہے۔ دراصل واقعہ یہ تھا کہ گورکی کو منیجر پر پورا بھروسہ تھا اور اس لیے اس نے پریس کا کام منیجر کے سپرد کر رکھا تھا لیکن منیجر چالاک نکلا اس نے حساب میں بدعنوانی کر کے گورکی کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ پریس سے دست بردار ہو جائے جب لینن کو پوری کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے گورکی کو لکھا [redacted]

"میری رائے ہے کہ منیجر پر مقدمہ چلاؤ کسی شرافت اور پرانے تعلقات کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اشتراکیوں کے لیے یہ ناجائز نہیں ہے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں جو قانون رائج ہے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ... یہ بڑی بزدلی ہوگی کہ صرف عدالت میں جانے کے خوف سے تم منیجر پر مقدمہ نہ چلاؤ۔"

لیکن گورکی نے مقدمہ نہ چلایا۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں جب پہلی مرتبہ پراودا اخبار نکلا تو کافی کامیابی ہوئی اور وہ اخبار مضمون نگاروں کو کچھ اجرت بھی دینے لگا۔ اس زمانے میں لینن گورکی کو لکھتا ہے:

"پراودا کے دفتر سے مجھ سے دریافت کیا گیا ہے کہ کیا میں تمہیں اس امر پر راضی نہیں کر سکتا کہ تم دو پیسے فی سطر کی شرح پر اس اخبار کے لیے مضمون لکھا کرو کیا رائے ہے؟ اچھا ہے اگر اشتراکی اخوت کی بنا پر منظور کر لو۔"

[illegible] کی سیاسی [illegible] باتیں بھی گورکی کو بتا دیتا تھا ایک رقعہ میں [illegible] گورکی کو لکھتا ہے:

"[illegible] کے بیڑے میں بغاوت ہونے والی ہے پیرس میں میرے پاس ملاحوں کا ایک خاص وفد آیا تھا کسی سے ذکر نہ آئے مجھے رونا آتا ہے کہ ہمارا وہاں کوئی مرکز نہیں ہے اگر تمہارے بحری افسروں سے خاص تعلقات ہوں تو وہاں کوئی ادارہ قایم کرنے کی کوشش کرو ملاح جد وجہد کرنے کیلیے تیار ہیں لیکن تنظیم نہ ہونے کے باعث شاید وہ بغیر کسی نتیجہ کے ہی فنا ہو جائیں گے۔"

ان سنہ ۱۹۱۳ء میں لینن مقام کراکو سے گورکی کو لکھتا ہے:

"مجھے اطلاع دو کہ کیا تم یہاں آسکتے ہو؟ بہت اچھا ہو اگر آجاؤ۔ یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر ایک اچھا مقام ہے وہاں کی آب وہوا بھی صحت کے لیے مفید ہے اگر صحت اجازت دے تو ضرور آنا۔"

اب گورکی خرابی صحت کی وجہ سے نہ آسکا تو لینن نے لکھا:

"تو تمہارا اب بے ترتیب زندگی گزارنے سے کیا مطلب ہے؟ تکان، پریشانی اور اس پر ضرورت [illegible] کرنا۔ یہ حدود رجہ کی بے پروائی ہے کیپری میں جاڑوں میں تو کوئی مہمان نہیں آتا یہ باقاعدہ زندگی [illegible] نہیں کی جاتی کیا کوئی تمہاری خدمت کرنے والا نہیں ہے کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے [illegible] نہایت غلط ہے اپنی زندگی میں نظام پیدا کرو اس عمر میں آئے دن بیمار رہنا [illegible] [illegible] کو بھی کام کرنا شروع کر دیا؟ جب میں کیپری میں تھا تو تم کہا کرتے تھے کہ میری موجودگی کی وجہ سے تم دیر میں سوتے ہو ورنہ اس سے قبل سرشام سو جایا کرتے تھے اچھا اب تم اوقات

کی پابندی کرو اور زندگی میں باقاعدگی پیدا کرو۔"

جب خاندان رومنوف زار کا خاندان کی ۳۰۰ سال کی برسی منائی گئی تو حکومت روس نے بہت سے جلاوطنوں کو وطن واپس آنے کی اجازت دیدی۔ ان میں گورکی بھی تھا داخلہ کی اجازت ملی تو گورکی نے روس کا رُخ کیا اس موقع پر لینن گورکی کو لکھتا ہے:

"روس جانے سے پیشتر یہ معلوم کر لو کہ کیپری کے اسکول کی بنا پر حکومت مقدمہ تو نہیں چلا دے گی۔ امید ہے کہ تمھارا یہ خیال نہیں ہے کہ ہمیں عام معافی سے فایدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہم روس میں داخل ہو کر بہت تیزی سے انقلابی کام کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ جب روس جاؤ گے تو ہم سے ملتے ہوئے جاؤ گے ہم تمھارے راستے ہی میں ہیں۔ ایک انقلابی مصنف کے لیے روس جانے کا یہ نادر موقع ہے اس سے فایدہ اٹھا کر وہ رومنوف پر کاری ضرب لگا سکتا ہے"

روس کے جاڑے بلا کے ہوتے ہیں گورکی باوجود مرض دق کے عود کر آنے کے اور ڈاکٹر کے یہ بتا دینے کے کہ شاید تین ہفتہ کی زندگی اور ہے گورکی نے وطن کی روانگی کا ارادہ کر ہی لیا لینن کو جب ڈاکٹر کی یہ رائے معلوم ہوئی تو بڑا پریشان ہوا اور گورکی کو لکھا:-

کیا یہ جائز ہے کہ بلا کسی علاج کے کیپری میں پڑے رہو حالانکہ جرمنی میں دار الشفا بنے ہوئے ہیں کیا تم کیپری سے سیدھے روس جا رہے ہو؟ مجھے یہ دکھائی دے رہا ہے کہ تم اپنی صحت خراب کر لو گے۔ اپنے حال پر رحم کرو۔ سوئزرلینڈ جا کر کسی قابل ڈاکٹر کو دکھاؤ یا پھر جرمنی جاؤ ایک دو ماہ جم کر علاج کرو۔ یہ بہت ناجائز ہے کہ انسان اس طرح اپنی جان ہلاکت میں ڈالے۔ میں ملتجی ہوں کہ خیال سے اپنا علاج کرو۔ انشاءاللہ شفا ہو جائے گی صحت کا خیال نہ کرنا اللہ کی ناشکری کرنا ہے اور اس لیے جرم ہے۔

جب لینن کو یہ معلوم ہوا کہ گورکی نے پارٹی کے کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے اور وہ ڈاکٹر اپنا نو ایجاد طریقۂ علاج گورکی پر آزما رہا ہے تو لینن نے لکھا:-

یہ خبر سن کر کہ ایک بالشویک ڈاکٹر تمھارا علاج کر رہا ہے بہت پریشانی ہو رہی ہے خدا ہمارے اشتراکی ڈاکٹروں سے ہمیں بچائے اور بالشویک ڈاکٹروں سے خاص کر یقین جانو کہ سو میں سے ایک ڈاکٹر...

بالشویک ڈاکٹر گدھے ہوتے ہیں یہ ایک ماہرفن کی رائے ہے۔ ایک بالشویک ڈاکٹر کے ذریعہ علاج کا تختۂ مشق بننا بڑی حماقت ہے اگر سردی میں کہیں جانا ہے تو وائنا اور سوئٹزرلینڈ ان دونوں مقامات میں سے کہیں چلے جاؤ اگر ایسا نہیں کیا تو ناقابل معافی جرم کروگے۔ اب صحت کا کیا حال ہے؟"

ایک طرف تو یہ دوستانہ خط و کتابت جاری تھی لیکن دوسری طرف سیاسی ... ہی تلخی اور گرماگرمی تھی جب گورکی کے ساتھیوں میں سے ایک نے لینن کے نقطۂ نگاہ کے خلاف مضمون نکالا تو لینن نے گورکی کو لکھا۔

"جب ۱۹۰۸ء میں کپری میں تم سے ملا تھا تو سیاسی بحث و مباحثہ کے بعد میں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چار پانچ سال ایک دوسرے سے علیحدہ رہنا چاہیے جس پر تم برا مانے جو اس وقت صدر تھیں مجھے ادب ... چلا کر خاموش کر دیا لیکن اب ساڑھے چار برس گزر گئے اور اختلاف قایم ہو گیا تمھارے دوست یہ نہیں سمجھتے کہ مارکسیت مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے اور اس کے ... تعمیل کرنا غلط ہے۔ اگر وہ اس کو حقیقت خیال کرتے ہیں تو میں ان کا خادم ہوں اور اگر ایسا نہیں ہے تو معاف کرنا۔ دوستی دوستی کی جگہ ہوتی ہے اور فرض فرض کی طرح ادا ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے مارکسیت ... اور مزدور جماعت کو ورغلانے کی کوشش کی تو لڑوں گا اور آخری دم تک لڑونگا"

گورکی نے جب مضمون کے دوران میں مذہبی تخیلات کا اظہار کیا تو لینن نے ایک لمبا خط لکھا جس کے آخری جملے یہ تھے "تمھارا طریقۂ استدلال ہر پہلو سے غلط ہے۔ تم ایسا کیوں لکھتے ہو اس سے صدمہ ہوتا ہے" اس کے بعد دوسرا خط لکھا جو اتنا سخت تھا کہ اس تحریر کے پہلے چار صفحے نشر کیے گئے اور گورکی نے اپنے مضامین کا مجموعہ شایع کرایا تو اپنے مضمون سے اس پیرے کو نکال دیا جس پر لینن بہت جھلایا تھا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے زمانہ میں گورکی نے روزنامہ کے نام سے پھر ایک اخبار نکالا چونکہ اس کی پالیسی نہ تو پورے طور پر انقلابی تھی اور نہ رجعتی تھی اس لیے کوئی طبقہ بھی اس اخبار سے خوش نہ تھا اس زمانہ میں گورکی نے اخبار میں ایک خط شایع کیا جس میں مدافعانہ جنگ جاری رکھنے کی حمایت کی لینن کا گزشتہ جنگ عظیم کی بابت یہ خیال تھا کہ وہ سرمایہ دار ملکوں کی جنگ ہے اس لیے اشتراکی لوگوں کو اس میں حصہ نہ لینا چاہیے ... ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ جب دونوں فریق کشت و خون کے بعد تھک کر بیٹھیں تو کامیاب اشتراکی

[illegible] لینن نے جب یہ خط اخبار میں پڑھا تو گورکی کو لکھا۔

"تمہارا خط اس قدر عام خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ بلا غصہ آئے اس کو پڑھ نہیں سکتے"

لیکن گورکی لینن کے تمام اعتراضات کا جواب ہنس کر یہ دیدیا کرتا تھا:۔

[illegible] ہے کہ میں خام قسم کا [illegible] دوسری بات یہ ہے کہ ہم ادیب ہمیشہ کچھ غیر ذمہ دار سے لوگ ہوتے ہیں [illegible]

گورکی ہر حالت میں تعاون، آزادئ خیال، تمدن اور تہذیب کا حامی تھا لیکن لینن کے نزدیک روس کے اس انقلابی دور میں تفرقہ پیدا کرنا، آزادئ افکار پر قید و بند لگانا اور طبقہ وارانہ تہذیب و تمدن کا تباہ ہو جانا ضروری تھا چنانچہ انقلاب ہو جانے پر گورکی اپنے اخبار میں لکھتا ہے

ہم نے پرانا ملوکی نظام درہم برہم کر دیا لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی تباہی ہماری طاقت کی [illegible] سے نہیں ہوئی وہ نظام خود بودا تھا ایک جھٹکے میں گر پڑا۔ وہ نظام ایک مدت سے بوسیدہ تھا مگر پھر بھی اس کے تباہ کرنے میں اتنا عرصہ لگا۔ یہ درحقیقت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ تمام کائنات میں انسان ہی واحد تخلیقی طاقت ہے اس لیے ہمیں انسان کو عقل، علم اور تہذیب سے مسلح کرنا چاہیے تب کہیں مکمل انقلاب ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملوکیت تباہ ہو گئی لیکن جس مرض میں ہم گرفتار ہیں وہ مرض گیا نہیں بلکہ ہڈیوں میں پوشیدہ ہو گیا ہے اگر فلاح چاہیے تو انسانیت کی دوامی قدروں کو بچاؤ۔ تہذیب خطرہ میں ہے"

اسی زمانہ کے حالات قلمبند کرتے ہوئے گورکی کا ایک دوست نوکا نوف اپنی مشہور کتاب "حالات انقلاب روس" میں لکھتا ہے [illegible]

"گورکی صبح سے شام تک تعلیم یافتہ طبقہ میں وقت گزارتا تھا۔ سائنس داں، ادیب، ماہرین فنون لطیفہ سب لوگ گورکی کے پیچھے لگے رہتے [illegible] بنانا چاہتے تھے اس طبقہ کی گھبراہٹ کا

[illegible]

گورکی سے قدر [illegible] یہ خیال تھا کہ [illegible]

کو دبا رکھا ہو اس لیے اخبار کی روش انقلابی رجحانات کے مطابق ہو۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ گورکی
انقلاب کی حمایت میں قلم اٹھا کر تمام سماجی بدنظمی پھیلا رہا ہو چنانچہ جو برجوازی آتا وہ گورکی کے
...ت بدلنے کی کوشش کرتا تاکہ با اثر نوایا کی پالیسی بدل جائے اور وہ انقلاب ...
کرنے لگے۔ بڑے کارخانہ دار آتے اور گورکی کو سمجھاتے کہ مزدوروں کی سستی کی وجہ سے صنعت
حرفت میں ساری خرابی پھیلی ہوئی ہو ان کے استدلال کا گورکی پر اثر پڑتا تھا اور جب کراسن
جیسے سنجیدہ اور ایماندار انسان ... وں کی بدعنوانیوں اور بے پروائیوں کا ذکر کیا تو
گورکی کو کارخانہ داروں کے بیان پر یقین آگیا اور اس نے اڈیٹروں کو ہدایت کی کہ اخبار میں
تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کیا جائے۔"

گورکی کا اخبار کسی خاص نقطۂ نظر کو پیش نہیں کرتا تھا بلکہ ہر پارٹی کے مضامین نشر کر دیتا تھا اگر ایک طرف بالشویک لیڈروں مثلاً ٹراٹسکی، زینوویف، کیمونیف کے مضامین شایع ہوتے تھے تو دوسری طرف مونشیوک لیڈروں مثلاً مارتوف، سوکانوف وغیرہ کے مضامین شایع ہوتے رہتے تھے۔ جب اگست میں سوویٹ کے انتخابات ہوئے تو نوایا نے یہ اپیل کی کہ بالشویک کو رائے نہ دی جائے۔ اس آزادیٔ خیال کی بنا پر ہر پارٹی گورکی پر سیاسی خامی کا الزام لگاتی رہتی تھی جب جمہوری اشتراکی پارٹی کے لیڈر ملیکوف نے گورکی پر طعن کیا تو گورکی نے صفائی پیش کرتے ہوئے لکھا۔

"سترہ برس سے میں اپنے آپ کو جمہوری اشتراکی خیال کرتا ہوں اور اس پارٹی کی خدمت کرتا رہا ہوں لیکن میں دوسری پارٹیوں کی بھی خدمت کرتا ہوں کوئی اہم مسئلہ ہو خواہ کسی پارٹی کا ہو، میں مدد کرنے کو تیار رہوں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں اپنے آپ کو ہر پارٹی میں اجنبی پاتا ہوں مجھے اس کا اعتراف ہو کہ میری آزاد سیاست کبھی کبھی متضاد معلوم ہونے لگتی ہو لیکن کیا کروں میں اپنی سیاست کو خط مستقیم کی طرح نہیں رکھنا چاہتا۔"

جب ... نے روسی وجرمنی سپاہیوں کے باہم اختلاط پر خوشی ظاہر کی تو برجوازی طبقہ کو بہت ناگوار ... نمائندہ برتوف نامی نے صاف طور سے کہدیا کہ گورکی جرمن جاسوس اور غدار وطن کے

کے خلاف غداری کر رہا ہو گورکی نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا :-

"... سے اس ملک کے باشندے مراد ہوتے ہیں میں ۲۵ سال سے فرزندانِ وطن کی خدمت کر رہا ہوں اسے کمینہ ! تجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ مجھ پر انگشت نمائی کرے اور میرے کردار پر فیصلہ کرے"

جب نومبر کا مہینہ قریب آیا اور بالشویک کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ پیدا ہوا ہر سمت سے انقلاب انقلاب کی آوازیں آئیں اور اس قسم کے قرائن دکھائی دینے لگے کہ بالشویک جرأت رندانہ سے کام لے کر سب انقلاب کر ہی ڈالیں گے اور تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو ہی جائے گا تو گورکی نے ایک مضمون بعنوان "میں خاموش نہیں رہ سکتا" لکھا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"عام طور پر یہ کہا جا رہا ہو کہ ۲ر نومبر کو بالشویک بغاوت کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ جولائی کے روح فرسا واقعات پھر دہرائے جائیں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ دوبارہ سراسیمہ لوگ بندوقیں اور طمنچے ہاتھوں میں لے کر نکلیں گے اور اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے جو سامنے آجائے گا اس کو نشانہ بنائیں گے"

عوام کے بہیمانہ جذبات سیاسی اغراض کے لیے پھر برانگیختہ کیے جائیں گے اور ان جذبات کے ماتحت پھر ایک دوسرے کو تباہ کیا جائے گا غیر منظم عوام سڑکوں پر نکل پڑیں گے اور اس وقت ڈاکوؤں، چوروں، اچکوں اور بدمعاشوں کو اپنی حسرتیں پوری کرنے کا پورا موقع ملے گا اور یہی وہ لوگ ہوں گے جو روسی انقلاب کی تاریخ بنائیں گے غرضکہ وہ خوں چکاں واقعات رونما ہوں گے جو انقلاب کی اخلاقی اور تمدنی اہمیت کو خاک میں ملا دیں گے۔ بہت ممکن ہو کہ جولائی کے زمانہ کی نسبت اب زیادہ افسوس ناک حالات رونما ہوں اور انقلاب کو زیادہ صدمہ پہنچے یہ کون کر رہا ہے؟ بالشویک کی مرکزی کمیٹی نے تو ظاہرہ طور پر ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا اگرچہ انھوں نے اس افواہ کی تردید بھی نہیں کی ہو لیکن اس کو درست بھی نہیں بتایا ہو کیا یہ چند آبرو باختہ لوگ ہیں جو کشت و خون کروا کر پرولتاری کی قوت انقلاب کو چوکنا چاہتے ہیں یا یہ جنگی لوگ ہیں جو بلوے کی آڑ لے کر پرولتاری طبقہ پر ظلم و ستم ڈھانا چاہتے ہیں اور جنگی انقلاب کرنا چاہتے ہیں اگر بالشویک کی مرکزی کمیٹی دوچار

کوتاہ نظروں کا ادارہ نہیں ہو بلکہ جمہوری ادارہ ہو تو اس کو

...نے اس مضمون کا جواب لینن کے ایک دوست نے فوراً دیا جو حسب ذیل ہو:

"ہم سے دریافت کیا جا رہا ہو کہ ہم کب بغاوت کریں گے لیکن بالشویک خوب جانتے ہیں کہ ہم مارکسی ہیں اس لیے بلوے کرانے کے خلاف ہیں۔ واقعہ یہ ہو کہ بالشویک جس سیاست کی ساتھ ساتھ حمایت کر رہے ہیں وہ سیاست بلوے پیدا کرانے والی ہو بلوے وہ لوگ پیدا کرا رہے ہیں جو عوام میں ناامیدی اور بے اعتنائی پیدا کر رہے ہیں اگر یہی سیاسی ماحول قایم رہا اور حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی اور جبر و تشدد کی وجہ سے بلوہ ہوا تو ظاہر ہو کہ ہم بالشویک ... ہوں گے۔"

...میں خود بالشویک پارٹی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ زینوویف کیمونیف نے نووایا اخبار میں بیان دیتے ہوئے کہا "ہم بلوے کے سخت خلاف ہیں اور ہماری پارٹی کا کسی بلوے میں حصہ لینا سیاسی خودکشی ہوگی۔" لینن نے ...لین کامنیف سے اس کا یہ جواب دیا۔ "اب تک ہم لوگوں پر کاری ضرب لگاتے رہے ہیں جو وقت پر ہچکچاتے ہیں ...سی حل کے عوام میں ہمارا اعتبار قایم کر دیا ہو اور سوویٹ میں ہماری اکثریت ہو گئی ہو اب جب کہ سوویٹ پر ہمارا ...ہو گیا ہو بالشویک کو یہ زیبا نہیں کہ وہ ہچکچائیں۔" جب لینن سے انقلاب کی مشکلات اور نتائج کی بابت مزید ...کیے گئے تو اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "ایک احمق انسان بھی اتنے سوال کر سکتا ہو جن کا جواب دس عاقلوں کے ...لیے دینا مشکل ہو ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ بالشویک کو آسانی سے اقتدار حاصل ہو جائے گا لیکن ہم ان مشکلات سے ڈر کر ...انقلاب کو خیرباد نہیں کہہ سکتے۔"

ابھی گورکی وغیرہ آپس میں بحث و مباحثہ کر ہی رہے تھے کہ بالشویک نے ۷ نومبر کو حکومت پر قبضہ کر لیا جس آسانی سے قبضہ ہوا اس پر بالشویک کو بھی حیرت تھی۔ اگر اس ابتدائی زمانہ میں کوئی یہ پیشین گوئی کرتا کہ بالشویک ...حکومت چند ماہ بھی قایم رہے گی تو لوگ اس کو دیوانہ بتاتے خود لینن اور ٹراٹسکی اس فوری فتح کو جلوہ ...سراب سمجھتے تھے۔ ان دنوں کسی نے ٹراٹسکی سے کہا "انقلاب قایم نہیں رہ سکتا" تو جواب ملا:

"ہمیں جانا پڑے گا لیکن جب ہم جائیں گے تو اپنے پیچھے اس زور سے دروازہ بند کریں گے کہ اس کی...

بالشویک [illegible]

بالشویک کا حکومت پر قبضہ ہوتے ہی گورکی کے اخبار نوایا نے ان کا مذاق اڑانا اور مندرجہ ذیل عنوان سے ان کے خلاف مضامین لکھنے شروع کر دیے "تباہی کے غار پر" "موت کا سانس" "دیوانگی" وغیرہ

فتح کے بعد لینن نے پرولتاری آمریت قایم کرنی چاہی تو پارٹی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ زینولیف، کیمونیف وغیرہ نے بالشویک کی مرکزی کمیٹی سے [illegible] اور پارٹی کے بہت سے اکابر ممبروں نے یہ زور دیا کہ روس میں پرولتاری آمریت کی بجائے جمہوری حکومت قایم کی جائے لیکن لینن، ٹروٹسکی اور اسٹالین وغیرہ نے [illegible] انھوں نے پرولتاری آمریت قایم کر کے مخالف رجحانات کو طاقت سے دبانا شروع کر دیا اس تشدد پر گورکی بڑا چراغ پا ہوا اور اس نے ایک مضمون سپرد قلم کیا جس میں لکھا ہے:۔

"اشتراکی وزیر لینن اور ٹروٹسکی کو پیٹر پال کا قلعہ سپرد کرنے کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو ان عوام کے سپرد کر گئے ہیں جن کو انسانی فرائض اور انسانی آزادی کا کچھ احساس نہیں۔ جیسا کہ ان کی مکروہ حرکات سے ظاہر ہے لینن اور ٹروٹسکی اور ان کے ساتھی ابھی سے طاقت کے نشے میں چور ہو گئے ہیں انھوں نے تقریر و تحریر کی آزادی ختم کر دی ہے اور ان انسانی حقوق کو پامال کر دیا ہے جن پر جمہوریت کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ اندھے متعصب اور [illegible] فایدہ کے دیوانے خیال تو یہ کر رہے ہیں کہ وہ اشتراکی شاہراہ پر دوڑ رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا رخ نراجی کی طرف ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی کوتاہ اندیشی کی بنا پر پرولتاری انقلاب کو تباہ کر دیں۔ اس شاہراہ پر دوڑ لگانے کے لیے لینن اور اس کے خوشامدی ہر مخالفت اور رکاوٹ کو طاقت سے مٹا رہے ہیں۔ پیٹروگراڈ میں کشت و خون اور ماسکو میں گولہ باری کی جا چکی ہے تقریر و تحریر پر قید و بند لگائے جا رہے ہیں اور گرفتاریاں عام ہیں [illegible] مزدور طبقہ یہ سمجھ گیا ہوگا کہ لینن کے سب وعدے سراب کے مانند ہیں اور مزدوروں کی نگاہ اس کی دیوانگی کو پہچان گئی ہو گی مجھے امید ہے کہ مزدور طبقہ یہ احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لینن ان کے خون سے تجربہ کر رہا ہے۔ وہ عوام کے انقلابی جذبے کو برانگیختہ کرنے کے

بعد یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا لینن کو خود پرولتاری فتح کا یقین نہیں ہو وہ لیبر

اس امید پر جی رہا ہو کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ مزدوروں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ خاک [illegible]

کی زندگی میں معجزے نہیں ہوا کرتے [illegible] دو سال کی تباہی [illegible]

اور پھر حقیقی انقلاب کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ یہ راستہ ہو جس پر لینن وغیرہ روس کو

لے جا رہے ہیں۔ ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ لینن جادوگر نہیں ہو بلکہ ایک چالاک انسان ہو جس کا

دل رحم و کرم سے محروم ہو جس کو پرولتاری کی جان اور عزت کا خیال نہیں ہو مزدور طبقہ کو

چاہیے کہ دیوانوں کو خون کی ہولی نہ کھیلنے دیں اگر وہ لینن کے زیر اثر آگئے تو اس کا کچھ نہ بگڑیگا

مزدور طبقہ تباہ ہو جائے گا۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا روسی جمہوریت کو یاد نہیں کہ وہ زار

کی استبدادی حکومت سے اس لیے برسرپیکار تھی کہ وہ تقریر و تحریر پر پابندی عاید کرتی تھی

اور جمہور کے لیڈروں کو جیل میں ڈالتی تھی۔ کیا لینن کا طرز عمل بھی ویسا ہی نہیں ہو جیسا کہ زار

[illegible] کا تھا کیا لینن بھی مخالفین کو زار کی طرح جیل میں نہیں ڈال رہا۔ لینن کو چاہیے کہ محصو[illegible]

[illegible]دوں کو رہائی اور تقریر و تحریر کی مکمل آزادی دے۔"

[illegible]رکی کا یہ مضمون نکلا تو برجوازی طبقہ بہت خوش ہوا اگرچہ لینن نے اس مضمون کے خلاف کچھ نہ لکھا لیکن

[illegible]س کی پارٹی نے چابک کی سی ضرب محسوس کی اور اپنے اخبار میں جواب دیتے ہوئے لکھا:۔

[illegible] پرولتاری کی خدمت کرنے کے بعد اب گورکی کے چہرے سے نقاب اٹھنی اور

اصلیت ظاہر ہونی شروع ہوگئی ہو۔"

[illegible]س پر گورکی نے جواب دیا:۔

"چند ردّی انسانوں کے اثر میں آکر مزدور جماعت نے اپنے آپ کو ایک ذات میں تبدیل کر لیا

ہو وہ ذات ہر اختلاف کو تشدد سے ختم کرنا چاہتی ہو میں پرولتاری کی اس ذات سے تعاون

نہیں کر سکتا میرے خیال کے بموجب صرف اس وجہ سے کہ برجوازی اخبارات تنقید کرتے

ہیں ان کا گلا قانوناً گھونٹ دینا جمہوریت کو فنا کرنا ہو۔ کیا بالشویک کی قائم کردہ جمہوریت

[illegible] اور مغرور ہو کہ وہ کوئی تنقید برداشت نہیں کر سکتی، کیڈٹ پارٹی اپنے تخیلات میں اتنی درست ہو کہ ان تخیلات کو صرف طاقت ہی سے دبایا جا سکتا ہو۔ پریس پر قید و بند لگانا جمہوریت کے شایان شان نہیں جو ٹروٹسکی کے دیوانہ ناچ میں شریک نہ ہوں ان پر ظلم کرنا اور ان کو قتل کرنا بے شرمی اور جرم ہے۔"

[illegible]س کا جواب بالشویک کے اخبار پراودا نے یہ دیا۔

"ہمیں افسوس ہو کہ گورکی نے بھی ہمارے دشمنوں کی سی زبان بولنی شروع کر دی۔ وہ ہمارے عمل کے تخریبی پہلو کو بہت نمایاں کر کے دکھا رہے ہیں۔ ظاہر ہو کہ جب ہزار سال پرانے نظام حکومت کو توڑا جائے گا تو کچھ نہ کچھ تباہی ضرور ہوگی ہمیں تعجب ہو کہ جب امن قایم ہوگا اور اقوام عالم ایک مشترکہ جشن منائیں گے تو گورکی کا جس نے اتنی تیزی سے جمہوریت کا دامن چھوڑ دیا ہو کس طرح استقبال کیا جائے گا۔"

اس کا جواب دیتے ہوئے گورکی نے لکھا۔

"اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ جب مستقبل میں ایک جشن ہوگا تو نہ پراودا کا مضمون نگار اور نہ میں زندہ ہوں گے اقوام عالم کو ایک رشتہ میں منسلک کرنے کے لیے سینکڑوں برس کی مسلسل محنت درکار ہے۔ ایسا کرنے کے لیے تہذیب و تمدن کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔ رہا وہ جشن جس میں غیر مہذب ظالم انسان اپنی فتح منائیں گے جب کہ انسانیت ظلم میں دبی ہوئی ہوگی تو ایسے جشن سے مجھے سروکار نہیں۔"

گورکی کہتا تھا۔

"خواہ حکومت کسی کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو لیکن تنقید انسان کا حق ہے اور میں اس حق کی حمایت کروں گا۔"

۱۹۱۸ء شروع ہوا تو دو اہم واقعات پیش آئے ایک بالشویک کا مجلس قانون ساز کو زبردستی برخواست کرنا اور دوسرا جرمنی سے صلح کر لینا۔ گورکی ان دونوں باتوں کے حق میں نہ تھا چنانچہ اپنے اخبار نوایا میں بڑے زور سے بالشویک کی سیاست پر تنقید کر رہا تھا۔ جرمنی سے صلح پر تنقید کرتا ہوا گورکی اپنے اخبار میں لکھتا ہے:-

"ہمارے سامنے چالاک مدبر ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملک... بار بار تباہ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنی حکومت کی عمر کو چند ہفتے بڑھانے کے لیے سب کچھ کر رہے ہیں ان کو اشتراکیت کی پروا نہیں اور نہ وہ روسی مزدوروں کی بھلائی میں ہیں حالانکہ وہ مزدوروں کے نام سے حکم جاری کر رہے ہیں"

دوسرے روز سوکا آوف نے ایک مقالہ نکالا جس میں اس نے کہا :-

"بالشویک کی کونسل کا صلح کے معاملہ میں ... جانا روسی انقلاب اور دنیا کے پرولتاری طبقہ ... جاتا ہے"

جب یہ مقالہ نشر ہوا تو بالشویک کے حکم سے نوایا آٹھ روز کے لیے بند کر دیا گیا اور حکومت نے یہ اعلان کیا کہ اگر دوسرے ایڈیٹر سوکا آوف کے خیال سے اختلاف ظاہر کر دیں تو نوایا سے پابندی اٹھالی جائے گی۔ اگرچہ دوسرے ایڈیٹروں نے اختلاف کا اظہار نہیں کیا تب بھی نوایا پر سے قید اٹھالی گئی۔ ان نازک حالات میں بھی لینن کا تشدد و استبداد ان کے موجودہ تشدد سے بہت کم تھا۔ اگرچہ نوایا نکلتا رہا لیکن بالشویک اس کو شبہ ہی کی نظر سے دیکھتے رہے۔ جب زینوویف پٹروگریڈ کے سودیٹ کا صدر مقرر ہوا تو اس نے گورکی کو ذلیل کرنا چاہا دوران تقریر میں اس نے گورکی کو مباحثہ کا چیلنج دیا گورکی نے جواب دیا :-

"میں مسٹر زینوویف کی درخواست منظور نہیں کر سکتا کیونکہ میں اچھا مقرر نہیں ہوں۔ میں عام جلسوں میں آنا پسند نہیں کرتا اور نہ مجھ میں وہ فصاحت و بلاغت ہے جو مسٹر زینوویف کا طرۂ امتیاز ہے۔ مسٹر زینوویف یہ فرماتے ہیں کہ میرا مقصد عوام کے ظلم و تعدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا یہ ہے کہ میں بورژوازی طبقہ کو خوش کر دوں تو یہ لغو بکواس ہے۔ لیکن زینوویف سے یہی توقع تھی۔ وہ یہ کہنا بھول گئے کہ ... مزدور طبقہ کی توجہ اس کے ظلم و ستم کی طرف دلاتا ہوں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ وہ زینوویف جیسے مقرروں کے پھندے میں پھنس کر ایسا کر رہے ہیں۔ اس پھندے سے ان کو جلد از جلد نکل جانا چاہیے"

نوایا میں یہ بیان نکلا تھا کہ گورکی کے پاس عوام کی طرف سے ایسے خطوط آنے شروع ہوئے جس میں اخبار بند کرنے کی دھمکی تھی۔ بجائے ڈر کر خاموش ہو جانے کے گورکی نے اپنے خیالات کا اظہار اور بھی بے باکانہ انداز سے شروع کر دیا

نتیجہ یہ نکلا کہ پریس میں کام کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ اب اخبار صرف ایک صفحہ پر نکلنے لگا لیکن بالشویک کی مخالفت برابر جاری رہی ۱۹۱۲ء زمانہ میں جب پراودا اخبار نے نوایا پر یہ طعن کیا کہ وہ برجوازی طبقہ کی مدد سے چلتا ہے تو گورکی نے لکھا

"۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک ہزاروں روبل جمہوری ڈیموکریٹ پارٹی کے لیے، برجوازی جیب سے آئے ہیں ہزاروں روبل میں نے خود اپنی جیب سے دیے جب لینن کا اخبار اسکرا نکلا تو وہ بھی برجوازی ساوا اور موروزوف کے روپے سے نکلا تھا۔ میرے اخبار پر تمہارے یہ آوازے تمہیں ہی ذلیل کرتے ہیں"

اس اثنا میں خانہ جنگی شروع ہو گئی یورپ کی سرمایہ دار حکومتوں نے روس کی ناکہ بندی کر دی جس کی وجہ سے کاغذ ملنا بند ہو گیا اور بجلی کا انتظام بھی خاطر خواہ نہ رہا ٹائپ لگانے والوں نے بھی بدعنوانیاں شروع کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ نوایا کو بند کرنا پڑا اور گورکی سیاسی جد و جہد ختم کر کے تہذیب و تمدن کی خدمت میں سرگرم ہو گیا اس زمانہ کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ روس کا تعلیم یافتہ اور متمدن طبقہ یورپ کے برجوازی طبقہ کی مدد سے روس کی پرولتاری حکومت کو تباہ کرنا چاہتا تھا ظاہر ہے کہ ان حالات میں روس کے مزدور اور غریب طبقے میں روسی برجوازی کے خلاف غم و غصہ کی آگ بڑھ رہی تھی۔ عوام تعلیم یافتہ طبقہ اور ان سے متعلق جتنے بھی ادارے تھے ان کے جانی دشمن ہو رہے تھے۔ ہر وہ شے جس کا تعلیم یافتہ طبقہ کی تہذیب و تمدن سے ذرا سا بھی تعلق تھا پارہ پارہ کی جا رہی تھی عمارتوں، کتب خانوں، یادگاروں۔ فنون لطیفہ کی نمائش گاہوں کو آگ کے شعلوں کے سپرد کیا جا رہا تھا مزدور کتابوں کے ورقوں کو سگریٹ بنانے کے کام میں لا رہے تھے۔ اگست سنہ ۱۹۲۰ء میں سائنس کی اکادمی میں یہ اعلان چسپاں کر دیا گیا تھا کہ کسے باشد خواہ وہ سائنس داں ہو کہ دربان ہر متنفس کو اکادمی کے آگے جو ایندھن کا انبار لگا ہوا ہے اس کی چھ گھنٹے تک مسلسل محافظت کرنی ہو گی۔ ایک تعلیم یافتہ خاتون ذنیلا اپنی ڈائری میں اس زمانہ کے حالات قلم بند کرتی ہوئی لکھتی ہے:۔

"فلوسوادف (روس کا مشہور نقاد تھا) کو بھی زبردستی مزدور بنایا جا رہا ہے۔ کل ۴ بجے شام تک گھر واپس نہیں آیا۔ جب آیا تو بارش میں تر اور تھا وہ اتنا دبلا ہو گیا ہے کہ اس کی شکل دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے اگرچہ وہ عوام کے کتب خانہ میں اچھے عہدے پر ہے لیکن اس کا بھی زیادہ وقت سڑ کشتیوں میں لکڑیاں

رکھوانے میں صرف ہوتا ہے۔ ان کی دیکھ بھال کرنا اب یہ اس کا کام ہے آج صبح اس کو دوسرے مزدوروں کے ساتھ شہر سے باہر لے جایا گیا اور وہاں سب سے خندقیں کھدوائی گئیں کتنا خراب موسم تھا اور کتنی برف پڑ رہی تھی جب گھر واپس ہوا اور میں اس کے جوتے اتار رہی تھی تو وہ سنا رہا تھا کہ ان کو جانوروں کی طرح ہانکا گیا ایک خاص۔ تمام پرپیچ کران کو پھاوڑے دیدیے گئے لیکن نہ کسی نے کھودا اور نہ کسی نے آکر دیکھا بھی کہ خندق کھدی کہ نہیں یہ صرف پریشان کرنے کی باتیں ہیں۔ جب کئی گھنٹے برف کے پانی میں کھڑے گزر گئے تو ایک موٹا تازہ مزدور آیا اور اس نے ایک ایک پونڈ کالی روٹی سب کو بانٹ دی۔ ذرا ابھی وہ روٹی لایا ہے تمام خاک آلود ہے یہ افریقہ کی غلامی ہے نہیں اس سے بھی بدتر ہے ننگے بھوکے لوگ ایک غیر ضروری مشقت کے کام پر برف و بارش میں لگائے جاتے ہیں۔ کیا ایسی باتیں پہلے بھی کبھی ہوئی ہیں۔"

تعلیم یافتہ طبقہ نے واقعی نئے نظام کی اشد مخالفت کی تھی اور اب مزدور طبقہ ان کو اس مخالفت کی سزا دے رہا تھا تعلیم یافتہ لوگوں میں اموات عوام سے پانچ چھ گنی زیادہ تھیں ۱۹۱۹ء میں اکادمی کے ۵۰ ممبر تھے۔ ۵ کی کمی تو موجود ہے اور نہ معلوم کتنے مرے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس پر آشوب زمانہ میں ماہرین علوم وفنون کی خدمت کا بیڑا اٹھانا کوئی آسان کام نہ تھا گورکی نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی اور ایک مضمون بعنوان "سائنس کیا ہے؟" سپرد قلم کیا۔ گورکی اس مضمون میں لکھتا ہے:۔

"کسی ملک کی دولت اس ملک کے دماغ ہوتے ہیں کسی ملک کی ترقی کے لیے یہ ازحد ضروری ہوتا ہے کہ اس ملک میں ماہرین علوم وفنون کی کافی تعداد ہو ان ماہرین کی زندگی کو ارزاں نہ خیال کرنا چاہیے اگر ہم ایک ماہر سائنس سے خندق کھدوانے لگیں تو یہ صرف حماقت ہی نہ ہوگی بلکہ ملک [illegible] کے خلاف جرم ہوگا۔ کسی عالم کی محنت تمام انسانیت کا ترکہ ہوتی ہے۔ ماہرین علوم [illegible] لیے وہ حالات پیدا کرنے چاہئیں جن میں ان کی دماغی اہلیتیں پوری آب وتاب سے [illegible] ہوں مزدور حکومت کو خاص کر اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ سائنسداں کی موت ملک [illegible] ہے ماہرین ہمارے ملک میں بڑی تیزی سے فوت ہو رہے ہیں اور اگر اموات

[illegible] طرح ہوتی رہیں تو روس اہل علم سے خالی ہو جائے گا جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کھانا نہ ملنے [illegible] رکھنے کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے کئی کام جو انسانیت کو [illegible] انجام دیں گے نہیں ہو سکتے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ ہم مجرم ہیں۔"

گورکی کی اس جد و جہد کا اور بالشویک کی رواداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہرین علوم و فنون کی خدمت کے لیے ایک محکمہ بن گیا اور گورکی اس کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا۔ اس محکمہ نے ماہرین کے لیے رہائشی کمرے، شفا خانے ضروری اشیا کی دکانیں دار الصحت وغیرہ مہیا کیے۔ گورکی کے ایک علمی دوست کورنی نے اس زمانہ کے کچھ حالات درج کیے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"کیونکہ گورکی اب ہماری ہر ضرورت پوری کرنے کا ذمہ دار تھا اس لیے اس سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اگر کسی ماہر کے بچہ پیدا ہوتا اور اس کو چسنی کی ضرورت ہوتی تو گورکی ہی مہیا کرتا تھا۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو گورکی ہی ہسپتال میں جگہ دلواتا۔ اگر کسی کو تبدیلی آب و ہوا کے لیے کہیں جانا ہوتا تو گورکی ہی اس کا انتظام کرتا۔ ایک دن ایک شاعرہ گورکی کے پاس آئی جب وہ چلی گئی تو گورکی کہنے لگا کیا بلا کے لوگ ہیں نہ کھانے کو ہے نہ پہننے کو۔ گھر میں روشنی نہیں، کمرہ گرم کرنے کے لیے لکڑی نہیں لیکن یہ لوگ وہی حرکتیں کیے جاتے ہیں جو پہلے کرتے تھے" دریافت کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ چند دن ہوئے کہ اس شاعرہ کے بچہ پیدا ہوا تھا اور گورکی کے پاس بچے کے لیے دودھ کا انتظام کرانے آئی تھی۔ گورکی نے فوراً حسب ذیل پرچہ گھوسن کے نام لکھا "تمھیں اجازت دی جاتی ہے کہ گورکی بیوی . . . (یہاں شاعرہ کا نام درج کر دیا گیا) کو دودھ دیا جایا کرے۔" ایک مرتبہ گورکی نے ایک کلب میں لکچر دیا وہاں سے اس کے عوض میں کھانے کی اشیا آئیں گورکی کو جب اطلاع ہوئی تو اس نے ایک مترجمہ کا نام لیا کہ کچھ حصہ اس نادار کو روانہ کرو لیکن قانوناً کسی ایسے فرد کو جو کسی ماہر کا عزیز نہ ہو گورکی سامان نہیں دے سکتا تھا چنانچہ جب گورکی کے سامنے یہ قانونی مشکل پیش کی گئی تو کچھ دیر سوچ کے کہنے لگا لکھ دو کہ وہ گورکی کی بہن ہے۔ اس طرح گورکی کی سینکڑوں مصنوعی بیویاں بہنیں اور لڑکے لڑکیاں تھیں۔ اس [illegible] میں گورکی

کے پاس بعض بعض پر لطف خط اور بہت بہت عجیب افراد آیا کرتے تھے۔ ایک بار ایک قاتل نے لکھا مہربان من کیا جس اوتار کو آپ پوجتے ہیں جب اس کا جنم دن منایا جائے گا تو عام معافی نہیں ہوگی۔ میں نے شادی سے پانچ روز بعد اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا جس جرم کی وجہ سے مجھ کو جیل ہوگئی کیا تم مجھے رہائی نہیں دلوا سکتے، ۱۹۱۰ء میں کسی صاحب کا تار آیا، سولہ ہزار روبل اور ایک پتلون ریلوے اسٹیشن سے چوری ہوگئی مدد کرو، بھلا گورکی ان امور میں کیا مدد کر سکتا تھا

ایک دن ایک خاتون تشریف لائیں جو زیور میں لدی ہوئی تھیں اور انھوں نے یہ درخواست پیش کی کہ ان کے دو خاوند جو اس وقت جیل میں ہیں ان کو رہائی دلوا دی جائے۔ گورکی نے حسب دستور رہائی کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ اس پر خاتون بولیں، شکریہ مہربانی فرما کر ایک بیوی بھی فرما دیجیے۔

یہ یقین ہو جانے پر کہ تعلیم یافتہ طبقہ مزدور اور غریب کی تعلیم میں مخل ہے اور بالشویک عوام میں تعلیم اور تہذیب و تمدن پھیلانا چاہتے ہیں گورکی بالشویک سے تعاون عمل کرنے لگا۔ مزید براں گورکی نے جب دیکھا کہ دول متحدہ نے جرمنی پر بے حد شرم ناک شرائط عاید کیے ہیں تو وہ بالشویک کے برسٹ لٹوسک کے شرائط نامہ پر دستخط کرنے کو بھی جائز خیال کرنے لگا اور جب اس کو یہ علم ہوا کہ دول متحدہ سب کارروائیاں اپنے بلند آہنگ اعلانات کے خلاف کر رہی ہیں اور روس میں ریشہ دوانیاں کر کے انقلاب کو فنا اور روس کو اپنا مال فروخت کرنے کے لیے ایک منڈی بنانا چاہتی ہیں تو وہ بالکل ہی بالشویک کے ساتھ ہو گیا۔ اس زمانہ میں گورکی نے امریکہ کے پریزیڈنٹ ولسن کی سیاست پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:۔

”زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار ملکوں کی انسانیت سوز سیاست کا پردہ فاش ہو رہا ہے اور اقوام یورپ کو دوبارہ جنگ عظیم کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ امریکہ کا صدر جو کل تک اقوام میں حکومت خود اختیاری قایم کرنے کا حامی تھا آج روس میں امن قایم کرنے کی خاطر امریکی فوج جمع کر رہا ہے۔ یہ اس سرزمین پر فوج کشی کرنا چاہتا ہے جہاں کے اقوام نے اپنا پیدائشی حق جیت لیا ہے اور جو اپنے نظریہ کے مطابق روس میں ایک نیا نظام قایم کرنے میں مصروف ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف

ہو کر نئے نظام قایم کرنے میں ہم نے غیر ضروری تباہ کاری سے کام لیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو نیا تہذیب و تمدن ہم نے پیدا کیا ہے اور جن مشکلات میں رہ رہ کر اس کو پرورش کررہے ہیں اور جو کوششیں اس کو مستحکم بنانے میں روسی عوام کو کرنی پڑی ہیں وہ قابل داد ہیں اگر اس نئے تمدن کی وسعت کو دیکھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا میں آج تک ایسا وسیع تمدن پیدا نہیں ہوا اگرچہ کل تک میں سویٹ نظام کے خلاف تھا اور آج بھی میں اس کے طریقہ کار سے بالکل متفق نہیں ہوں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو کام روسی عوام نے ایک سال میں کر دکھایا ہے مورخ کا قلم اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اس وقت جبکہ جنگ نے پرانے نظام کی بوسیدگی ظاہر کر دی ہے اور اس کے خلاف موت کی سزا کا فیصلہ سنا دیا ہم روسیوں نے جرات رندانہ سے کام لے کر نئے لائحہ عمل پر پہلا قدم اٹھا دیا تو ہمارا حق ہے کہ ہم دنیا کے پر دلتاریہ سے یہ امید رکھیں کہ وہ اس آڑے وقت میں ہماری مدد کریں گے جو لوگ جنگ سے قبل سرمایہ دارانہ نظام پر اعتراض کرتے تھے ان کا بھی فرض ہے کہ وہ نئے نظام کی طرف امداد کا ہاتھ بڑھائیں۔

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہوا کہ تمام اقوام یورپ میں سب سے پہلے ہم نے پرانے نظام کو درہم برہم کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم روسیوں میں پرانی روایات جاگزیں نہیں ہیں، ہم ان میں جکڑے ہوئے نہیں ہیں اس لیے زیادہ باغی اور زیادہ بہادر قوم ہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کو ہمیں اپنا نیا نظام قایم کرنے کی اجازت دینی چاہیے اگر دنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے ساتھ عملی ہمدردی رکھتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے جو پرانے بوسیدہ نظام کو ہم پر زبردستی عاید کرنا چاہتی ہیں یہ روسی انقلاب کو فنا کرنے کے درپے ہیں۔ جو ترکی، چین اور جرمنی کی طرح روس کو بھی نچوڑنا چاہتی ہیں اس وقت خطرہ ہے یورپ کے ڈاکو روس کے نئے نظام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے میں دنیا کے تمام ایماندار اور ترقی پسند افراد سے اپیل کرتا ہوں کہ نئی زندگی کی بنیادیں استوار کرنے میں ہماری مدد کریں اس نئے نظام زندگی کے لیے ہم اپنا جان و مال قربان کر رہے ہیں ہم نے

اپنا دن کا چین اور رات کا آرام ترک کر رکھا ہو کہ شاید ہم اپنی امیدوں کو اپنے سامنے بار آور ہوتے دیکھیں۔ سب کو چاہیے کہ ہمارے قدم بقدم ہو جائیں اور نئی زندگی کی تشکیل میں ہماری مدد کریں تاکہ آیندہ نسلوں کی زندگی آزاد اور حسین ہو جائے ۔

اگرچہ گورکی نے بالشویک کے ساتھ تعاون شروع کر دیا لیکن لینن سے ہنوز تعلقات ناشگفتہ ہی رہے تلخی کی وجہ خود گورکی کی زبانی سنیے لکھتا ہے۔

"سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک میرے اور لینن کے تعلقات میں بدمزگی سی رہی لینن ایک سیاسی آدمی تھا اور مجھے سیاست سے نفرت رہی ہے اور میں نیم مارکسی ہوں کیونکہ مجھے عوام اور کسان کی فطری دانائی میں شبہ ہے جب لینن سنہ ۱۹۱۷ء میں روس آیا اور اس نے اپنے سیاسی مقالے نشر کیے تو میں یہ سمجھا کہ لینن تعلیم یافتہ طبقہ کو کسان پر سے قربان کرنا چاہتا ہے وہ تمام تعلیم یافتہ طبقہ کو روس میں منتشر کر دینا چاہتا ہے تاکہ وہ دیہات سدھار کا کام کریں۔ روس میں تعلیم یافتہ طبقہ کم ہے اس لیے میں یہ خیال کرتا تھا کہ اگر لینن کے خیال پر عمل کیا گیا تو اس تعلیم یافتہ طبقہ کا وہی حشر ہوگا جو اس شکر کا ہوتا ہے جو نمک کی کان میں جا گرتی ہے یعنی لینن کی رائے پر کاربند ہونے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ ختم ہو جائے گا اور دیہات کی وہی ابتر حالت رہے گی۔ تعلیم یافتہ طبقہ اتنا قلیل ہے کہ کوئی مفید کام یکبارگی تمام روس میں نہیں کر سکتا۔ ماہرینِ علوم و فنون کی روح انقلابی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو دیہات کو تھوڑے ہی دنوں میں جنت بنا سکتے ہیں لیکن دشواری یہ ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے اور روس بڑا ملک ہے ماہرین اسی وقت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ تمام روس میں داخلی طور پر اتحاد ہو تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایک عظیم الشان مسئلہ حل کرنے کے لیے ہے وہ یہ کہ دیہات کی تباہی کو تنظیم میں کس طرح بدلا جائے میرے نزدیک انقلاب کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں تہذیب و تمدن پرورش پا سکیں مجھے کمیونسٹ سے اس امر میں اختلاف ہے کہ وہ تعلیم یافتہ طبقہ کو عضو معطل خیال کرتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ اب تک انقلابی تخیلات تعلیم یافتہ طبقہ ہی نے پھیلائے ہیں بالشویک بھی اسی طبقہ کا ایک جزو ہیں روس کے ناخواندہ انسانوں کا دماغ تو صرف

طاقت ہو اس کو جگانے اور راہ بتانے والا صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہو سکتا ہے۔ روسی عوام کو ایک مدت تک اس طبقہ کی رہبری کی ضرورت ہے جب تک مزدور اور تعلیم یافتہ طبقہ میں مکمل اتحادِ عمل پیدا نہ ہو جائے گا روس کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۱۸ء سے قبل جب کہ لینن پر ایک نفرت انگیز قاتلانہ حملہ کیا گیا میں اور لینن کبھی نہیں ملے۔ ملنا تو درکنار ایک دوسرے پر فاصلے سے بھی نظر نہیں پڑی۔ جب لینن کی گردن اور شانے میں گولی لگنے کا حال معلوم ہوا تو میں عیادت کے لیے گیا جس وقت میں لینن سے ملا اس وقت بھی وہ داہنا ہاتھ استعمال نہیں کر سکتا تھا اور گردن کو بھی ہلا جلا نہیں سکتا تھا۔ جب میں نے قاتلانہ حملہ پر غم و غصہ کا اظہار کیا تو وہ بادل ناخواستہ کچھ کٹے کٹے فقرے کہتا رہا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس موضوع سے اکتایا ہوا ہے تھوڑی دیر میں کہنے لگا یہ کشمکش ہے اس میں کسی پر اعتراض نہ کرنا چاہیے جد و جہد جب ہوتی ہے تو ہر انسان وہی کرتا ہے جس عمل کو وہ درست خیال کرتا ہے۔" میری ملاقات بڑی دوستانہ تھی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ لینن مجھے انھیں نظروں سے دیکھ رہا تھا جن نظروں سے ایک پیغمبر ایک مرتد کو دیکھتا ہے۔ اس کی نظروں سے بجائے غصہ کے تاسف ٹپک رہا تھا یہ میرے لیے کوئی اجنبی نگاہ نہیں تھی تین سال سے لینن مجھے اسی نگاہ سے دیکھتا ہے اور شاید جب میری میت کو قبر میں اتاریں گے تب بھی اس کی نگاہ کا طرز وہی ہوگا۔ کچھ دیر باتوں کے بعد لینن جوش میں آگیا اور کہنے لگا "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے کوئی فرد تاریخی حالات سے مستثنیٰ نہیں ہوتا جو شخص تاریخی ماحول سے بے نیاز ہے وہ انسان نہیں بلکہ وہم و گمان ہے اگر میں مان بھی لوں کہ ایسے افراد گزرے ہیں جو تاریخی حالات سے غیر متاثر رہے تب بھی میں یہ کہوں گا کہ اب زمانہ کوئی ایسا فرد نہیں ہو سکتا اور ایسے فرد کی آج کل ضرورت نہیں ہے وہ محض معطل ہوگی زمانہ ہر انسان تاریخی ماحول میں جکڑا ہوا ہے کوئی آزاد نہیں۔ گورکی تم کہتے ہو کہ میری یہ غلطی ہے کہ میں ہر شے کو چند بہت سیدھے سادے تخیلات میں تحلیل کر دیتا ہوں حالانکہ زندگی پیچ در پیچ ہے اور میری یہ سادہ خیالی تہذیب و تمدن کو تباہ کر دے گی۔ ہوں۔ ہوں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ لاکھوں وحشی جو محاذ سے معہ بندوقوں کے نراجی تخیلات لیے ادھر تہذیب و تمدن

بلے بے پروا واپس آ رہے ہیں وہ تمھاری تہذیب و تمدن [illegible] میں ہی ترقی کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ مجلس دستور ساز جس کو میں نے منسوخ کر دیا ہے ان نوجیوں کے تراجی رجحانات کو رد کر سکتی تھی۔ تم جو اتنا شور مچاتے پھرتے ہو کہ ہمارے دیہات میں مطلق تنظیم نہیں اور وہ نیا جی طرز زندگی کے شکار ہیں۔ تم کو تو یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ جب تک ان دیہاتیوں کے سامنے [illegible] جس کو وہ خود سمجھ سکیں نہ رکھا جائے گا وہ کبھی کسی دستور کو تسلیم نہ کریں گے کیونزم اور سوویٹ سادہ [illegible] ہیں اس کی سمجھ کے مطابق ہیں ان تخیلات کو وہ سمجھ لیں گے۔ گورکی! تم کہتے ہو کہ تعلیم یافتہ طبقہ اور ناخواندہ طبقہ میں اتحاد عمل ہونا چاہیے درست۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ تم تعلیم یافتہ طبقے کے کہکے ہمارے پاس آئے۔ تم کہتے ہو کہ تعلیم یافتہ طبقہ خلوص دل سے حق کی مدد کرنا چاہتا ہے اگر ایسا ہے تو وہ الگ تھلگ کیوں ہے؟ ہم سے آکر کیوں نہیں ملتا؟ ہم نے یہ عظیم الشان کام کر کے دکھایا ہے کہ روس کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دیا ہم نے دنیا کو زندگی کی نئی راہ دکھائی۔ ہم نے دنیا پر نئی حقیقت آشکارہ کی ہم نے اس صراط مستقیم کی طرف اشارہ کیا جو غلامی، غربت اور شرم سے نجات دلاتی ہے۔ اس کے بعد لینن ہنسا اور اپنی گردن کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ان خدمات کا تعلیم یافتہ طبقہ نے یہ انعام دے تو دیا۔ یہ گردن میں گولی کیا کچھ کم انعام ہے میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم یہ تو سوچو کہ اس طبقہ کا دل و دماغ دشمنی سے کس قدر پُر ہے وہ وقتی رجحانات کو بالکل نہیں سمجھتے وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ وہ خود ہماری مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ عوام تعلیم [illegible] نا واقف نہیں ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ بالشویک کے واسطے ہی سے عوام تک پہنچ سکتا ہے اگر تم بہت سے برتن (یعنی تعلیم یافتہ افراد) توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو تعلیم یافتہ طبقہ کی غلطی سے ایسا ہوتا ہے۔"

[illegible] نزدیکی لکھتا ہوں۔

[illegible] قسم کی درخواستوں سے بڑا پریشان کرتا تھا اور میں یہ محسوس کرتا تھا کہ بعض دفعہ وہ مجھے [illegible] کی نظروں سے نہیں بلکہ حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ

مجھ سے دریافت کیا۔ گورکی کیا تمھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ تم اپنا وقت لغویات میں بیکار کھو رہے ہو۔ اس پر میں نے جواب دیا لیکن جس امر کو میں حق سمجھتا ہوں کرتا ہوں۔ اس پر لینن نے اپنی گردن ہلائی اور کہا، تم پرولتاری طبقہ میں اپنی حیثیت گرا رہے ہو" میں نے جواب دیا اس وقت پرولتاری طبقہ برسرِ اقتدار ہے اور کچھ غضب ناک بھی ہے اس لیے غیر ضروری ظلم و ستم کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر تعلیم یافتہ طبقے سے کچھ مدد ملنے کی امید بھی ہوتی ہے تو وہ مفقود ہو جاتی ہے۔ اس پر لینن نے کہا، تعلیم یافتہ طبقہ بزدلی کی وجہ سے ہمارے ساتھ نہیں ہے کیونکہ اس کو یہ خطرہ ہے کہ ان کا غلط عقلی نظریہ عملی زندگی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا لیکن ہمیں اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہمارے لیے کوئی نظریہ الہامی نہیں ہے۔ ہمارے لیے ہر نظریہ ایک اوزار ہے جس طرح کاریگر کا ایک اوزار کام نہیں دیتا تو وہ دوسرے اوزار سے کام کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک نظریہ کام نہیں دیتا تو ہم اس کو بدل کر دوسرا زیادہ موزوں نظریہ اختیار کر لیتے ہیں" ان اختلافات کے باوجود مجھے یاد نہیں کہ لینن سے میں نے کسی کام کو کہا ہو اور اس نے حتی الامکان اس میں کوشش نہ کی ہو۔

لینن کو گورکی سے بہت محبت تھی جب ۱۹۱۸ء میں گورکی کا اخبار نوایا بند کرنے کا مسئلہ لینن کے سامنے پیش ہوا تو لینن نے کہا:

"ہاں ہو نہ کیا جائے نوایا کو بند ہی کرنا پڑے گا تمام ملک میں انقلاب پیدا کرنا ہے اس صورت میں نوایا کے مقالے جو صرف عیب جوئی کرتے ہیں بند ہی کرنے پڑیں گے لیکن گورکی ہم میں سے ایک ہے اس نے پرولتاری کی خدمت کر کے اپنے لیے جگہ بنا لی ہے اور آخر وہ بھی تو چھوٹے سے تعلق رکھتا ہے۔ کچھ بات نہیں اس کو جیسی قسم کے سیاسی دورے پڑتے ہیں وہ پھر ہماری پارٹی میں آ جائے گا۔"

گورکی جب کبھی پیٹروگراڈ سے ماسکو آتا تو لینن کو بہت خوشی ہوتی ایک مرتبہ گورکی ماسکو آیا تو معلوم ہوا کہ لینن سے خفیہ اس کی پچاسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے جس میں لینن کو بھی دھوکے سے بلایا جائے گا۔ گورکی بھی اس بزم میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد دھوکے سے لینن کو بھی وہاں لایا گیا جب لینن کو اس مجلس کی علت غائی معلوم

ہوئی تو بڑا چلایا اور کہنے لگا۔

"میں تمھارے سب کے نام مرکزی کمیٹی میں پیش کردوں گا اور اس کی سزا دلوادوں گا کہ تم خرافات میں اپنا قیمتی وقت ضایع کرتے پھرتے ہو"

لینن کو گورکی سے جو لگاؤ تھا اس کا اندازہ لینن کے حسب ذیل خطوط سے بخوبی لگتا ہے۔

لینن ۵ر جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کو گورکی کو لکھتا ہے۔

بھئی! تم بہت مدت سے پیٹروگریڈ میں ہی مقیم ہو۔ دیکھو ایک جگہ پڑے رہنے سے صحت پر خراب اثر پڑتا ہے۔ یہاں آنے کے لیے راضی ہو جاؤ تاکہ میں سفر کا انتظام کر دوں۔ تمھارا:۔ لینن

دوسرا خط مورخہ ۱۸ر جولائی سنہ ۱۹۱۹ء کو لکھا۔

بھئی: آرام کی خاطر یہاں آجاؤ۔ میں خود ایک دور وز کے لیے قصبہ میں چلا جاتا ہوں وہاں میں تمھارا بھی انتظام کردوں گا۔ جب تک کے لیے تم پسند کرو تمھیں میری قسم آجاؤ تار سے اطلاع دو کب آرہے ہو۔ میں تمھارے لیے ریل کے ایک پورے ڈبہ کا انتظام کردوں گا تاکہ تمھیں کسی طرح بھی تکلیف نہ ہو۔ واللہ یہ تبدیلی تمھاری صحت کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ میں تمھارے جواب کا منتظر

تمھارا:۔ لینن

پھر سنہ ۱۹۲۱ء میں گورکی کو لکھا ہے۔

الگزی ماکسیموویچ: میرا جسم تھک کر اتنا چور ہو گیا ہے کہ میں اپنی جان بچانے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا ہوں لیکن تم خون تھوکتے ہو اور کچھ علاج نہیں کرتے۔ یہ تم اپنے ساتھ بڑی بے انصافی کرتے ہو۔ تمھیں میری قسم یورپ میں کسی اچھے دار الشفا میں چلے جاؤ وہاں تندرست ہو جاؤ گے اور جتنا اب کام کرتے ہو تندرست ہوکر اس سے تگنا کر سکو گے۔ یہاں ہمارے ملک میں رہو گے تو کچھ نہ ہو سکے گا یہاں لغو باتوں اور شیخی خوری کے سوا کچھ نہیں دیکھو یہاں سے چلے جاؤ ٹھیک ہو جاؤ گے تم ضدی نہ بنو میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ یورپ چلے جاؤ۔ تمھارا:۔ لینن

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

روحِ انقلاب

"یہ تاریخی حقایق ہیں کہ اکثر ممالک و اقوام کی زندگی میں بعض موقعوں پر ایسی اچانک، فوری اور مکمل تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ جن کی وجہ سے معاشری و سیاسی نظم و نسق کی تمام بنیادیں از سر نو قایم ہوئیں۔ یہ اچانک، فوری اور مکمل تبدیلیاں تاریخ عالم میں جاوداں شہرت کی مالک ہیں اس لیے کہ ان تبدیلیوں پر دنیا کو بالعموم اور بدلنے والے ملک کو بالخصوص قدیم فرسودہ نظام کے بجائے ایک نیا نظم ملا جو ملک و قوم کے عمومی مزاج کا آئینہ دار ہوا ہے۔ یہ فوری اور مکمل تبدیلی ہی انقلاب کہلائی جاتی ہے لیکن یہ فوری اور مکمل تبدیلیاں کسی موقتی جذبات اور ہنگامی محرکات کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ انقلاب دراصل ایک پورے ضبط اور نظم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے بڑھتا، پھلتا اور پھولتا ہے اور پھر اپنے نتائج کو دنیا کے سامنے فوری اور مکمل طور پر جب پیش کر جاتا ہے تو اسے انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب دراصل مختلف منزلوں سے گزر کر پختہ ہوتا ہے اور جب غیر شعوری سے شعوری بنتا ہے تو، وہ صحیح انقلاب ہے۔ اسے عضویاتی یا حیاتی شے قرار دینے میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔

انقلاب دراصل پہلے ان دماغوں میں ذہنی پرورش پاتا ہے جو ملک و قوم کی ان بیماریوں کو دیکھتے ہیں جو معاشرہ میں سرایت کرتی جا رہی ہیں۔ یہ مفکرین ان فرسودگیوں کے خلاف اپنی داعیات عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے احساس عامہ بھی جاگ اٹھتا ہے اور جب وہ پوری طرح ان داعیات کو قبول کر لیتے ہیں اور انھیں اپنی حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ اس نظام سے ٹکرا جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ آفتوں میں مبتلا ہیں اور اس کے بدلے میں وہ ایک نیا معاشری اور سیاسی نظام اپنے لیے متعین کر لیتے اور روبعمل لاتے ہیں۔ معاشرے کی سیاسی اور معاشرتی مکمل اور فوری تبدیلیاں لمحوں یا گھنٹوں میں ظہور پذیر نہیں ہوئی ہیں بلکہ وہ مہینوں اور سالوں کی ذہنی کاوشوں اور احساس عامہ کی جستجو کا نتیجہ ہیں۔

انقلاب دراصل قوموں کی حیات کا جزو لاینفک ہے جس قوم میں انقلاب نہیں ہوتے وہ یا تو معاشرتی بیماری میں مبتلا ہے یا مردہ ہوتی جا رہی ہے اس لیے کہ ہر قوم و ملک کی زندگی میں ایسی قوتیں ہمیشہ کارفرما رہتی ہیں جو قوم کو تباہی

اور زوال کی طرف لے جاتی ہیں جب قومیں مطلق العنان شاہی، عدم مساوات، مفلسی و بیروزگاری یا غلامی کا شکار ہو جاتی ہیں تو تاریخی قوتیں خود ان مواقع پر کام کرتی ہوئی کسی شخص کی ہستی میں سمو کر درس دیتی ہیں۔ ایک نصب العین بتاتی ہیں کہ جس سے قوم پھر اپنے صحیح مقام پر پہنچے۔ ان خرابیوں اور ابتریوں کے خلاف عوام کا جذبۂ بغاوت انقلاب کی صحیح روح ہے۔ ہیگل نے خوب کہا ہے کہ "فلسفۂ انقلاب دراصل ملک کی بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کا علاج ہے۔۔۔ جو بعد میں نئی زندگی بھی قوم کو عطا کرتا ہے۔"

[illegible] چنگیز، تیمور یا سکندر اپنے وطن کی سرزمینوں سے اٹھ کر ہزاروں میلوں کو فتح کرتے ہوئے ہندوستان آ پہنچیں اور قابض ہو کر ایک نیا نظم و نسق بھی قائم کر دیں تو اسے انقلاب نہیں کہا جانا چاہیے یہ تسخیر یا جہانگیری یا جہانبانی، فتنہ و شورش جو کچھ بھی ہو لیکن اسے انقلاب سے کوئی واسطہ نہیں۔ انقلاب دراصل ملک کے بہترین تفکر کی [illegible] اس عہد کے اپنے ماحول کی صدائے بازگشت کے علاوہ ایک فلسفہ بھی ہے جس میں قوم کی تعمیر کا لائحۂ عمل ہے۔ انقلاب پہلے علمی اور عملی پیام ہے جو یہ نہیں وہ انقلاب نہیں۔

[illegible] انقلاب کے متعلق عام طور پر یہ گمان کہ وہ اپنے ساتھ قتل، خون، غارت گری اور بغاوت کو لیے ہوئے ہوتا ہے کسی طرح بھی صحیح تنقید یا جائز یقین نہیں ہے۔ دنیا میں کئی ایسے عظیم ترین انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں جن میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا ہے لیکن جنھوں نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی ہے اور اس کے ساتھ ایسے بھی انقلابات ہوئے ہیں جہاں قتل و خون کا بازار گرم رہا ہے اور یہ اس وقت ہوا ہے جبکہ انقلاب دشمن طاقت بھی اپنے عروج پر تھی۔

انقلاب کا مدعا دراصل فلاحی اور تعمیری ہے وہ دراصل ملک و قوم کی ابتریوں کو دور کرنے کے بعد ایک نئے حیات بخش نظام کی ابتدا چاہتا ہے۔ انقلاب کا آغاز دراصل ان بلند دماغوں اور حساس طبائع کی وجہ سے ہوتا ہے جو قوم کی بربادی سے متاثر ہو کر اس پر سوچتے ہیں اور اپنی تعلیمات میں اپنی فکر کو عوام تک پہنچا کر اسے ہمہ گیر [illegible] بناتے ہیں جب یہی احساس ایک مفکر کے احساس کے علاوہ ساری قوم کا احساس بن جاتا ہے تو یہی جذبہ انقلاب ہے جو علمی حدود سے گزر کر عملاً ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور ان مفکرین ہی کی بدولت پرانے نظام کے خاتمہ [illegible] نیا نظام بھی پیدا کیا جاتا ہے وہ دراصل نامیاتی حرکت ہے جو غیر شعور سے شعور اور پھر شعور عامہ بن کر ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے ایک تند اور فوری حرکت بنے ہوئے قدامت کی تخریب اور نئے نظم کی تعمیر کرتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں فرانس کا انقلاب تاریخ عالم میں جاوداں شہرت کا مالک ہے۔ اس لیے کہ اس انقلاب نے دنیا کی تہذیب اور سیاست میں حیرت انگیز تبدیلیاں کی ہیں۔ یہ فوری اور اچانک وقوع پذیر ہوا لیکن اس کی سطح کے نیچے کئی محرکات کارفرما تھے جو بہت دنوں سے پرورش پا رہے تھے شاہ فرانس کی مطلق العنانی نظام حکومت کی ابتری، عوام کی نکبت وادبار، مذہب کی کج روی نے ملک میں جمہوری زندگی کو دوبھر بنا رکھا تھا۔ اس [illegible] کیا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھیے پا بہ زنجیر ہے۔" اور صرف چند لوگ پوستوں ہی کو مسرت وانبساط کا حق ملا ہوا ہے — ساری قوم ظلم وستم سہہ رہی ہے۔ اب یہ دور زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا اور اسی لیے — حریت، آزادی اور مساوات — روسو کی یہ تعلیمات پریشان قوم کے لیے ایک دوا ثابت ہوئیں۔ وہ اپنی بیچارگی کا احساس کرنے لگے اور ان کی دبی ہوئی چنگاریاں مجسم شعلہ بننے کے لیے بیتاب ہو گئیں — روسو کے داعیات اس کے دماغ سے نکل کر ساری قوم کا شعور بن گئے اور یکایک اواخر اٹھارہویں صدی میں شاہی نظم کے خلاف عوام برسرپیکار ہو گئے۔ بسٹائل کا قیدخانہ توڑ دیا گیا بادشاہ معزول کر دیا گیا اور فوری ایک نیا سیاسی نظم اختیار کر لیا گیا اور پہلی مرتبہ جمہوری حکومت کی داغ بیل پڑی۔ حکومت کو عوام کی طرف سے عوام کی اور عوام کے لیے جائز حق سمجھا گیا۔ اس انقلاب میں ان مشکلات اور سختیوں کے علاوہ جو قوم نے سہی تھیں۔ روسو کا وہ پیام کارفرما تھا جو اس نے انسانی بے چارگی کو دیکھ کر اپنی تصانیف میں ظاہر کیا تھا اور جسے ملک و قوم نے اس وقت اپنا وظیفہ حیات قرار دے رکھا تھا فرانس کا یہ انقلاب دراصل گزشتہ اٹھارہ صدیوں کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ جہاں شاہیت کو ختم کر دیا گیا اور مملکت کو جمہوری حق سمجھا گیا۔

دنیا میں نظام جاگیری وملوکیت کی طویل زندگی نے بہت سے معاشری و سیاسی فتنے پیدا کیے تھے وہ عوام کے لیے ایک عظیم بار بنی جا رہی تھی چنانچہ اس انقلاب میں شاہی ونظام جاگیری کی بنیادیں کھوکھلی کر دی گئیں اور دنیا کو جمہوریت ملی۔ اس انقلاب میں قتل وخون کے سوا جو عظیم محرکات کارفرما ہیں وہ دراصل غور کرنے والے دماغوں، محسوس کرنے والے دلوں اور دیکھنے والی آنکھوں کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ اس انقلاب میں ایک مکمل اور مربوط پیام تھا نہ کہ تاراج اور بدنظمی کا رجحان۔

انقلاب امریکہ بھی تاریخ عالم میں اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ گو یہ انقلاب فرانس

پہلے ہوا۔ امریکہ کی نوآبادیاں انگلستان سے علیحدہ ہوکر اپنی متحدہ ریاست قایم کرنا چاہتی تھیں۔ اس انقلاب کی روح عوام کا دعوائے آزادی اور پرانے نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ لوک جیسے فلسفی نے اس انقلاب کی ذہنی تعمیر کی۔ لوک کے علاوہ مانٹسکو کے خیالات کا بھی امریکنوں پر اس انقلاب کے لیے گہرا اثر رہا ہے اگرچہ اس انقلاب کے بعد دستوری [illegible] پرانے جھولوں کو دھرایا گیا اور اس کی وجہ [illegible] تفکر میں ابھی پختگی کا نہ ہونا تھا۔

صنعتی انقلاب نے بھی ملک و قوم کی زندگی کو عالمی طور پر بدل دیا۔ مشینوں کی ایجاد نے فوری اور اچانک طور پر ملک کے معاشی نظام کو غیر متوازن کر دیا۔ مزدوروں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ آخر اس پیدائش دولت کی [illegible] سے سرمایہ دار بنتے گئے اور روسو کی بتلائی ہوئی وہ جمہوریت کمزور ہونے لگی جہاں جمہور کو ہر طرح کے حقوق حاصل تھے۔ سرمایہ داروں نے اپنے فایدہ کی خاطر مزدوروں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس طرح نظام جاگیری کے بعد اب سرمایہ داری نے دنیا پر قبضہ کر لیا اور اب ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا جو [illegible] اور سرمایہ دار کے مابین شروع ہوئی۔

صنعتی انقلاب نے غور و فکر کی راہوں میں بھی بڑی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اس سے پیشتر تفکر کی تاریخ میں روحانی فلسفہ ہی سب کچھ تھا اب مادیت کے اس دور میں معیشت بھی فلسفہ میں شریک ہوگئی اور مادی فلسفہ کا آغاز ہوا۔ اس معاشی بحران کی وجہ سے جو عدم توازن، اور قوموں کی زندگی میں جو بحران پیدا ہوگیا تھا۔ اب اس کی [illegible] کے لیے مفکرین نے سوچ بچار شروع کیا۔ ایک جرمن یہودی کارل مارکس نے پیدائش و دولت کے غیر متوازن نظام کو جانچتے ہوئے اپنی تعلیمات کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس نے کہا کہ [illegible] کام کرتا ہے اور بھوکا رہتا ہے اور سرمایہ دار آج اس کی محنت سے فایدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے ایک نئے نئی معاشرتی اور سیاسی نظم کی ضرورت ہے جو نہ صرف ان خرابیوں کا خاتمہ کرے بلکہ پیدائش اور تقسیم دولت میں ہم آہنگی اور ربط بھی پیدا کر سکے۔ [illegible] کے واجبات اشتراکی تعلیمات کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش [illegible]۔ اس کے کچھ دنوں بعد روس میں جب زار کی [illegible] الطغیان جبریت نے تمام اہل ملک کو پریشان کر [illegible] تھا تو مارکس کے پیرو یہاں ایک مکمل اور فوری تبدیلی کا خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ مارکسیت ایک مستقل

ملک بنی ہوئی روسیوں کے تحفظ کی ایک ضمانت ثابت ہوئی۔ یکایک سنہ ۱۹۱۷ء میں برسوں کی زاری لمحوں میں
بیت کے لیے ختم کر دی گئی اور اس کے نتیجے میں اشتمالی حکومت روس کا نیا نظام قرار پائی۔ انقلاب روس
نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھدی ہے۔ اب نظام جاگیری اور سرمایہ داری کے بعد مزدور اور متوسط طبقہ کے دور
کی تاریخ کے دور کا آغاز ہوا ہے۔ مارکس کا نظریہ انقلاب یہ تھا کہ ہر زمانے میں صنعتی پیدا وار کا ایک خاص طریقہ
ہوتا ہے اور اسی کے مطابق تمام معاشرتی تعلقات معین ہوتے ہیں رفتہ رفتہ پیدا وار کے طریقے اور ان معاشی
تعلقات میں جو اس کی بنیاد پر ہوتے ہیں ہم آہنگی نہیں رہتی اور معاشرتی تعلقات کو ایک نئی شکل دینے کی
کوشش کی جاتی ہے اور یہی کوشش انقلاب ہے۔

ان انقلابات کی تہہ میں جو عناصر کار فرما رہے ہیں وہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ انقلاب توڑ
پھوڑ یا بدنظمی اور افراتفری کا ایک دور ہیں بلکہ انقلاب ملک وقوم کا مسلک بنا ہوا فرسودہ نظام کی بیخ کنی اور ا
نئے نظام کی تعمیر چاہتا ہے۔ انقلاب اس امر کا شاہد ہے کہ وہ غور و فکر کی بنیادوں یا ارتقائی کیفیتوں سے گزر
ایک دماغ سے نکل کر ملک کے تمام دماغوں میں پرورش پاتا ہے وہ ایک امیاتی شئے ہے جو زندگی کی تمام کیفیتو
کا ترجمان ہے تعلیمات، داعیات اور محرکات ہی انقلاب کی بنیاد ہیں اور تعلیمات و محرکات کی تہہ میں مفکر
کی وہ آرزو اور تمنا ہے کہ وہ ایک نیا اور صحیح نظام پیدا کرسکے۔ انقلاب کے دوران میں ہنگاموں، معرکوں
قتل و غارت گری کا بڑا سبب وہ اختلافات ہیں جو مخالف انقلاب عناصر میں موجود ہیں وہ شخصیتیں جو انقلاب
کے داعیات کو قبول نہیں کرسکی ہیں وہ نئے نظام کی تاسیس پر اس سے متصادم ہو جاتی ہیں مخالف طاقتو
کا یہی وجود انقلاب کا بدنام کنندہ عنصر ہے۔

انقلاب دراصل ہر اس ستم رسیدہ اور مظلوم قوم کا جائز حق ہے جو سنبھلنا چاہتی ہے لیکن انقلاب
وقوع پذیر ہونا بھی ایک خنجر سے کم نہیں قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ کئی قومیں جو کبھی ممتاز ترین تھیں آج صرف
ان کا تذکرہ ہی باقی ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ان تاریخی قوتوں کا ساتھ دینے سے
قاصر رہیں جو اس کی حیات کے لیے ضروری تھیں۔ قوموں کا یہ زوال صرف اسی لیے ممکن ہوا کہ وہ رجعت پسند
اور فنا کن اثرات کے خلاف بغاوت نہیں کرسکیں جو قوموں کی زندگی میں زہر بن کر سرایت کر رہے تھے

ان ہی قوموں نے گرتے ہوئے بھی سنبھالا لیا ہے۔ جہاں مفکرین نے انقلاب کا غیر شعوری پیام دیا جو شعوری ہو کر مسموم اثرات کے خلاف جد وجہد کرتا ہے۔

انقلابی جذبوں کی پیدایش کے بعد انقلاب کو کامیابی تک پہنچانے کے لیے دو ضروری شرائط ہیں جو اسے منزل تک پہنچاتے ہیں پہلے تو یہ کہ انقلاب کو فوری قطعی اور مکمل ہونا چاہیئے اور اس کے ہو جانے پر ایسی ممتاز باتیں بھی چاہئیں جو بعد میں ضبط ونظم کو کامیابی کے ساتھ قایم کرسکیں اس لیے کہ انقلاب دراصل قدیم تحریکات کا خاتمہ اور نئے نظام کا جنم چاہتا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب فرانس روسو کے داعیات کا نتیجہ تھا کامیاب نہ ہوسکا چونکہ اس کے وقوع پذیر ہو جانے پر ایسی شخصیتیں موجود نہیں تھیں جو ضبط ونظم اور آئین کی تدوین کرسکتیں اس کے برعکس انقلاب روس کو لینن، ٹراٹسکی اور اسٹالن جیسی شخصیتیں نصیب ہوئیں جو انقلاب کے اصولوں میں بھی تراش خراش کرنے کے باوجود بہترین نظم ونسق اور ضبط کے خالق تھے۔ کامیاب انقلاب کے لیے اچانک، فوری اور قطعی تبدیلی ضروری ہے۔ اس لیے کہ تاخیر نراج پیدا کرنے کے قابل ہو جائے گی اسی لیے انقلاب کو فوری اور مکمل ہونا چاہیے۔ ایک نظام کے خاتمہ پر اسی لمحہ میں دوسرا نظام بھی چاہیے ورنہ اگر کوئی خلا یا فاصلہ پیدا ہو جائے تو وہ نراجیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکے گا۔ کامیاب انقلاب کے لیے قومی اتحاد اور نصب العین کی یگانگت بھی ضروری ہے قومی اتحاد کے بغیر انقلاب کا تصور ایک فریب کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا نصب العین کی مکمل یگانگت انقلاب کو قتل، خون اور غارت گری سے بچا سکتی ہے اور متصادم طاقت کا وجود نصب العین کی ہم آہنگی کی وجہ سے باقی نہیں رہتا۔

انقلاب کے داعیات دراصل ہر دور اور ہر عہد کے مزاج کا پرتو ہوتے ہیں روسو نے جمہوریت اور کارل مارکس نے اشتراکیت کو جو پیش کیا ہے وہ ان کے پرواز خیال کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ انقلاب حقیقت میں اپنے زمانے کی کیفیتوں کا عکس ہوتا ہے اور اسی لیے انقلاب کے اصول کا متعین کرنا کسی طرح سائنسی نہیں ہے۔

اس کو نراج یا عہد افرا تفری قرار دینا عقلیت سے بالکل بعید ہے اس لیے کہ انقلاب کا مقصد صرف قدیم [illegible] کو ہمیشہ کے لیے ختم کرتے ہوئے ایک نیا معاشری و سیاسی نظم قایم کرنا ہے جو تعمیری ہو

...اس کے علاوہ انقلاب کی کامیابی کے لیے انقلاب کے واقع ہوجانے پر آئین سازی کی صلاحیتیں بھی ...ل ہیں جبکہ انقلاب علمی تفکر، قومی اتحاد، ممتاز ذہانتیں اور آئین سازی کی صلاحیتوں کا طلب" ...ٹکنا ... سمجھنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

انقلاب کے بطن سے ہمیشہ ایک نیا نظم پیدا ہوا ہے جس کا مقصد تعمیری رہا ہے اور جس کا اثر ملک د... لیے اجتماعی طور پر تمام شعبہ ہائے حیات کی ترقی پر پڑا ہے اور یہی تعمیری ادوار ہیں کہ جن میں ادب او... علوم و فنون اور انسانی زندگی کی ہمہ جہتی ترقیاں ممکن ہیں ورنہ ایک غیر مطمئن معاشرے میں کسی طرح کی تر... کا تصور بھی جنون ہے۔ انقلاب ہی کی یہ برکت ہے کہ ترقی کے دیے ایک دیے سے دوسرے دیے کو جلا... رہتے ہیں اور انسانی ترقی کی تاریخ اپنا ایک تسلسل رکھتی ہے۔

میر عابد علی خاں بی۔اے (عثمانیہ)

مئے کہنہ)

جرّار لکھنوی

حسین بیگ میرزا جرّار لکھنوی - سید مظفر علی خاں آسیر لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا [illegible] فنِ سپاہ گری و نام آوری میں بسر ہوا اور باقی عمر شعر و سخن کی تکمیل میں صرف ہوئی مرنے سے پیشتر جرّار نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ کاش ان کا کلام اُستاد کی نظر سے گزر کر دیوان کی صورت میں چھپ جائے۔ چنانچہ [illegible] کے بعد اُن کے لڑکے نے مجموعہ کلام آسیر لکھنوی کی خدمت میں پیش کیا تو اُستاد نے مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے بعد ضروری تصحیح سنہ ۱۲۹۰ھ میں یہ مجموعہ طبع کرادیا۔

جرّار کے انداز بیان میں سادگی اور صفائی تو ضرور ہے لیکن وہ گرمی محسوس نہیں ہوتی جو تغزل کا تقاضا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ جرّار کی شاعری کا زیادہ تر زمانہ وہی ہے جسے بڑھاپا کہا جاتا ہے۔ بہرحال اس کے مجموعہ کے بہترین اشعار یہ ہیں:

ہے وہ دل عیاں ہو جس سے جلوہ تیری قدرت کا
خوشا وہ آنکھ جو دیکھے تماشا تیری صورت کا

مبارک حسرتِ ترکِ جہاں اہلِ تنعم کو
اُٹھا درویش جب دنیا سے خالی بوریا چھوڑا

[illegible] ہیں اپنے زہد و عبادت پہ اہلِ زُہد
یاں آسرا ہے رحمتِ پروردگار کا

غافل سمجھ کے کوچۂ اُلفت میں رکھ قدم
آغاز میں خیال کر انجام کار کا

بہلتا ہو نہ بستی میں نہ صحرا میں نہ گلشن میں
کہاں لے جائیں ہم یارب دلِ پُر اضطرار اپنا

لگا کے تکیۂ دیوار راہ میں بیٹھا
اُٹھا تو تھام کے دل تیرا ناتواں اُٹھا

[illegible] کروں گا چشمِ تصور سے رُخ کے نظارے
نہ کھولے گا جو بندِ نقاب کیا ہو گا

آیا نہ صبر ہجر میں اک دم تمام شب
گریاں بزنگِ شمع رہے ہم تمام شب

مہماں ہو جو کوئی ماہِ جبیں آج کی رات
رشکِ گردوں ہو مرے گھر کی زمیں آج کی رات

گدا وہ ہوں مری نیت میں حرصِ مال نہیں
زباں ہو منہ میں مگر لایقِ سوال نہیں

[illegible] روشن کو کوئی کیا دیکھے — نظر کو تاب تماشا سے آفتاب نہیں

[illegible] کا عشق ان آنکھوں کا دربدر رسوا — پیوں میں چھپ کے یہ وہ ساغرِ شراب نہیں

اٹھا ہے ابرِ سیہ مست کوہساروں سے — ہزار حیف کہ ساقی نہیں شراب نہیں

حریمِ دل [illegible] کی نہیں جا — یہ کعبہ وہ ہے جہاں دخلِ شیخ و شاب نہیں

کسی کو رنگ دکھایا نہ میری خوبی نے — بہارِ لالۂ صحرا و کوہسار ہوں میں

پتہ ملکِ عدم کا مجھ سے پوچھو — نشانِ نقشِ پائے رفتگاں ہوں

ہنر پنہاں ہیں عیبِ مفلسی سے — گہر ہوں خاک میں لیکن نہاں ہوں

رسائی عرش تک ہے گو بظاہر نارسا ہوں میں — غریب و بیکس و مظلوم و مضطر کی دعا ہوں میں

جہاں تو ہے وہاں میں ہوں جہاں میں ہوں وہاں تو ہے — نہ مجھ سے دور کچھ تو ہے نہ کچھ تجھ سے جدا ہوں میں

کرم لازم ہے مجھ پر رند ہوں یا پارسا ہوں میں — تمہارا ہوں بہر تقدیر اچھا یا برا ہوں میں

محیطِ عشق کا روزِ ازل سے آشنا ہوں میں — وہ قطرہ ہوں کہ دریائے حقیقت سے ملا ہوں میں

محبت جلوہ گر تیری نہیں کس خانۂ دل میں — یہ وہ لیلیٰ ہے جو خلوت نشیں ہے لاکھ محمل میں

ہم سے تو بھاگتا ہے جہنم بھی دور دور — شرم آتی ہے بہشت کی کیا آرزو کریں

کعبہ کی سمت جائیں کہ سوئے کنشت ہم — نادیدہ آشنا کی کہاں جستجو کریں

کسی نے بھی نہ اس خلوت نشیں کا کچھ پتہ پایا — ہزاروں مر گئے ٹکرا کے سر کوہ و بیاباں میں

کوہساروں سے امڈ کر جو گھٹائیں آئیں — ہجرِ ساقی میں، میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

کہیں ساقی بھی مجھ تشنہ جگر سے چھوٹ سکتا ہے — جدا ساحل سے کوئی کر نہیں سکتا ہے دریا کو

صدمۂ فرقتِ جاناں جو ستاتا ہے بہت — گاہ سمجھاتا ہوں میں دل کو کبھی دل مجھ کو

کہیں بدتر ہے لے دل خود پرستی بت پرستی سے — بڑا بت ان بتوں میں ہم بتِ پندار کو سمجھے

نہ تم پہ زور نہ دل پر ہے اختیار اس کا — گناہ گار تمہارا بڑے عذاب میں ہے

مرسلہ حبیب کیفوی

تجلیات

…وح اندوہیں ہیں تیرے بغیر
…ئے کتنی حزیں ہیں تیرے بغیر
…ہو کر نغمۂ مطرب
کوئی لذت نہیں ہے تیرے بغیر
بربطِ قلب کا ہر اک نغمہ
نالۂ آتشیں ہے تیرے بغیر
درد ہی درد ہے جدھر جائیں
دل کا درماں نہیں ہے تیرے بغیر
گریۂ غم سے ہیں نڈھال آنکھیں
غرقِ اشک آستیں ہے تیرے بغیر
آ! کہ نقشِ سجود سے محروم
میری لوحِ جبیں ہے تیرے بغیر
کیا کروں گا میں دو جہاں لے کر!
مجھ کو تسکیں نہیں ہے تیرے بغیر
آ! کہ حرماں نصیب صہبائی
اب فنا کے قریں ہے تیرے بغیر

اثر صہبائی

تنقید وتبصرہ

ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

...سا از پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد. ملنے کے پتے. سید عبدالقادر اینڈ سنس تاجران کتب چارمینار و سید عبدالرزاق تاجران کتب مصطفیٰ بازار حیدرآباد دکن قیمت ۱۲؍ کلدار، ۱۴؍ حالی، سائز ۲۶×۲۰ صفحات ۱۵۰، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ

زیر نظر کتاب پروفیسر صاحب کی اُن اٹھارہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے وقت کے اہم مسائل اور دیگر معلوماتی موضوع پر ۱۹۳۸ء سے فروری ۱۹۴۲ء تک نشر کی ہیں۔ ان تقریروں میں سیاست، مذہب، زبان، تمدن اور تاریخ ہر قسم کی معلومات کا مفید مواد موجود ہے۔

فہرست مضامین یہ ہے تاریخی اور تعلیمی فلمیں، اڈریانوپل، چین کا تمدن، قدیم ہندوستانی تمدن، زلزلہ اناطولیہ، عید میلاد، بین اقوامی سیاسیات، روزہ، ڈنمارک، ترکی، عربوں کا تمدن، عمومیت کا مستقبل، قومیت عالمی وفاق کا مسئلہ، سیاسیات اور اردو زبان، چین، ہندوستان کے موجودہ مسائل: ہر مضمون نشری پابندی کے باعث مختصر ہے لیکن جامع۔ ان نشریات کو آپ تفریحی مضامین بھی سمجھ کر پڑھیے تو بھی آپ کی معلومات میں کافی اضافہ کریں گے۔ ہر مضمون گویا ایک کوزہ ہے جس میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔

فلاح دین و دنیا:- مؤلفہ محمد عظیم صاحب، ملنے کا پتہ شیخ رحیم ولد شیخ محمود منیجر جنرل بک ڈپو شہر ...مجپور (برار) قیمت ۸؍، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

موجودہ انقلاب انگیز بحرانی دور میں جبکہ قومیں اپنی ہستی قایم رکھنے اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے جد وجہد کر رہی ہیں اور اس کا ذریعہ سماجی اور سیاسی نظام کو سمجھتی ہیں جس کی وجہ سے نئے نئے نظام دنیا کے سامنے آئے اور آئیں گے۔ مسلمانوں کا بھی حالات سے متاثر ہونا لازمی تھا انھوں نے بھی مختلف نظاموں کو ترقی کا ذریعہ بنانا چاہا۔ نتیجہ ظاہر ہے آخرکار حالات نے ثابت کر دیا اور مفکرین نے نتیجہ نکالا

مسلمانوں کی فلاح اور انسانیت کی نجات اسی قرآنی نظامِ عمل میں ہو جس نے آج سے تیرہ سو سال
پستیوں کو بلند کیا اور بہترین تمدن کی بنیاد ڈالی تھی پیشِ نظر تالیف میں مؤلف نے قرآن و احادیث
کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح اور ان کو منظم کرنے کے لیے ایک تعمیری نظامِ عمل پیش کیا
ہو۔ اس نظامِ عمل میں دفاعی بیت المال کا قیام اور اطاعتِ امیر و جماعتی تنظیم اور شعائرِ مذہبی کی پابندی
کو بنیادی حیثیت دی ہو۔ عام مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام، اصلاحِ رسوم، مشترکہ سرمایہ سے تجارت
اور جسمانی تربیت نظامِ عمل کے دوسرے اہم اجزا ہیں طریقِ کار میں بتلایا گیا ہو کہ نظامِ عمل کی تشکیل محلہ
یا حلقہ واری پنج کمیٹیوں کے ذریعہ ہو اور ان کے ماتحت مختلف شعبے قایم کیے جائیں اور ہر شعبہ کا افسر
علیحدہ ہو۔ ان تمام باتوں کے علاوہ نظام میں ایک بنیادی کمی یہ رہ گئی کہ اس کو صرف حلقوں تک ہی محدود
رکھا ہو۔ ضرورت تھی کہ اس کو پھیلا کر حلقوں سے شہروں، شہروں سے صوبوں اور صوبوں سے مرکز تک ایک
کی صورت قایم کر دی جاتی تاکہ اس میں زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا۔

یہ پروگرام تو اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی افادیت بھی اصولی طور پر اپنی جگہ مسلم ہوتی ہے
لیکن وہ شرمندۂ عمل اور کامیاب نہیں ہوتے۔ ناکامی کی وجہ عدمِ خلوص یا اس کی پشت پر سیاسی طاقت
نہ ہونا ہوتی ہو کہا جا سکتا ہو کہ پروگرام کا مقصد بھی تو حصولِ طاقت ہی ہوتا ہو۔ بہرحال دعا ہو کہ مؤلف موصوف
کی سعی مشکور ہو اور نظام پر عمل پیرا ہو کر وہ خود اور تمام مسلمان فلاح و سربلندی حاصل کریں۔

علمائے کرام کا مستقبل :۔ مرتبہ مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے۔ شایع کردہ اقبال اکیڈمی
ظفر منزل تاج پورہ لاہور۔ قیمت ۴ر، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، صفحات ۸۴، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

جدید تعلیم و تہذیب نے ہر اس قوم کو جو دنیا میں باعزت جگہ حاصل کرنا چاہتی ہو اس بات پر مجبور
کر دیا ہو کہ اپنے مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی شعائر کو دورِ جدید کے معیار پر پرکھے اور اس کے اقتضا کے
بموجب ترمیم و تنسیخ کر کے جدید سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں جو فرد
یا طبقہ رکاوٹ ڈالے اس کے خلاف ردِ عمل شروع کر دے ترکی اور ایران میں علما کی جماعت اس
انقلاب انگیز رجحان میں حائل ہوئی۔ ان کے خلاف ردِ عمل یقینی تھا اور آج ہندوستان میں جو کچھ علما کے

خلاف جذبہ پیدا ہو رہا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہو اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اس ردعمل کی ذمہ داری ایک حد تک علما پر بھی عاید ہوتی ہو۔ زیر نظر کتابچہ میں مسلمانوں کی ہر جہتی پستی کا باعث علما کے طبقہ کو قرار دیا ہو اور بنیادی سبب یہ بتایا ہو کہ انھوں نے اسلامی قانون وفقہ کو حضرات ائمہ کے بعد ترمیم سے بالاتر سمجھ کر وقت کے تقاضوں کے ہم آہنگ کرنے سے گریز کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی افادیت میں کمی آتی گئی اور رفتہ رفتہ عملی حیثیت سے مسلمان اس سے دور ہوتے چلے گئے اور اس کی اعتقادی حیثیت رہ گئی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی زوال اور معاشرتی پستی پیدا ہو گئی۔ اس ضمن میں مرتب نے علما کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہو۔ (۱) درسگاہوں کے مدرسین (۲) پیشہ ور واعظ اور (۳) پیر اور ان طبقوں کے نقصانات الگ الگ گنائے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہو کہ اسلام کو زیادہ نقصان موخرالذکر دو طبقوں سے ہی پہنچا ہو۔ اول الذکر طبقہ پر اس کی زیادہ ذمہ داری عاید نہیں ہوتی لیکن مرتب صاحب نے سب سے زیادہ ذمہ داری اسی طبقہ پر عاید کی ہو وجہ یہ بتائی ہو کہ ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلب اپنے اساتذہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ان کے ذہن جدت اور اپج سے عاری ہو جاتے ہیں۔ بعض حقایق سے مرتب نے چشم پوشی کی ہو کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس طبقہ میں ایسے افراد ہر زمانہ میں موجود رہے جو اسلام کی سربلندی کا باعث ہوئے اور کیا آج کل کے گئے گزرے وقت میں ایسے افراد کا قحط ہو؟ خیالات اور طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے ان کے وجود کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور کسی اختلافی جذبہ کے ماتحت حقایق سے چشم پوشی مستحسن نہیں۔ ممکن ہو بعض حضرات مرتب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کریں جس سے صحیح کے اسباب کے دوسرے پہلو روشنی میں آئیں۔ بہرحال کتابچہ قابل مطالعہ اور سبق آموز ہو۔

مشغلے :- از سید وقار احسن صاحب، شایع کردہ جعفری برادرس مطبع انوار احمدی الہ آباد، قیمت ۱۲ار سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۵۶، کاغذ کتابت وطباعت خاصی۔

ہندوستان میں تعلیم شروع کرنے سے پہلے یا اس کے دوران میں اگر بچوں یا ان کے والدین کے سامنے آیندہ زندگی کے متعلق کوئی متعین نصب العین نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہو تو اس میں بچوں کے رجحان اور صلاحیت کو کم دخل ہوتا ہو۔ مقصود مطلق ملازمت ہوتی ہو جس کی وجہ سے ان کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے

موقع بہت کم ملتا ہو اور چونکہ اکثر و بیشتر نوجوانوں کے رجحان کا خیال نہیں رکھا جاتا اسی لیے وہ خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکتے۔ پیش نظر کتاب بارہ مختصر معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہو جو کہانیوں کے ڈھنگ پر اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں کہ نوجوان طلبا اپنی صلاحیت اور رجحان کے حسب العین متعین کرسکیں مصنف نے سرکاری ملازمتوں کے اہم شعبہ جات کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں اور نجی کاموں مثلاً تجارت، زمینداری کے متعلق بھی معلومات فراہم کرکے توجہ دلائی ہو۔ ذیل کے عنوانات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

(۱) آئی سی ایس (۲) ایم ایل اے یا ممبران کونسل (۳) کپتان امرسنگھ یا جاز رانی کی تعلیم (۴) تجارت (۵) وکالت اور بیرسٹری (۶) ڈاکٹری (۷) انجینیری (۸) اڈیٹری (۹) استادی (۱۰) میجر سید اللہ خاں (فوجی تعلیم) (۱۱) ہوائی افسر (ہوائی جہاز کی تعلیم) (۱۲) زمینداری۔ ان تمام مضامین میں بچوں کی دلچسپی کا خاص لحاظ رکھا گیا ہو اس کے مطالعہ سے طلبا کی معلومات میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

تصویر [illegible] مصنفہ سلمان الارشد صاحب فاروقی ناشر عتیق الرحمن ذکرالرحمن تاجران کتب بازار بھوپال قیمت ۱۲؍ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۹۶ کاغذ کتابت و طباعت معمولی۔

سماج کے استبدادی قوانین کے خلاف بغاوت و نفرت کا جذبہ تیزی سے تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کے رویہ کی فرسودگی انسانیت کے مستقبل کے لیے ایک رکاوٹ ثابت ہو رہی ہو۔ اس کے بھیانک اور گھناؤنے مظالم کی نقاب کشائی ترقی پسند ادب کا ایک اہم جزو بن گئی ہو۔ نوجوان ادیب اپنے احساس کی گرمی اور امدردی سوز سے سماجی بندھنوں کو خاکستر کر دینا چاہتے ہیں۔ اور انسانیت کو سماج کے آہنی پنجہ سے چھٹکارا دلانے کے لیے ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سلمان صاحب بھی اسی صنف کے نو وارد سپوت ہیں جن کے افسانوں میں اس امدردی سوز کی جو الا بھٹ پڑنے کو بیتاب نظر آتی ہو۔ وہ اپنے افسانوں میں ہندوستانی سوسائٹی کی ان کمزوریوں کو اجاگر کرکے اصلاح کی دعوت دیتے ہیں جو بظاہر معمولی لیکن حقیقت میں بنیادی ہیں اور جن پر سماج کی استبدادیت کا قصر کھڑا ہو۔ اگر ان کمزوریوں کو دور کر دیا جائے تو سماج کے قصر استبدادیت میں زلزلہ آجائے۔ ان کے افسانوں

کی ٹھکرائی ہوئی مظلوم ہستیوں سے ہمدردی کا جذبہ اور سہارا دینے کی کوشش نمایاں ہے "دھواں" "معصیت کی پناہ میں" اور "جہاں گناہوں کا سودا ہوتا ہے" اسی جذبہ کے آئینہ دار ہیں۔ دوسرے افسانوں "پاپی"، "ردی" کے لیے، میں دوسری تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے لیکن تلخ تر حقیقت یہ ہے کہ سماج کا باغی بھی سماج کا ایک رکن ہے اور بعض اوقات وہ بھی غیر شعوری طور پر وہی کر گزرتا ہے جس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔

بعض افسانوں میں قدامت اور جدیدیت کے درمیان خطِ امتیاز قایم کرنا مشکل ہے طرزِ بیان ابھی منجھنے نہیں پایا اور بعض جگہ عریانیت آجاتی ہے بہرحال فنی پختگی آنے پر یہ کمی پوری ہوجائے گی اس نوعمر ہونہار ادیب سے مستقبل کے متعلق اچھے توقعات وابستہ کیے جا سکتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رح کی تدوین قانونِ اسلامی: از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعہ عثمانیہ شائع کردہ حیدرآباد اکاڈمی سائز ۲۰×۲۶، صفحات ۵۴، کاغذ دیسی، کتابت و طباعت خاصی، قیمت درج نہیں

اسلامی تدوینِ قانون کی بنیاد رسول اکرمؐ کی اس حدیث پر رکھی گئی جو آپ نے معاذ بن جبلؓ کو سرکاری افسر مقرر فرماتے ہوئے گفتگو فرمائی تھی جس کا ماحصل یہ ہے کہ "مقدمات کے فیصلوں میں احکام کتاب اللہ میں صراحت نہ ہونے پر سنت رسول کی پیروی اور اگر یہاں بھی صراحت نہ ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا چاہیے"۔ امام ابوحنیفہؒ نے تدوین کے وقت اسی اصول کو مدنظر رکھا اور اجتہاد میں شوریٰ، جرح اور اجماع کو ضروری سمجھا۔ زیرِ نظر مقالہ مولف موصوف نے اسی باب میں بڑی کاوش اور تحقیق سے مرتب کیا ہے جس میں تدوینِ قانون کے پس منظر میں کوفہ کے علمی ماحول اور مراکز کی اہمیت اور امام صاحب کے تحصیل علم و درس و تدریس پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے چالیس شاگرد جو علم و فضل میں معیاری درجہ رکھتے تھے اس تدوینِ قانون میں شریک کار تھے ان کے علاوہ دس افراد پر مشتمل مجلس بھی اس کام میں معاون تھی۔ امام صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ آپ ایک مسئلہ اور اپنی رائے پیش کرتے اور اس پر بحث ہوتی ہر ایک اپنے دلائل پیش کرتا یہاں تک کہ یہ بحث ایک ماہ یا زاید عرصہ تک جاری رہتی اور جب دلائل پوری طرح مستحکم اور واضح ہوجاتے اور مسئلہ خوب منقح ہوجاتا تو لکھ لیا جاتا اسی طرح باب وار ترتیب ہوئی قانون اسلام پر اعتراض ہے کہ وہ قانون روما سے ماخوذ اور یہاں تک کہ وہ اسی کی معرب شکل ہے موصوف نے اس اعتراض کا جواب بارہ مستحکم دلائل سے دیا ہے جو اپنی جگہ قطعی ہیں مختصر یہ کہ مقالہ میں تحقیق کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں ہے اہل علم کیلیے قابل مطا

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیار استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیزیں پیش کی ہے زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی۔ انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل وعطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجرانِ عطر

جنا بلڈنگ، لکھنؤ

دولت آصفیہ کی نایاب عربی مطبوعات

مطبوعہ

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن

۱۔ تاریخ کبیر:۔ رجال حدیث میں شیخ الاسلام امام بخاری رحمۃ اللہ کی سب سے قدیم اور مستند کتاب۔ مصنف نے اس کتاب کو روضۃ النبی علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے چاندنی راتوں میں مدون فرمایا ہے نادر نسخوں کے مقابلہ کے بعد چوتھی جلد کے دو حصے طبع کئے گئے ہیں۔ قیمت جلد اول (۳) روپیہ کلدار (۳) عثمانیہ۔ جلد دوم (للعہ) کلدار (للعہ) عثمانیہ۔

۲۔ کتاب الجرح والتعدیل:۔ امام حافظ ابو محمد عبدالرحمن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ کی تصنیف اس کتاب کو ائمہ فن نے مستند قرار دیا ہے اور اس میں رواۃ کے حالات کو قطعیت کیساتھ بیان کیا گیا ہے تیسری جلد کے دو حصے شائع ہوتے ہیں ان ہر دو جلدوں کی قیمت (للعہ) کلدار اور (للعہ) عثمانیہ ہے۔

۳۔ کتاب الافعال۔ علامہ ابن القطاع المتوفی ۵۱۵ھ کی لغت میں ایک اہم اور مبسوط تصنیف ہے جس میں کتاب الافعال لابن القوطیہ پر اضافہ کیا گیا ہے لسانیات کے موضوع پر سب سے مبسوط کتاب ہے۔ قیمت جلد اول (عہ) کلدار اور (عہ) عثمانیہ جلد دوم (للعہ) کلدار (للعہ) عثمانیہ جلد سوم زیر طبع ہے۔

۴۔ الاشباہ والنظائر:۔ فن نحو پر علامہ سیوطی کی مبسوط ترین تصنیف ہے جو بعد مقابلہ و تصحیح اعلیٰ معیار طباعت کیساتھ دوبارہ شائع کیگئی ہے۔ قیمت جلد اول (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد دوم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد سوم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد چہارم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ۔

رسائل علامہ شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ المتوفی ۶۳۸ھ

۱۔ کتاب الفنا فی المشاہدۃ:۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ حقیقت الٰہیہ بلند تر ہے اس امر سے کہ اس کا ان آنکھوں سے مشاہدہ کیا جائے۔ البتہ کائنات پر جو نظر مشاہد کی پڑتی ہے اس کا ایک اثر مرتب ہوتا ہے۔

۲۔ کتاب الجلال والجمال۔ اس رسالہ میں اللہ تعالےٰ کے جلال و جمال سے بحث ہے۔

۳۔ کتاب الالف وھو کتاب الاحدیۃ:۔ اس رسالہ میں اللہ تعالیٰ کی احدیت اور اسکے اسرار سے بحث ہے۔

۴۔ کتاب الجلالۃ۔ اس رسالہ میں کلمہ جلالہ (اللہ) کے اسرار اور اشارات سے بحث ہے۔

ایک تا چار کی قیمت (۱۰) کلدار (۱۲) عثمانیہ

ناظم و مددگار معتمد مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

۵۱ کشف جلد ۱ صفحہ ۳۹


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس ۳ روپے، قیمت سو گولیاں بڑا بکس دس روپے (ع۵)
"اوکاسا" ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک مینشن دہلی گیٹ دہلی

قابلِ مطالعہ کتابیں

اقبال کا مطالعہ :- از [illegible] مجموعہ میں اقبال کی شاعری، فلسفہ اور آخری ایام زندگی پر چار مضمون [illegible] ہیں جن سے علامہ کی عظمت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے
قیمت عہ مجلد ۶؍

محشرِ خیال :- سجاد علی انصاری مرحوم کے مجموعہ مضامین کا دوسرا اڈیشن۔ اس مرتبہ مرحوم کا "قدما تجدد زدہ" بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ کاغذ طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد ۲؍ ، عہ غیر مجلد ۶؍

خلافت و سلطنت :- از ڈاکٹر امیر حسن۔ بغداد کی خلافت عباسیہ سے کر تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہ اور بغداد کی تباہی تک کے مفصل حالات و نتائج۔ قیمت عہ

حیات اجمل :- حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات۔ اس میں مرحوم کے اخلاق و عادات علمی وطبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت ۶؍

مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی :- از محمد اظہر علی علوی۔ ایم۔ اے۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ کس طرح قوم مرکر زندہ ہوتی ہے۔ ترکوں کی دستوری طریقہ کی سلطنت کا بالتفصیل تذکرہ ہے۔ کہیں کہیں ان ممالک و مقامات اور غیر قوموں کا حال بھی آگیا ہے جن سے ترکوں کو سابقہ پڑا۔ قیمت غیر مجلد عہ

متاعِ اقبال :- مصنفہ ابو ظفر عبدالواحد ایم۔ اے۔ موصوف نے اقبال کی شاعری اور اس کے پس منظر، ان کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفے پر ایک اجمالی بحث کی ہے۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

جگ بیتی حصہ اول

پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب Glimpses of World History
کا سلیس ترجمہ۔ مصنف نے دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کی تاریخ سنین و سلاطین کی فہرست
اور مختلف حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال سے قطع نظر کر کے افراد کے ذہنی اور سماجی
افکار، جماعتی نظام کی تنظیم، تہذیب و تمدن کی تدوین اور علوم و فنون کی ترویج کی مختلف
زمانوں کے لحاظ سے یکجائی تصویر کھینچی ہے۔ قیمت مجلد

سیر کائنات

یہ کتاب نامور سائنس داں، سر جیمس جینس کی مشہور و معروف کتاب
Through Space & Time کا ترجمہ ہے جس میں زمین، ہوا، آسمان
ماہتاب، آفتاب، سیاروں اور ستاروں وغیرہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث
کی گئی ہے۔ طرز تحریر نہایت دلچسپ اور سادہ ہے اور ترجمہ میں اصطلاحات سے حتی الوسع
اجتناب کیا گیا ہے، اس لئے خواص کے علاوہ عوام بھی بغیر کسی دقت کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں
لیتھو کے متعدد نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ہاف ٹون کی ۲۷ تصویریں بھی
شامل ہیں۔ قیمت ع۲

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی، انڈین پریس الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اُردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اُردو اکادمی** کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمایئے۔

شعر و شاعری اور ذوقِ سلیم

شعر و شاعری اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جو آرٹ (فنکاری) کے تحت میں آتی ہیں اپنے بیشتر محاسن و معائب کی تعیین و تشخیص میں انسان کے اندر ایک ایسی قوت کی محتاج ہوتی ہیں جسے عام طور سے ذوق یا ذوقِ (TASTE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے شعبۂ شعر و شاعری میں اس کا ذکر قدم قدم پر آتا ہے شعر و شاعری کے پرکھنے والے برابر یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ شعر مذاقِ سلیم کے خلاف ہے یہ شعر ذوقِ صحیح کے موافق ہے گویا شاعرانہ کارناموں کے حسن و قبح کے سمجھانے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں صرف ذوقِ سلیم کا فیصلہ سنا دینا کافی ہے لیکن جب ہم انسانی ذوق کے فیصلوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہمیں ان میں اتنا شدید اختلاف نظر آتا ہے کہ ان پر اعتماد مشکل معلوم ہوتا ہے مختلف ملکوں اور مختلف دوروں میں ذوق کا اختلاف تو الگ رہا خود ایک ہی ملک میں ایک ہی عصر میں تعلیم و تربیت کی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ذوق کے فیصلے بدلتے رہتے ہیں سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہوتی ہے جب شعر و شاعری کا مذاق رکھنے والے اصولِ تنقید سے آگاہ ادیب اس ذوقی اختلاف کا ثبوت دیتے ہیں یگانہ دہلوی مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے ۔۔۔ کبھی رو دیے کبھی سجدے کیے خاکِ نشیمن پر

لکھنؤ یونیورسٹی کے لائق پروفیسر جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب جو خود اپنی جگہ پر ایک مانے ہوئے صاحبِ ذوق ادیب ہیں انھوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "ہماری شاعری" میں اس شعر کی کافی تعریف کی ہے لیکن اس کے برخلاف الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر جناب رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری جو خود بھی شاعر ہیں اور بعض حلقوں میں اچھے نقاد بھی شمار کیے جاتے ہیں اس شعر کو بے حد ناپسند فرماتے ہیں کئی سال ہوئے انھوں نے غزل کی حمایت کرتے ہوئے نگار میں ایک مضمون لکھا تھا سلسلۂ بحث میں اس شعر پر انھوں نے خوب خوب مذاق اڑایا تھا ذوقی اختلاف کی مثالیں شعر و شاعری کے نقد و انتقاد کی دنیا میں بہت کثرت سے مل سکتی ہیں ایسی حالت میں یہ سوال فطری طور پر ہمارے سامنے آتا ہے کہ جو چیز اس قدر ناقابلِ اعتماد ہو اس پر شعر کے حسن و قبح کی تشخیص

[illegible] محول کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہی؟

شاعری میں عدم تصویب و تغلیط کا نظریہ | ذوق کے فیصلوں کے انھیں اختلافات سے گھبرا کر بعض ارباب نظر کا [illegible] گیا ہی کہ شاعری وغیرہ میں "تصویب و تغلیط" کا عمل جاری کرنا صحیح نہیں ہی۔ شعر و شاعری کی دنیا جذباتی دنیا [illegible] ہی کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ صحیح ہی یا غلط اور چیز ہی لیکن اس کا پتہ چلانا کہ فلاں چیز جمیل ہے یا غیر جمیل [illegible] بالکل الگ چیز ہی جذبات جیسے ہیں وہ سب درست اور صحیح کیونکہ انھیں اپنے ذاتی وجود کے علاوہ کسی اور چیز کے ذاتی وجود پر محول ہونے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی۔ جذبات کا جہاں احساس ہوا ان کا حقیقی وجود ثابت ہو گیا لیکن فکر کے فیصلوں کی یہ نوعیت نہیں ہی وہ اپنے واقعی وجود میں بیرونی و خارجی حقیقتوں کے محتاج ہیں اور ضروری نہیں ہی کہ وہ اس معیار پر ٹھیک اتریں۔ اگر ایک چیز کی واقعیت اور عدم واقعیت [illegible] ہزاروں مختلف رائیں قایم کی جائیں تو ان میں بھی رائے ایک ہی اور صرف ایک ہی ہو گی دشواری جو کچھ ہے اس کی تعیین میں ہی۔ اس کے برخلاف ایک خارجی وجود مختلف دماغوں میں ہزاروں طرح کے جذبات یکساں بھی اور مختلف بھی پیدا کرتا ہی اور وہ سب کے سب واقعی ہوتے ہیں کیونکہ کوئی جذبہ اس وجود کی کسی واقعی کیفیت کی نمایندگی نہیں کرتا وہ صرف ایک خاص طرح کا تعلق ظاہر کرتا ہی جو اس خارجی وجود اور دماغی اعصاب میں پایا جاتا ہی اور اگر یہ خاص تعلق ان دونوں چیزوں میں نہ پایا جاتا تو اس جذبہ کا وجود ہی حقیقتاً نہ ہوتا۔ حسن فی نفسہٖ اشیا میں نہیں پایا جاتا وہ صرف اس دماغ میں موجود ہوتا ہی جو ان چیزوں پر غور کرتا ہی اور ہر دماغ ایک مختلف نوعیت کے حسن کا احساس کرتا ہی بہت ممکن ہی کہ ایک شخص کسی چیز میں خوبصورتی کا احساس کرے [illegible] دوسرے شخص کو اس میں بدصورتی نظر آئے ایسی حالت میں ہر شخص اپنے مخصوص مشاہدہ اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات کا پابند ہوگا دوسروں کے مشاہدہ و جذبات اپنے موافق نہیں بنا سکتا۔ کسی چیز میں واقعی حسن یا واقعی قبح کا تلاش کرنا اسی طرح بے ثمر ہی جس طرح مطعومات و مشروبات میں واقعی شیرینی یا تلخی کا دریافت کرنا جبکہ جذبات کا رنگ یہ ہی تو پھر ایسی صورت [illegible] میں اگر ایک صاحب ذوق اپنے نفسی اور تعلیمی ماحول کے لحاظ سے ایک شعری کارنامہ پر سر دھنتا ہی اور دوسرا اس پر منہ بناتا ہی تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں جو کہ ایک کے ذوق کی تصویب کریں اور دوسرے کے ذوق کی تغلیط صحیح طریق عمل یہی ہی کہ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ایک حقیقت سمجھیں اور ان کے اختلافی فیصلوں کو ان کی "ذوقی حریت"

یہ نتیجہ قرار ... خاموش ہو جائیں۔

شاعری کے محاسن و معائب کی تشخیص میں فلسفہ و حکمت کی طرف رجوع کا نظریہ

اس زمانہ کے بعض ارباب دانش و بینش جب اس فلسفہ پر جو خاموش احساس لذت کے قبیل کی چیز ہے ، راضی نہیں ہو سکے تو انہوں نے اس سے نجات کی صورت یہ نکالی کہ شعر و شاعری کو بھی اسی ترازو سے تولا جائے جس پر منطق و فلسفہ کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ ان کی ... کے فیصلے کوئی شے نہیں۔ شعر و شاعری کے تعین حسن و قبح کا معیار بھی فکر و نظر ہی کے فیصلے ہو سکتے ہیں ... شعر و شاعری کا کارنامہ ہمارے سامنے آئے تو اس کے حسن و قبح کے تجزیہ کے لیے ان خیالات و تصورات ... کر لینا ضروری ہے جو شعر کی وساطت سے ہم تک پہنچائے گئے ہیں جب وہ عقل و نظر کی محک پر ٹھیک ... جائے تو وہ بہر حال اچھا ہے خواہ ہمارے ذوق کو پسند نہ آئے اور جو شعر صحیح عقلی فیصلوں کے مطابق نہ ہو اسے ... پسندیدہ قرار دینا لازمی ہے خواہ ہمارا ذوق اس پر کتنا ہی صدمے ... مثلاً اشعار ذیل

گرد آٹے دال کا ہوتا قدم یاں درمیاں ... نی و میر و وزیر و بخشی و نواب خاں

... گے دنیا میں کیوں آدمی آدھی رات ہائے ... کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہتے میاں

سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کی

چونکہ انسانی زندگی کی دائمی حقیقتوں کے ترجمان ہیں اس لیے اصول علمی کے مطابق ہیں ایسی حالت میں انھیں پسندیدہ قرار ہی دینا چاہیے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ ہمارا آپ کا ذوق انھیں پسند کرتا ہے یا نہیں اسی طرح یہ شعر

گل ... شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا ... گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا ... کہ فرقت میں ترے آتش برستی تھی گلستاں پر

... وہ ہمارے آپ کے ذوق کو کتنے ہی پسند آئیں مگر چونکہ ان میں زندگی کی مخصوص حقیقتوں کی ترجمانی نہیں پائی جاتی ... خالص عقلی نظر سے قابل قبول قرار پائیں اس لیے ان پر خط نسخ کھینچ دینا لازمی ہے۔

شعر و شاعری کے حسن و قبح کی تشخیص کا اصلی معیار ذوق ہی ہے

موجودہ دور میں یہ نقطہ نظر اگرچہ ترقی پسند بتایا جا رہا ہے اور اس کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ تمام متاع شاعری اسی کانٹے پر تولی جائے لیکن اصل تو یہ ہے کہ شعر و شاعری کے ... پرکھنے کے لیے یہ مجوزہ عقلی معیار شعر کو مدرسے میں لے جانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

...ہوئے جوش نے بھی یہ بہت ہی پتہ کی بات کہی تھی:-

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو
کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

شاعری اور منطقی بحثیں یہ کیا قتلِ عام
بُرشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام [illegible]

کیوں اٹھا ہے جنسِ شاعر کے پرکھنے کے لیے
کیا شمیمِ سنبل و نسریں ہے چکھنے کے لیے

اے ادب نا آشنا یہ بھی نہیں تجھ کو خیال
تنگ ہے بزمِ سخن میں مدرسے کی قیل و قال

منطقی کانٹے پہ رکھتا ہے کلامِ دلپذیر
کاش اس نکتہ کو سمجھے تری طبعِ حرف گیر

شعر و شاعری کے ساتھ ان علمی مذاق کرنے والوں سے یہ پوچھنا ضروری ہے کہ آپ شعر و شاعری کی تنقید کے سلسلے میں ذوقی راستہ سے جو کترا کر نکلے ہیں وہ اسی خوف سے تو کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے یہ بہت زیادہ پُرخار ہے لیکن آپ نے اس سلسلہ میں جو عقلی راستہ اختیار کیا ہے وہ کیا ہموار اور کانٹوں سے صاف ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جس قدر اختلافات ذوقی دنیا میں موجود ہیں اسی قدر عقلی دنیا میں بھی پائے جاتے ہیں پھر ذوقی راستہ کو چھوڑ کر اس مجوزہ فکری راستہ پر چلنے سے کون سی سہولتیں حاصل ہو سکتی ہیں؟ حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ انصاف سے بتایا جائے کیا عقل و فکر کے فیصلوں میں بدرجہا اس کرنے والا اختلاف موجود نہیں ہے؟ فکر و نظر کی جولانیوں کے جتنے میدان ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسا ہے جس میں قدم قدم پر اختلافات کا طوفان موجود نہ ہو۔ الٰہیات، عمرانیات، سیاسیات، اخلاقیات وغیرہ وغیرہ ان میں سے کونسا شعبہ ہے جس میں "جنگ ہفتاد و دو ملت" کا تماشہ نظر نہیں آتا یا فکر و نظر ہی کے کھیل کھیلنے والوں میں بہت سے کعبۂ مذہب کے آستانہ پر سجدہ ریز ہونا ہی عقل و دانش کا جوہر سمجھتے ہیں لیکن ان کے برخلاف دوسرے میخانۂ لامذہبیت میں صراحی در بغل رہنا ہی نشانِ ہوشمندی قرار دیتے ہیں۔ اب اگر پہلی قسم کے فکر و نظر والے اپنے شعر و شاعری میں سجدہ و سجادہ کے محور پر نیازمندانہ چکر لگاتے رہیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی نا کہ جب یہ مقدس ذخیرہ ایسے شخص کے سامنے آئے گا جو مذہب و مذہبیات کو مجموعۂ اوہام قرار دیتا ہے تو یہ شخص اس عقیدتمندانہ شاعری کو توہمات و خرافات کا ذخیرہ قرار دے گا اور اپنے عقلی رجحانات کے ماتحت اس سرمایہ کو متاع کاسد بتائے گا اسی طرح جب یہ منکرینِ مذہب اپنی شاعری کو الحاد و زندقہ کے لباس میں دنیا کے سامنے لائیں گے اور اس پر اُن افراد کی نگاہ پڑے گی جو مذہب و مذہبیات ہی کو زندگی کی اصل کائنات سمجھتے ہیں تو یہ مذہبی گروہ اپنے عقلی فیصلے ملحوظ رکھتے

ہوئے مذکورۂ بالا نقطۂ نظر کے ماتحت اسے قابلِ نفرت ٹھیرائیں گے یہی کشمکش ہر جگہ نظر آئے گی ایک اشتراکی مارکس و اینجلز کے دماغوں کی کشیدکی ہوئی نظریاتی شراب کو حاصلِ حیات سمجھتے ہوئے شاعری کے ساغر میں اسی آتشِ سیال کی تیزی دیکھنا چاہے گا اور فسطائیت و نازیت کے ابوالہول کا ایک پرستار جو مارکسی میکدہ کے جام و مینا کا توڑ ڈالنا ہی انسانی فلاح و بہبود کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ شاعری میں اشتراکی نرستیوں کی جھلک کو، دبی گستاپو کے احتسابی عمل کے لیے دعوت بتائے گا۔ ایسی حالت میں عقلی فیصلوں کی بھی وہی نوعیت رہی جو مذاقِ سلیم کی تھی۔ تشکیک کا عمل یکساں طور سے دونوں جگہ جاری ہو سکتا ہے۔ اب یہ بتایا جائے کہ شاعری کے خرمنِ گل کو عقل و نظر کی بجلیوں کا نشیمن بنانے اور اس رنگ و بو کی تباہی کا تہیہ کر لینے سے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ وہ دشواری تو دور نہ ہوئی جس سے بچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا گیا تھا۔

ذوق کی تعیین ان دونوں خیالوں سے ہٹ کر اس سلسلہ میں ایک تیسرا خیال یہ ہے کہ ذوق کے فیصلے اگرچہ باہم بےحد اختلاف رکھتے ہیں تاہم نفسِ شعر کے محاسن کی تعیین و تشخیص کے لیے ہمیں اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے اور اس فنِ لطیف کی نزاکتوں کو اسی کی ترازو پر تولا جا سکتا ہے۔

اس کا غالباً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی نفسیاتی دنیا میں ایک ایسی قوت ایک ایسی طاقت بہرحال ہے جو فنونِ لطیفہ کے حسن و قبح کے متعلق اپنا فیصلہ نافذ کرتی ہے یہ قوت اپنے نشو و نما کے لحاظ سے اگر طفولیت کی حدوں میں ہوتی ہے تو اس کے محسوسات اور ہوتے ہیں لیکن جب اسے نشو و نما حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا رنگ برابر نکھرتا جاتا ہے جب تک کہ انسان کا موجودہ ڈھانچہ اور اس ڈھانچہ کی تمام مادی و نفسی خصوصیتیں بدلتی ہیں یہ قوت یہ طاقت برابر کارفرما رہے گی اور اس کے فیصلوں کا ماننا بھی ان تمام اختلافات کے باوجود لازمی ہی سا ہوگا۔

اخلاقیات کی دنیا میں افعال کے اچھے اور برے ہونے کا فیصلہ جس طرح ضمیر کے حوالہ ہے باوجودیکہ ضمیر کے فیصلوں میں بھی برابر اختلافات ملتے ہیں، اسی طرح فنونِ لطیفہ کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ بھی ذوق ہی کے متعلق رہے گا گو اس میں بھی اختلافات قدم قدم پر ملیں گے۔ ان اختلافات سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان تمام ظاہری اختلافات کے باوجود بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں ذوق کے یہ عام

اختلافات مٹ جاتے ہیں اور اس کے فیصلوں میں یکرنگی کا کیف پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہاں شاید پھر وہی آواز کانوں میں آئے اور ہمیں سنایا جائے کہ حسن فی نفسہ اشیا میں نہیں پایا جاتا وہ صرف اس دماغ میں موجود ہوتا ہے جو ان پر غور کرتا ہے اور ہر دماغ ایک مختلف نوعیت کے حسن کا احساس کرتا ہے اور پھر ذوق بھی جبکہ وہ دماغ و دل کے شعور حسن ہی کا ایک اسلوب ہے کیونکر اپنے فیصلوں میں یکرنگی کا کیف رکھ سکتا ہے اور کیا وجہ ہے کہ ان تمام مختلف فیصلوں کو حقیقت و اصلیت کا ترجمان نہ سمجھا جائے؟

اس کے جواب میں گزارش کی جائے گی کہ بظاہر اس عقدہ لاینحل کے حل کرنے کے لیے فہم سلیم کے ناخنوں سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ ڈیوڈ ہیوم جو فلسفہ تشکیک کے امام کہے جاتے ہیں اس نے بھی اپنے مضمون "ذوق کا معیار" میں بھی یہی راستہ اختیار کیا ہے اور کم سے کم اس بحث میں اس نے اپنے مذاق تشکیک کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ راقم الحروف نے اسی سے استفادہ کرتے ہوئے کسی زمانہ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس جگہ اس کا اقتباس فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

"کیا اگر کوئی شخص داغ و مضطر کی متاع سخن کا درجہ غالب و میر کے معجزات شعریہ سے اونچا قرار دے تو کیا اس کی یہ رائے سنجیدگی سے سنی جا سکتی ہے؟ راجپوتانہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو کوہ ہمالیہ سے اونچا قرار دینا دریائے جمن کو سمندر سے وسیع بتانا، کسی چھوٹے شہر کو لندن و پیرس سے شاندار سمجھ لینا جو حیثیت رکھتا ہے وہی ان غیر متوازن فیصلوں کی ہے۔ اگر دو شخصوں کے ادبی کمالات میں انیس بیس کا فرق ہو تو رایوں کا یہ اختلاف قابل حیرت نہیں یقیناً تیرھویں اور چودھویں کے چاند میں فرق کا احساس تو بصر کی خاص آزمایش ہے لیکن اگر ان کے ادبی کمالات میں ایک اور بیس کی نسبت ہے تو یہ اختلاف رائے قابل صد تعجب ہے جس طرح کہ راجپوتانہ کی پہاڑیوں کو ہمالیہ سے اونچا قرار دینے والا لازماً کسی آنکھ کی بیماری کا مریض قرار دیا جائے گا اسی طرح وہ بھی کسی ذوقی آزار کا مبتلا سمجھ لیا جائیگا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض بیماریاں ذائقہ میں تغیر پیدا کر دیتی ہیں مزاج میں جب صفرا کی تلخی پیدا ہو جاتی ہے تو مریض میٹھی چیزوں کو تلخ محسوس کرتا ہے تو کیا ایسے بیمار کا ذائقہ اشیا کی تلخی و شیرینی جانچنے کے لیے معیار ہو سکتا ہے یہی کیفیت انسان کے اس ذوقی حاسہ میں بھی پیدا ہو سکتی ہے جس سے ادب کی حلاوتوں

کا احساس کیا جاتا ہو بہت ممکن ہو کہ اس کے ذوقی حاسہ پر غیر شاعرانہ رجحانات کا عنصر غالب ہو جائے اور وہ شعر و ادب کی شیرینی کا احساس نہ کر سکے داغ کو غالب سے بڑھا دے، حالی و نظیر کو خدائے سخن میر پر ترجیح دیدے تو ایسی حالت میں کیا اس کی رائے پر جو ذوقی بیماری کا نتیجہ ہو کوئی [illegible] کیا جا سکتا ہے ؟

اگر یہ نظریہ کہ فی نفسہٖ کسی چیز میں حلاوت و تلخی اور خوبصورتی و بدصورتی کا وجود نہیں ہوتا بلکہ ادراک کرنے والے حاسہ کی مخصوص ساخت سے یہ نتائج اخذ کیے جاتے ہیں بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے تب بھی ہمارے مقصد میں کوئی خلل نہیں پیدا ہوتا مانا کہ حلوے میں شیرینی کا وجود ذاتی طور سے نہیں ہو لیکن اس کا اعتراف تو ناگزیر ہو کہ احساس کرنے والے ذائقہ اور اس چیزوں ایسے تعلقات ضرور ہیں جن کی وجہ سے ذائقہ کو ایک خاص قسم کے مزہ کا احساس ہوتا ہو اگر یہ نہیں تسلیم کیا جائے گا تو پھر اس کی توجیہ کیا ہوگی کہ وہی ذائقہ دوسری چیز میں تلخی محسوس کرتا ہو اس فرق کی آخر کوئی وجہ تو ہونا ہی چاہیے حسن و جمال اور بدصورتی کے احساس کی بھی یہی نوعیت ہو چاندنی رات میں چھٹکے ہوئے تارے چنبیلی اور جوہی کے نازک نازک پھول آنکھوں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے مقابل میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ٹوٹے پھوٹے ٹھیکروں کا انبار میلے کچیلے چیتھڑوں کی پوٹ حاسہ بینائی کے لیے نہایت تکلیف دہ چیزیں ہیں فلسفہ کی یہ موشگافی تسلیم ان موجودات خارجیہ میں فی نفسہٖ کوئی حسن ذاتی نہیں اس کا احساس تامتر ہماری دماغی کیفیت کا نتیجہ ہو آخر اس کی بھی کوئی توجیہ ہونا چاہیے کہ ہماری بصارتیں پہلی قسم کے مناظر کو کیوں حسین قرار دیتی ہیں اور دوسری قسم کے مناظر کو کیوں غیر حسین ؟ حاسہ میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا آنکھیں وہی ہیں دیکھنے والا وہی ہو حقایق خارجیہ سادہ ورق قرار دیدئے گئے جن پر نہ تو کوئی زیبائی کا نقش ہو نہ غیر زیبائی کا پھر آخر یہ تفرقہ آیا کہاں سے ؟ ایک میں حسن کی رعنائی نگاہوں کو کہاں سے نظر آئی اور دوسرے میں بدصورتی کے نقشے کہاں سے آ گئے ؟ ہمیں کہنا پڑے گا کہ یہیں کہیں ایسی کیفیتیں ضرور موجود ہیں جن سے تفرقہ پیدا ہوا پہلی چیزیں زیبائی کی تصویریں بن کر نگاہوں میں سما گئیں اور دوسری بدنمائی کا مرقع بن کر۔

انھیں دو محسوس مثالوں پر ادبیات کا بھی قیاس کیا جا سکتا ہو بعض ادبی و شعری جواہر ہمارے دل و دماغ کو اپنی روشنی سے منور بنا دیتے ہیں بعض سرے سے کوئی ضو ہی نہیں رکھتے جب ہم غالب کا یہ شعر؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

پڑھتے ہیں تو ذوق کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب جاتا ہے روح پر ایک عجیب وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ہم بلا تکلف اسے ادبی حسن و جمال کا بہترین نمونہ قرار دے دیتے ہیں لیکن جب اس کے مقابلہ میں کسی شاعر کا یہ شعر

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

پڑھ دیا جاتا ہے تو ذوق پر غثیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ روح کو تشنج کی کیفیتیں محسوس ہونے لگتی ہیں اور ہم اسے اردو شاعری کے ناصیۂ جمال کا داغ بتا دیتے ہیں۔

چہرۂ ادب و شاعری ذاتی حیثیت سے جمیل و غیر جمیل بن سکنے کا مستحق نہ سہی۔ مانا کہ فی نفسہٖ اس میں زشتی یا خوبی موجود نہیں لیکن اس میں کچھ تو ایسی کیفیتیں ہونا چاہییں جن سے ہمارے ادبی ذوق کو بعض میں متاعِ نشاط ملتی ہے اور بعض میں نہیں پہلے شعر پر ہم سر دھننے لگتے ہیں اور دوسرے شعر پر منہ بنانے "

مذکورۂ بالا عبارت میں جو بحث کی گئی ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہستی کی دنیا میں کوئی ایسی قوت بہرحال ہے جو ان کیفیتوں کے پیش نظر ہونے پر "عمل اختیار و ترجیح" سے کام لیتی ہے جو عقل کے دائرہ حکومت سے باہر ہیں اسی قوت سے متعلق شعر وغیرہ کی "تحسین و تقبیح" کا کام ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر اعتماد نہ کیا جائے جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس قوت کے فیصلوں میں یکسانی کم ملتی ہے لیکن یہ بات پریشانی اور بد دلی کی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ عملی طور سے ادبی محاسن کی تعیین و تشخیص آسان نہیں ہے اور اس کا فیصلہ کرنا کہ آیا فلاں نظم میں سادگی و شیرینی فلاں نظم سے زیادہ ہے یا نہیں اچھا خاصا دشوار کام ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان کے درجات میں فرق بہت ہی کم ہو۔ اس دشواری میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ اس حقیقت پر بھی نظر رکھی جائے کہ عمر کی زیادتی و کمی، مروجہ انفرادی و اجتماعی رجحانات ادبی و شعری ماحول کی تخلیق میں خاص اثر رکھتے ہیں تاہم اس کے یہ معنی قطعی نہیں ہو سکتے کہ ادبیات میں محاسن و معائب کی تعیین و تشخیص میں ذوق بالکل ہی بے بس ہے۔ تجربہ سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے عام افراد میں بنیادی جذبات کے احساس کا جہاں تک تعلق ہے یک رنگی کی شان پائی جاتی ہے کیا کوئی ایسا صحیح الاحساس انسان ہے جو گلاب کے پھولوں کا کھلا ہوا تختہ یا چاندنی میں صاف و شفاف لہریں مارتے ہوئے دریا کی روانی دیکھ کر فرحت و انبساط کے جذبہ کا احساس نہیں کرتا؟

ہ بھی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر کوئی ادبی کارنامہ جو اپنی ذات کے لحاظ سے محاسن شعریہ رکھتا ہو انسانی پسندیدگی اپنی طرف جذب نہ کرے۔ ان افراد کا ذکر نہیں جنھیں "احساسی اور جذبی بیماریاں" لاحق ہیں کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ خوانۂ شعر و شاعری کے بعض لعل و گہر ہر زمانہ اور ہر قوم میں ضو دیتے نظر آتے ہیں۔ زمانہ کی مختلف گردشوں سیاسی و اقتصادی انقلابوں اور ملکوں کے جغرافیائی اختلافوں سے ان کی ضیا ماند نہیں پڑتی۔ ان کے مطالعہ سے جس طرح ہمارے اسلاف کے احساساتِ لطیفہ کی دنیا میں بیداری پیدا ہو جاتی تھی اسی طرح ہمارے عالم جذبات میں افکار و خیالات کی نئی کروٹوں کے بعد بھی زندگی کے آثار رونما ہو جاتے ہیں انھیں پڑھ کر اگر مغرب کے سفید فام باشندے مخصوص لطائف محسوس کرتے ہیں تو کم و بیش اسی طرح مشرق کے سیہ فام باشندے بھی شیکسپیر کے ڈرامے جس طرح پہلے دنیا کی نگاہوں میں ادب کے گوہر شاہوار تھے تو آج بھی باوجودیکہ دنیا کا معاشرتی و تمدنی اور اقتصادی ماحول بدل چکا ہے انھیں سر آنکھوں پر جگہ دی جا رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ فلسفہ اشتراکیت کے موسس اعظم مارکس کے حلقہ بگوش بھی شیکسپیر کے ڈراموں کی تعریف و توصیف میں تر زبان ہیں۔ کالیداس کی شکنتلا، فردوسی کا شاہنامہ، انیس کے مرثیے آج بھی ہر بزم و رزم کی زینت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان ادبی شاہکاروں کی یہ عالمگیر مقبولیت، ان کا لقائے دوام کا مالک ہونا آخر کس بات کو ثابت کرتا ہے؟ اسی بات کو نا کہ شعر و شاعری کے پرکھنے کے لیے ذوق سلیم کو معیار بنایا جا سکتا ہے اور لطافتوں کی اس متاعِ بے بہا کو اسی نازک میزان پر تولا جا سکتا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف تعصب عارضی طور سے ادبی معجزوں کی شاعرانہ رفعتوں پر پردہ ڈال دیں۔ معاصرانہ چشمکیں مذہبی رقابتیں، مخصوص سیاسی و اقتصادی تحریکوں سے وابستگیاں ذوق کے فیصلے صاف نہ رہنے دیں لیکن یہ صورتِ حال بقا پذیر نہیں ہے۔ بہت جلد یہ پردے ہٹ جاتے ہیں۔ معاصرانہ چشمکیں مذہبی رقابتیں اور سیاسی و اقتصادی تحریکوں سے ہماری وابستگیاں آغوشِ عدم میں سو جاتی ہیں اور پھر ادبی کمالات کی قد آدم تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

ذوق کو باقاعدہ نشوونما دینے کی ضرورت مگر ان باتوں کے ساتھ یہ امر یقینی ہے کہ ذوق اس وقت تک اپنے فرائض ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا نشوونما باقاعدہ طور سے نہ ہو۔ اس کی اچھی طرح جلا نہ کی جائے اور اس کے جوہر نہ ابھاریں جائیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ٹکسالی ادب و شعر کے علمی مطالعہ سے دل و دماغ کی آنکھیں باقاعدہ روشن رکھی جائیں صحیح طریقوں پر مسلسل مطالعہ کی عادت سے ذوقی حاسہ میں سست نظری و سست عملی باقی نہیں رہتی۔ شعر و شاعری کے مسلمہ کارناموں کا تواتر

مطالعہ ذوقی بیماریوں کا، اصد درماں ہی نہیں ہے بلکہ حقیقت میں صحتِ مذاق کا باقی رکھنے والا اور اس کے جوہروں کو حیرت انگیز حد تک چمکا دینے والا بھی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ذوقی حاسہ نظری حیثیت سے کتنا ہی صحیح اور لطافتِ احساس و لطافتِ ادراک کا مالک ہو تاہم جب تک کہ اس کی چلا تکرار مطالعہ سے نہیں کرلی جائے گی ادبی جمال کے باریک نقش و نگار کا اندازہ مشکل ہے۔ چہرۂ شاعری کے تمام حسین خدوخال ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر اسی وقت نظر آسکتے ہیں جب کہ ادبی سرمایہ کا جائزہ پیہم اور نہایت توجہ سے لیا جائے۔ مسلم الثبوت شاہکاروں کا مطالعہ ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ کر بکرات و مرات کیا جائے اور دوسری تصنیفات ادبیہ بھی پیش نظر رکھی جائیں۔ وہ شخص جس کی قوتِ شامہ ماؤف نہیں ہے اور پھر اس نے مختلف تیز اور ہلکی خوشبوئیں بکثرت سونگھی ہیں عطریات کے باریک سے باریک محاسن و معائب مطلع ہو سکتا ہے اور ان کے باہمی درجے معین کر سکتا ہے ممکن ہے کہ مشق و مزاولت سے یہ حد بھی حاصل ہو جائے کہ وہ یہ بتا سکے ترتیب کے سایہ میں کس عطر کو کشید کیا گیا ہے اور کسے چنبیلی یا گلاب کے درخت کے نیچے لیکن جس شخص کو زیادہ خوشبوئیں سونگھنے کا موقع نہیں ملا ہے وہ شامہ کی صحت کی حالت میں خوشبوؤں کا احساس تو کرسکے گا، اور انھیں سونگھ کر فرحت بھی حاصل کرلے گا لیکن اس کی نازک لطافتیں اس کے احساس میں نہیں آسکتیں وہ ان کی خوبیوں اور عیبوں کا حکیمانہ تجزیہ نہیں کر سکتا۔ ایک خوشنما تصویر دیکھ کر ہم اس کی عمدگی کے متعلق عام رائے ظاہر کر سکتے ہیں لیکن ان باریک خط و خال کے متعلق جو درحقیقت ان کے حسن کا سرمایہ ہیں ہم وثوق کے ساتھ کوئی رائے نہیں دے سکتے لیکن اگر کہیں ہم نے اس قسم کی تصویریں کثرت سے دیکھی ہیں اور ان کا مطالعہ ہر پہلو سے کیا ہے تو پھر ہماری نظر اس کی تمام خوبیوں پر فوراً دوڑ جائیں گی۔

بعینہٖ یہی حالت ذوقی حاسہ کی بھی ہے اگر اُسے کثرت سے ایسی چیزیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اس نے ادبی جواہر پرکھنے کی نظر پیدا کرلی ہے تو پھر اس کی نگاہوں سے کوئی باریک معنی چھپ نہیں سکتے اگر ذوقی حاسہ مشق و مہارت کی اس خراد پر اتر جائے تو پھر اس میں بہت کچھ یکسانی و یکرنگی پیدا ہو سکتی ہے اور اس کا ایک معیار بن سکتا ہے جس پر کسے جانے کے بعد شعر کی اقدار معین ہو سکتی ہیں بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک صاحبِ ذوقِ شعر و شاعری کے کسی نمونے پر موافق یا مخالف رائے ظاہر کرتا ہے لیکن جب کسی دوسرے صاحبِ طبع و نقاد ادیب کی طرف سے اس کے بعض مخصوص پہلو نگاہ کے سامنے لائے جاتے ہیں تو رائے میں تغیر ہو جاتا ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے اختلافات

نتیجہ ہوتے ہیں علم معانی و بیان وغیرہ سے بے خبری کا۔ اگر ان فنونِ ادبیہ کے نکتوں کو متعلقہ مقامات پر پیش نظر رکھا جائے تب بھی اختلافات کی وسعتیں بہت کچھ کم ہو سکتی ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ جس طرح سے ہم نے مادی دنیا میں ان چیزوں کو حسین قرار دے لیا ہے جو ایک غیر معلوم زمانہ سے اب تک برابر انسانی باصرہ کو اس عنوان سے متاثر کرتی رہی ہیں کہ ان کے نتیجہ میں جذباتِ پسندیدگی کا ظہور ہو جاتا ہے اسی طرح تجربہ و مشاہدہ نے ادبی شعری محاسن کی بھی اسی عنوان سے تعیین و تشخیص کی ہے۔ علم معانی و بیان وغیرہ کے جو بنیادی مسائل سالہا سال کے تجربہ سے ایسے نظر آئے جن سے انسانوں کی بہت بڑی تعداد کے جذباتِ پسندیدگی کی تحریک ہوتی ہے انہیں عارضِ شعر و ادب کا غازہ سمجھا گیا اور جائز سمجھا گیا نادر تشبیہوں اور اچھوتے استعاروں کے معتدل استعمال سے کون سا ذوق لذت یاب نہیں ہوتا ترقی پسند شعرا میں جو شاعر سب سے اونچی صف میں ہے اس کی شاعری کی لطافتیں بہت کچھ انہیں تشبیہوں اور استعاروں کی ممنون ہیں۔ یہ مانا جا سکتا ہے کہ ان مسائل کے جزئیات پر منطبق کرنے میں دقتیں ہیں لیکن یہ دقتیں ایسی نہیں ہیں جو ذوق کی طرف سے ہمیں مایوس کر دیں اور مزاولت و ممارست سے یہ دور نہ ہو جائیں۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم شعری محاسن کی تعیین و تشخیص میں ذوق کی طرف رجوع نہ کریں اور اس سے ان امور کا فیصلہ حاصل نہ کریں لیکن غیر تربیت یافتہ عوامی ذوق اس میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ صحیح راستوں پر تربیت یافتہ ذوق یعنی ذوقِ سلیم ہی ان معاملات میں معتبر و مستند ہو سکتا ہے۔ اس طرح بہت سے کانٹے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں [illegible] چل کر جب صحیح راستے زیادہ واضح ہوں گے تو اس ذوقی چپقلش کے بقیہ آثار بھی ختم ہو جائیں گے لیکن ہمیں [illegible] امید رکھنی چاہیے جس طرح ہمیں عقلی احکام کے متعلق توقع ہے کہ دانش و خرد کا صحیح راستوں پر ارتقا [illegible] کو ختم کر دے گا لیکن جیسے یہ بالکل ہی بد حواسی کی بات ہوگی کہ ذائقہ کے فیصلوں سے غیر مطمئن ہو کر یہ کام [illegible] سے سپرد کر دیں یا باصرہ کے فیصلوں کے اختلافات سے تنگ آ کر اس کا کام سامعہ کے حوالہ کر دیں اسی طرح [illegible] بد حواسی نہ ہوگی کہ ذوق کے متعلقات کو دوسری قوت کے حوالہ کر دیں۔

سید اختر علی تلہری

صوبۂ متحدہ کی صنعتیں

ستمبر ۱۹۴۲ء کے "بے۔ کے" ریویو میں مسٹر آر مینزر منیجنگ ڈائرکٹر برٹش انڈیا کارپوریشن کا ایک مضمون شایع ہوا تھا ذیل کا مضمون اسی مضمون سے ضروری اضافہ اور ترمیم کے بعد تیار کیا گیا ہے۔

بالائی ہند کے اس حصہ کا نام صوبجات متحدہ ہے جو شمال میں تبت، شمال مشرق میں نیپال، مشرق میں بہار، جنوب میں ہندوستانی ریاستوں اور مغرب میں ریاستوں کے علاوہ صوبہ پنجاب اور دہلی سے گھرا ہوا ہے اس کا رقبہ ۱۰۶,۲۴۸ مربع میل ہے۔ دیسی ریاستوں کا ۵,۹۴۳ مربع میل الگ ہے۔ اس طرح پورے صوبہ کا رقبہ ۱۱۲,۱۹۱ مربع میل ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے اس کی آبادی ۵,۶۳,۴۶,۴۵۶ ہوتی ہے جس میں گزشتہ عشرہ کے لحاظ سے ستر لاکھ کا اضافہ ہوا ہے پہلے یہ صوبے شمالی مغربی صوبوں کے نام سے موسوم تھے سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ صوبجات متحدہ آف آگرہ و اودھ کہلائے اور سنہ ۱۹۳۵ء کے نئے قانون کی رو سے ان کا نام صوبجات متحدہ ہو گیا۔

جغرافی اعتبار سے ملک کا یہ حصہ چار مختلف النوع ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ پہلا ہمالیہ کا حصہ ہے جس میں کمایوں کا ضلع بھی شامل ہے۔ دوسرا ہمالیہ کا زیریں حصہ ہے۔ تیسرا گنگا کا میدان ہے اور چوتھا وسط ہند کی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ میدانی علاقے میں نہروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن سے عموماً ہر سال اور خصوصاً خشک سالی کے زمانہ میں بڑی مدد لی جاتی ہے۔ اول الذکر دونوں علاقے غیر زرخیز ہیں اس لیے یہاں کی آبادی بھی بہت کم ہے۔ وسط ہند کے پلیٹو کا بھی یہی حال ہے۔ مگر یہاں آبادی کی گنجائی بہ نسبت پہلے دونوں حصوں کے کچھ زیادہ ہے گنگا کی میدان سب سے زیادہ زرخیز علاقہ ہے اور یہیں سب سے زیادہ آبادی کی کثرت ہے۔ اس علاقے میں ۵۵۰ سے ۷۵۰ افراد تک فی مربع میل آباد ہیں۔ اور اس طرح گنجانیت کے اعتبار سے اس صوبہ کا نمبر بنگال اور دہلی کے بعد رہتا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح اس صوبے کی خاص صنعت بھی زراعت ہی ہے تقریباً

- فی صدی آبادی کا واحد ذریعہ آمدنی ہے اس کے علاوہ مزید ۸ یا ۹ فی صد آبادی ضمنی طریقہ پر اس صنعت میں مشغول ہے البتہ اب چند سالوں سے صوبے میں صنعت و حرفت میں ترقی ہو رہی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ زرعی مزدوروں کی بڑی تعداد کھیتوں اور دیہاتوں کو چھوڑ چھوڑ کر کارخانوں اور شہروں میں منتقل ہو رہی ہے

معدنیات کے اعتبار سے صوبہ متحدہ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہمالیہ کے علاقوں میں لوہے کی کچھ کانیں ہیں مگر اخراجات کی غیر معمولی زیادتی اور بعض دوسری دشواریوں کی بنا پر اب ان کو بند کر دیا گیا ہے بعض دریاؤں کے پہاڑی حصوں میں ریت کے دھونے سے سونا دستیاب ہوتا ہے مگر اس کی مقدار بہت ہی کم ہوتی ہے ضلع اناوہ اور ہمالیہ کے علاقے میں چونے کے پتھر پائے جاتے ہیں اور ضلع مرزاپور میں سنگ تراشی کی صنعت کچھ ترقی کر رہی ہے۔

صوبے کے تمام مغربی اضلاع میں روئی کی کتائی گھریلو صنعتوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اکثر اضلاع میں دستی کرگھوں کے ذریعہ بُنائی کا کام بھی کیا جاتا ہے سال ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے تقریباً ۵ ہزار آدمی روئی کی کتائی، صفائی اور اوٹنے کی صنعت میں مصروف تھے اور تقریباً چار لاکھ افراد کپڑا بننے کی صنعت میں کام کرتے تھے سال ۱۹۴۱ء کے اعداد تو موجود نہیں مگر عام حالات میں یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ اب ان دونوں صنعتوں میں پہلے سے زیادہ افراد مشغول ہیں۔

جہاں تک منظم مصنوعات کا تعلق ہے کانپور صوبہ متحدہ کا صنعتی دارالخلافہ کہا جا سکتا ہے یہاں پارچہ بافی کے کارخانے بھی بہت زیادہ ہیں مگر صوبے کے دوسرے حصوں میں بھی پارچہ بافی کا کام ہوتا ہے مثلاً ریشمی کپڑے کی بُنائی بنارس اور اناوہ تک محدود ہے بعض دوسرے اضلاع میں بھی یہ کام ہوتا ہے مگر اس کی مقدار بہت ہی معمولی ہے چکن سازی اور زردوزی کا کام ضلع لکھنؤ تک محدود ہے ریشمی کپڑوں پر زردوزی اور گنگاجمنی کام، گوٹا کناری اور سلمہ ستاروں کا کام بنارس میں بہت اچھا ہوتا ہے بنارسی کپڑے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ کانچ کی صنعت کے اہم مرکز فیروزآباد اور شکوہ آباد ہیں جہاں کی خاص چیز رنگین چوڑیاں ہیں جن کی سارے ہندوستان میں عام مانگ ہے۔ مراد آباد کے قلعی کے برتن سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے ہیں اس کے علاوہ سونے اور چاندی کے کام کے لیے بنارس اور لکھنؤ مشہور ہیں ضلع مرزاپور اور

ریاست بنارس میں دستی کرگھوں سے بہت اچھے قالین بنائے جاتے ہیں۔ عام طور سے ان کا بڑا حصہ یورپ، آسٹریلیا اور شمالی امریکہ چلا جاتا ہے۔ ان قالینوں کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ مقامی اون سے تیار کیے جاتے ہیں۔ قالین سازی کی صنعت اکثر جیل خانوں میں بھی کافی ترقی کر چکی ہے ان کے علاوہ صوبے کی اشیائے خوردنی کے علاوہ دوسری مقامی اور گھریلو مصنوعات میں بنارس کے پیتل کے برتن، علی گڈھ کے تالے آگرہ کی دریاں اور سنگ مرمر کے کھلونے و برتن، قنوج، جونپور اور لکھنؤ کے عطر و تیل۔ بریلی کا لکڑی کا سامان لکھنؤ کی نیچہ سازی اور تمباکو، میرٹھ کی قینچیاں اور سفالی کے برتن کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

صوبہ متحدہ کی ۱۱ فیصدی آبادی شہروں میں رہتی ہے لیکن جہاں تک مصنوعات کا تعلق ہے کانپور سے زیادہ نمایاں ہے، یہاں متعدد پارچہ بافی، اون، جوٹ، دباغت، صابن، تیل، دیا سلائی، شکر، کنکریٹ، لوہا ڈھالنے، آٹا پیسنے کے کارخانے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے دفاعی اغراض کے لیے خیام سازی نے کافی ترقی کر لی ہے، لکھنؤ میں روئی اور کاغذ کے کارخانے ہیں۔ سہارنپور میں ایک بہت بڑی سگرٹ فیکٹری ہے۔ اور آگرہ جوتوں اور ان سے ملحقہ ذیلی صنعتوں کا مرکز ہے۔

گزشتہ چند عشروں میں صوبہ متحدہ نے صنعت و حرفت میں کافی ترقی کی مگر اس کا بڑا حصہ پارچہ بافی اور شکر کی صنعت تک محدود رہا اور ان میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے، ہندوستان میں عام طور پر جو کچھ صنعتی چہل پہل پیدا ہوئی وہ گزشتہ جنگ عظیم کا نتیجہ تھی۔ صوبہ متحدہ میں جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد سے ترقی شروع ہوئی۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ ۲۲ سال کے عرصہ میں کس قدر ترقی ہوئی:

	سنہ ۱۸ء	[illegible]
چالو کارخانوں کی کل تعداد	۲۱۶	[illegible]
کام کرنے والے مزدوروں کی اوسط تعداد	۶۴،۱۹۶	۱،۷۹،۷۴۳

صوبہ متحدہ کی سب سے زیادہ منظم صنعتوں میں پارچہ بافی کی صنعت ہے اور اس میں شہر کانپور کو کافی دخل ہے یعنی صوبہ متحدہ میں پارچہ بافی کے جتنے کارخانے ہیں اس کے ۶۰ فیصدی کارخانے کانپور میں ہیں۔ صوبہ متحدہ کے مشہور کارخانے کانپور ہی میں ہیں۔ ذیل میں صوبہ متحدہ اور شہر کانپور دونوں کے

کارخانوں، کرگھوں اور مزدوروں کے اعداد پیش کیے گئے ہیں جن سے اس ترقی کا اندازہ ہو سکے گا۔

سال	پارچہ بافی کے کل کارخانے	چرخے	کرگھے	روزانہ مزدوروں کی اوسط تعداد
صوبہ متحدہ				
سنہ ۱۹۱۶ء	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سنہ ۱۹۴۰ء	[illegible]	[illegible]	۷۰۳۳	۳۰۰۹
سنہ ۱۹۱۸ء	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سنہ ۱۹۴۲ء	[illegible]	[illegible]	۱۰،۲۶۴	۳۵,۶۲۵

ان پارچہ بافی [illegible] کے علاوہ یہاں خالص [illegible] سامان بنانے والا کارخانہ کانپور اونی [illegible] جو ہندوستان کا [illegible] سے بڑا اونی کارخانہ ہے اور "لال املی" کے نام سے مشہور ہے [illegible] صوبہ بنگال تک محدود تھی مگر اب دوسرے صوبوں میں چند [illegible] پہلے [illegible] جوٹ کے کارخانے قائم ہیں جو تھیلے اور جوٹ کا دوسرا سامان تیار کرتے ہیں۔ [illegible] ان کا ایک [illegible] بازار مل گیا ہے جو پہلے بنگال کے کارخانوں کے قبضے میں تھا مگر مجموعی حیثیت سے ان کی پیداوار بہت کم ہے اور ابھی اس میں ترقی کی کافی گنجایش ہے۔

چمڑے کی صنعت اور بالخصوص لگام، زین، بوٹ اور جوتوں کے لیے کانپور سارے ہندوستان میں فوقیت رکھتا ہے کانپور میں بہت عرصے سے ایک کارخانہ قایم ہے جو حکومت کے فوجی اغراض کے لیے چمڑے کا سامان تیار کیا کرتا ہے یہ کارخانہ سنہ ۱۸۶۰ء میں قایم کیا گیا تھا اور اب اس نے کافی ترقی کر لی ہے برٹش انڈیا کارپوریشن [illegible] جس کا شمار دنیا کے بڑے کفش ساز کارخانوں میں ہوتا ہے کانپور میں اپنی ایک شاخ "کوپر ایلن اینڈ کو" کے نام [illegible] قایم کی ہے۔ یہ شاخ خود ایک بڑا کارخانہ ہے جہاں روزانہ ۱۲½ ہزار بوٹوں کی جوڑیاں تیار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چمڑا اور سامان الگ ہے جو یہاں تیار کر کے حکومت کے دوسرے کارخانے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ دو کارخانے زیادہ تر فوجی اغراض کے لیے مال تیار کرتے ہیں لیکن نارتھ ویسٹ ٹینریز کا کارخانہ [illegible]

کے لیے جوتے تیار کرتا ہے اور فلیکس اسی کمپنی کا مشہور جوتا ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ ملحقہ ملکوں میں کافی شہرت رکھتا ہے۔

گزشتہ عشرہ میں صوبہ متحدہ کی جس صنعت نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے وہ شکر سازی کی صنعت ہے اور پورے ہندوستان میں صوبہ متحدہ کا اس صنعت میں خاص حصہ ہے۔ مثلاً ۳۴-۱۹۳۳ء میں کل ہندوستان میں اعلیٰ قسم کی نیشکر کی کاشت کے تحت ۲۰ لاکھ ایکڑ رقبہ تھا جس میں سے ۱۲½ لاکھ ایکڑ رقبہ صوبہ متحدہ میں تھا۔ دوسرے سال ہندوستان کے نیشکر کے رقبے میں اضافہ ہوا مگر یو پی کا رقبہ ۱۵½ لاکھ ہوگیا۔ صرف شکر سازی کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد پچاس ہزار سے زاید ہے۔ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہندوستان میں شکر کے کارخانوں کی تعداد ۱۵۰ کے قریب تھی اور اس میں سے ۷۴ صوبہ متحدہ میں واقع تھے جن کی مجموعی پیداوار ۶½ لاکھ ٹن تھی حالانکہ صوبہ متحدہ کی سالانہ شکر کے خرچ کا اندازہ ۳ لاکھ ٹن کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سے ۳½ لاکھ ٹن شکر دوسرے صوبوں کو برآمد کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں اس صنعت کی ترقی کا آغاز سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء سے ہوتا ہے جب حکومت ہند نے اس کی درآمد پر تامینی محصول عاید کیا پھر سنہ ۱۹۳۷ء میں حکومت ہند نے سوائے برما کے سمندری راستوں سے باہر جانے والی شکر کی برآمد پانچ سال کے لیے بالکل ممنوع قرار دیدی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں کثیر مقدار میں شکر پیدا ہوتی رہی اور جب ضرورت سے زاید مال تیار ہوگیا تو اس کی قیمت گرنے لگی۔ ضرورت سے زاید شکر پیدا ہونے کی ایک وجہ کارخانوں کی آپس کی مسابقت بھی تھی اس وجہ سے ملک کے ۹ کارخانوں نے ایک سنڈیکیٹ بنایا اور یو پی اور بہار کی حکومتوں سے درخواست کی کہ وہ شکر سازی کے معاملہ میں مداخلت کرے تاکہ شکر کی قیمت نہ گرے دوسرے مال زیادہ پیدا نہ ہو اور تیسرے آپس کی مسابقت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس وقت صوبوں میں کانگرسی حکومتیں برسر اقتدار تھیں انھوں نے سنڈیکیٹ کو تسلیم کرلیا اور ہر کارخانے کے لیے لائسنس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا۔ مگر یہ لائسنس اسی کارخانے کو مل سکتا تھا جو سنڈیکیٹ کا ممبر ہو۔ نیز تمام کارخانوں کے لیے یہ لازمی ہوگیا کہ وہ اپنی شکر سنڈیکیٹ کے ذریعہ فروخت کریں۔ حکومتوں نے نیشکر کی اقل ترین قیمت بھی مقرر کردی جس میں سالانہ فصلوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے کمی بیشی ہوا کرتی تھی۔ اس طرح یو پی اور بہار میں یہ صنعت پورے طور پر حکومت کے زیر اقتدار آگئی۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں شکر کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوا کیونکہ اول تو نیشکر کی اقل ترین قیمت زیادہ تھی

کی گئی۔ دوسری طرف شکر بنانے کے زمانے میں کمی کر دی گئی، پھر خود گنے کی کاشت میں بھی کمی ہو گئی جس کی وجہ سے اس صنعت کے پاؤں لڑکھڑانے لگے اور ابھی تک یہ صنعت اس بحران سے عہدہ برآ نہیں ہوئی۔

صوبہ متحدہ کے سارے علاقے میں مختلف ریلوں مثلاً ای۔ آئی۔ جی آئی پی۔ بی اینڈ این ڈبلیو بی بی اینڈ سی آئی۔ روہیل کھنڈ اور کمایوں ریلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ ان کی مدد سے خام مال صنعتی مرکزوں میں اور تیار شدہ مال بازاروں میں آسانی سے جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ صوبے میں پختہ سڑکوں کی بھی کافی تعداد موجود ہے جن پر متعدد لاریاں چلتی ہیں جو مسافروں اور سامان کو ادھر سے ادھر منتقل کرنے میں بڑا حصہ لیتی ہیں مگر آج کل پٹرول کی کمی کی وجہ سے اکثر لاریاں بند ہو گئی ہیں۔ صوبے میں گنگا اور اس کے معاون دریا سطح مرتفع پر بہتے ہیں اور ان میں کشتی رانی کے بڑے اچھے مواقع ہیں مگر ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے آج کل جبکہ ریلوں پر فوجی اغراض کا بار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور پٹرول کی کمی کی وجہ سے لاریوں میں خاصی کمی ہو گئی ہے اس طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی تجارت و صنعت حمل و نقل کی دشواریوں کی وجہ سے متاثر نہ ہو۔

آج کل جنگ کی وجہ سے جو اشد اور ناگہانی ضرورتیں پیدا ہو گئیں ہیں اس کے تحت صوبہ متحدہ کی تمام بڑی بڑی صنعتیں اور بالخصوص کانپور کے تمام کارخانے دفاعی اغراض کے لیے طرح طرح کا سامان مثلاً ہر قسم کی اونی، سوتی چیزیں اور کپڑے، چمڑے کا سامان، جوتے، خیمے وغیرہ تیار کر رہے ہیں۔ لیکن جب جنگ ختم ہو جائے گی تو ان چیزوں کے علاوہ بعض دوسری چیزیں مثلاً شکر وغیرہ کی بڑی مقدار ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں برآمد کی جا سکے گی۔

تجارت اور صنعت کے مفادات کے تحفظ کی خاطر صوبہ متحدہ میں تین ادارے قائم ہیں اور تینوں کے صدر مقام کانپور میں ہیں پہلا ادارہ "اپر انڈیا چیمبر آف کامرس" کے نام سے موسوم ہے یہ بہت پرانا ادارہ ہے اور سنہ [illegible]ء میں قائم ہوا تھا۔ دوسرا "چیمبر آف کامرس صوبہ متحدہ" اور تیسرا "مرچنٹ چیمبر آف کامرس" کہلاتا ہے۔ یہ دونوں ادارے اتنے پرانے نہیں ہیں۔ پہلا ادارہ سنہ ۱۴ء میں اور دوسرا ادارہ سنہ ۳۲ء میں قائم ہوا ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

اُردو شاعری پر سیاسی خیالات کا اثر

(ہنگامۂ غدر سے قبل)

اردو زبان اپنے وجود کے لیے خود سیاسی اثرات کی ممنون ہے۔ یہ دو قوموں کے آپس میں ملنے جلنے اور میل جول بڑھنے سے وجود میں آئی تھی۔ مسلمان اپنا وطن چھوڑ کر ہند میں آئے تو کچھ عرصہ تک وطن کی محبت رہی لیکن یہاں کی پُرسکون اور پُرخلوص زندگی نے اپنی معصومیت اور کشادگیٔ خیال سے نہ صرف اپنے تازہ مہمانوں کے لیے بلکہ ان کی زبان کے ہزاروں اور لاکھوں الفاظ کے لیے اپنا دامن وسیع کر دیا۔ خاک ہند میں غیروں کو اپنا بنانے کی جو تاثیر رہی ہے اس کی ہزاروں سال کی تاریخ اس پر شاہد ہے اور اگر اس پر بھی کوئی قوم اس میں گھل مل نہ سکی تو سمجھو کہ وہ غیر ملک کے تاجر تھے جو یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ ہم اس کے نہیں بلکہ یہ خاک پاک ہمارے لیے فرش راہ ہے۔

مسلمانوں کے بارھویں صدی میں ہندوستان میں وارد ہونے کے ساتھ ساتھ اس زبان کی بنیاد پڑی پھر دکن میں اس کی ابتدائی ترقیاں خود بتاتی ہیں کہ ادبی ترقی کے لیے سیاسی خلفشار سے یک گونہ سکون کس قدر ضروری ہے۔ ہمارے دکنی سلاطین نادرشاہی اور احمد شاہی حملوں سے بے نیاز ادبی ترقی کے لیے کوشاں تھے اور ان کے دربار میں شاعر اور اکثر وہ خود اردو زبان میں شعر کہتے۔ اور اس کی وسعتوں کے شیدائی ہو رہے تھے یہیں سے اس پر ان بزرگوں کی نظر التفات پڑی جو خود فقر و فاقہ، رضا و تسلیم کے بندے تھے انھوں نے اسے ابتدا ہی سے روحانیت کے حروف تہجی سے آشنا کرنا شروع کر دیا۔ شمالی ہند میں اس کے چرچے ہوئے اور میر اور سودا تک کا زمانہ آگیا۔ بہ ظاہر نظر آتا ہے کہ اس نے اپنے اس ابتدائی دور میں کسی سیاسی اثر کو قبول نہیں کیا۔ عام خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ہماری زبان کے سامنے ادبستان کا فردوس بریں تھا اور اس کی تقلید میں باغ ارم لگانا اس کا شیوہ۔ اردو ادب نے فارسی کی تقلید کی اور ایک عرصہ تک اس کا مقصد صرف سرور و انبساط کی فراہمی رہی۔ لیکن غور کیجیے تو یہ باتیں خود سیاسی اثرات کے تابع نظر آئیں گی۔ اس سلسلہ میں چند خیالات

…ش کرنے کی جرأت کروں گا۔

۱۔ سیاست کوئی جنت کشمیر نہیں کہ جنھوں نے دیکھا متاثر ہوئے اور باقی لوگوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اس سے متاثر ہوں۔ یہ وہ قوانین حیات ہیں جن سے ہر کس و ناکس متاثر ہونے پر مجبور ہے۔ انفرادی حیثیت سے ایک … کے خیالات، جذبات اور رجحانات پر اس کا اثر تیز یا ہلکا ہو سکتا ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے انھیں اس کی … کے ساتھ چلنے پر قطعاً مجبور ہیں۔ اس لیے ایک شاعر اگر نقال نہیں اور اس کے خیالات و جذبات ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ یہ اس کی قلمرو سے باہر قدم نکال …

۲۔ اردو نے بیشک فارسی کی تقلید کی لیکن اس شعوری تقلید میں ایک غیر شعوری سیاسی پہلو … اردو فارسی کی تقلید اس لیے نہیں کر رہی تھی کہ یہی ایک ادب تھا جو اس کے سامنے تھا۔ یہی ہوتا تو ہندوستان کی دیگر زبانوں پر … اثر زیادہ پڑتا۔ وجہ یہ تھی کہ حکومت کی زبان فارسی تھی اور جو طرز حکومت ایران و فارس میں وہاں کے شعرا کی قصیدہ نگاریوں کا محرک تھا وہی بعینہٖ انھیں روایات کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ جو انداز بیان وہاں کے شعراء کے لیے قرب سلطانی کا باعث ہوا تھا یہاں بھی وہی ایک کامیاب آلہ کار بن سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ دوسری زبانوں سے وہی چیزیں لی گئیں جو ان کے حصول مقصد میں ان کی معاون تھیں اور فارسی کا اثر غیر شعوری طور پر اتنا زیادہ ہو گیا کہ ظاہر بیں نظروں نے اسے صرف کورانہ تقلید خیال کیا۔

۳۔ فارسی نے جس شخصی حکومت کے دور میں آنکھیں کھولیں اور نشو و نما پائی اردو کو بھی انھیں حالات میں زندگی … شخصی حکومت میں ایک نگاہ کرم کیا معنی رکھتی تھی اور ایک نظر غضب آلود کن بربادیوں کا باعث ہوتی تھی اس کا اندازہ صرف ایک شاعر کی زندگی سے کیا جا سکتا ہے اردو کا یہ بدقسمت لیکن ذہین شاعر انشا تھا جس نے شخصی حکومت کے نشیب و فراز دیکھے تھے آرزوں اور تمناؤں کی دنیا کو بنتے بگڑتے دیکھا جب زمانہ راکھ کا ڈھیر تھا لیکن کمبخت ذہن اپنے اعلیٰ تصورات سے اتر کر اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا بیشک انشا ہی کہہ سکتا تھا۔

تصور عرش پر ہے اور … پائے ساقی پر غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

شخصی حکومت میں زندگی بسر کرنے کی کتاب الہدایت گلستان و بوستان سعدی ہیں انھیں پر لوگوں کا ایمان تھا اور یہ ایک نظر لطف کی تمنا میں ہزاروں اعلیٰ خیالات صرف درباں کر دیتے تھے۔ اس زمانہ کی قصیدہ نگاری

ہو سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی جو ان اثرات کے مٹنے کے ساتھ ساتھ مٹتی گئی۔

پھر اردو شاعروں کا یہ ابتدائی دور جنھیں ہم بظاہر سیاسی اثرات سے خالی پا... کا ایک پہلو نمایاں ہے۔ یہ ہماری سکونِ فراموشی کے ترجمان ہیں جہاں کشمکشِ حیات، اقتصادی مسائل اور دشواریوں نے کوئی صورت ہی اختیار نہ کی تھی جو عام فضا کی ہواؤں کو متصادم کر دیتی۔ ملک میں سکون تھا اور میں اطمینان۔ شاعری بھی اسی قسم کے سکون کی ترجمان ہوئی۔

شاعر یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنے زمانے کے حالات اور اقوام دیگر کی ان سیاسی چالوں سے حکومت کو باخبر کرتا جو اس کی تباہی کا باعث ہونے والی تھیں لیکن وہ خود حکومت کی زوال پذیر داستان کا ایک باب تھا۔ میر صاحب دنیا سے بے نیاز تھے خواجہ میر درد ترکِ لذات کے حامی۔ ایک مرزا سودا تھے جنھیں دنیاداری ذہنیت اور بصیرت حاصل تھی لیکن یہ ذہنیت عیش شاہی کی پروردہ تھی۔ زمانے کا رنگ دیکھا انقلاب کی بے پناہ قوتوں پر نظر پڑی تو سوچا کہ اپنی زندگی کے لیے تو نوابوں کے دربار خالی ہیں جو جتنے بچے گا ہر رُو کا مقابلہ کرے گا۔ کاش اس وقت ہمارے شعرا نے ایثار اور وسیع النظری سے کام لیا ہوتا۔ کاش ایک حالی، ایک جوش اس وقت پیدا ہوا ہوتا جو سوئی قوم کو جگا دیتا۔ ان کے بے حس جذبات کو برانگیختہ کر دیتا ان کے سرد خون میں ایک برقی لہر دوڑا دیتا کہ وہ جادۂ عمل پر پھر ایک بار گامزن نظر آتے شاید ان کی سعی مشکور ہوتی اور آج وہ سب کچھ دیکھنا نہ پڑتا جو ہمارے وطن کی تباہی و بربادی اور افلاس کا باعث ہوا لیکن ہمارے شعرا کی بصیرت پر خود بینی کے پردے پڑے ہوئے تھے ادبی رسوم و قیود کی زنجیروں نے انھیں بھی کچھ اس درجہ غلام بنا لیا تھا کہ انھوں نے یہ گوارا کر لیا کہ دلی کو چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جائے جہاں کی شاعری کے لیے وہی فضا تیار تھی جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں لیکن یہ منظور نہ ہوا کہ ان رجحانات سے قوم کو باخبر کیا جائے جس کی جڑیں پرانی عظمتوں کو منہدم کرتی جا رہی تھیں۔ انھوں نے آنے والے انقلاب سے بچنا چاہا لیکن کیا یہ انقلاب ہی کی ایک رو نہ تھی جو انھیں میر اور سودا جیسے دلدادۂ خاک کو اپنے ساتھ لکھنؤ بہا لائی؟ اور اسی آستانہ پر سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا جہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا شجاع الدولہ کی دعوت پر سودا نے یوں حسنِ معذرت کی تھی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ... وارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک

بالفرض ہوا ہوں بھی تو پھر تو کب تک ؛ [illegible] ہوئے!

[illegible] درس دیا کہ جہاں حالات موافق ہوں وہاں کا رُخ کرو
[illegible] سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانوں کے ساتھ انشا و جرأت سے
[illegible] آخر تک بحیثیتِ شعرا انہیں نا خدائے سخن کی بہرحال پیروی کرتے رہے۔

البتہ یہ ایک نکتہ قابل غور ہے کہ اس ابتدائی دور میں ایک زمانے تک سیاسی کشمکش کا اثر شاعری سے زیادہ شاعر کی ہستی پر نمایاں طور پر پڑتا رہا۔ شعرا نے سیاسی حالات کا اثر خود تو قبول کیا لیکن اپنی شاعری کے [illegible] نہیں نہ لگنے دی۔ اس ابتدائی دور میں سودا کا شہر آشوب باوجود [illegible] ہونے کے اپنے مضمون کے اعتبار سے [illegible] شاعری سے کسی قدر الگ ہے۔ ہر چند جن وجوہ سے یہ مخمس ظہور میں آیا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے [illegible] قول غلط نہیں کہ یہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو ہے لیکن بقول آزاد غور سے دیکھو تو ملک کی دل سوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے۔ سودا ملک کے انتشار سے آگاہ ضرور تھے۔ شاہ عالم کے دشمنوں اپنی آہ بھی برداشت نہ کر سکے اپنے دل کے پھپھولے شہر آشوب میں پھوڑ کے بیٹھے۔ بادشاہ کی ہجو کہنے بیٹھے تھے وطن کی حالت پر آنسو نکل آئے۔ غرض اس ابتدائی دور کے انتشار اور اندرونی بے چینی پر جو کچھ روشنی پڑتی ہے وہ اسی شہر آشوب سے اور بس۔

ہاں اگر بالواسطہ طور پر اس زمانے کے رجحانات پر سیاسی جمود کی تصویریں دیکھنا ہوں تو بادشاہوں کی عیش پرستیوں اور نوابوں کی فردوس نگاہیوں میں قوم و ملک کی تصویریں دیکھو، ادب میں کہیں اگر محفل عشرت کی عطر بیزیاں ہوں گی تو اکثر ایسے فحش کے وہ چھینٹے جو دل و دماغ کو اس سے متنفر کر دیں لیکن قصیدوں کی مدح سرائیاں یا غزل کی دل آویزیاں ایک زوال پذیر تمدن کی شبیہیں ہیں نہ کہ سیاسی اثرات کی تصویریں۔

حامد بلگرامی

...اثرات کا نتیجہ تھی جو ان اثرات کے مٹنے کے ساتھ ساتھ مٹتی گئی۔

ہمارے اردو شاعروں کا یہ ابتدائی دور جنھیں ہم بظاہر سیاسی اثرات سے خالی پاتے ہیں، ان میں بھی زندگی کا ایک پہلو نمایاں ہے۔ یہ ہماری سکونِ فراموشی کے ترجمان ہیں جہاں کشمکش حیات، اقتصادی مسائل اور معاشرتی ... نے کوئی صورت ہی اختیار نہ کی تھی جو عام فضا کی ہواؤں کو متصادم کر دیتی۔ ملک میں سکون تھا اور دل... اطمینان۔ شاعری بھی اسی قسم کے سکون کی ترجمان ہوئی۔

شاعر یہ بھی کر سکتا تھا کہ اپنے زمانے کے حالات اور اقوامِ دیگر کی ان سیاسی چالوں سے حکومت کو آگاہ کرتا جو اس کی تباہی کا باعث ہونے والی تھیں لیکن وہ خود حکومت کی زوال پذیر داستان کا ایک باب تھا۔ میر صاحب دنیا سے بے نیاز تھے خواجہ میر درد ترکِ لذات کے حامی۔ ایک مرزا سودا تھے جنھیں دنیاوی ذہنیت اور بصیرت حاصل تھی لیکن یہ ذہنیت عیش شاہی کی پروردہ تھی۔ زمانے کا رنگ دیکھا انقلاب کی بے پناہ قوتیں نظر پڑیں تو سوچا کہ اپنی زندگی کے لیے تو نوابوں کے دربار خالی ہیں جو جتنے بچے گا ہر زد کا مقابلہ کرے گا۔ کاش اس وقت ہمارے شعرا نے ایثار اور وسیع النظری سے کام لیا ہوتا۔ کاش ایک حالی، ایک جوش اس وقت پیدا ہوا ہوتا جو سوئی قوم کو جگا دیتا، ان کے بے حس جذبات کو برانگیختہ کر دیتا، ان کے سرد خون میں ایک برقی لہر دوڑا دیتا کہ وہ جادۂ عمل پر پھر ایک بار گامزن نظر آتے شاید ان کی سعی مشکور ہوتی اور آج وہ سب کچھ دیکھنا نہ پڑتا جو ہمارے وطن کی تباہی و بربادی اور افلاس کا باعث ہوا لیکن ہمارے شعرا کی بصیرت پر خود عیش کے پردے پڑے ہوئے تھے ادبی رسوم و قیود کی زنجیروں نے انھیں بھی کچھ اس درجہ غلام بنا لیا تھا کہ انھوں نے یہ تو گوارا کر لیا کہ دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رُخ کیا جائے جہاں کی شاعری کے لیے وہی فضا تیار تھی جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں لیکن یہ منظور نہ ہوا کہ ان رجحانات سے قوم کو باخبر کیا جائے جس کی جڑیں پرانی عظمتوں کو منہدم کرتی جا رہی تھیں انھوں نے آنے والے انقلاب سے بچنا چاہا لیکن کیا یہ انقلاب ہی کی ایک رو نہ تھی جو انھیں میر اور سودا جیسے دلدادۂ خاک کو اپنے ساتھ لکھنؤ بہا لائی؟ اور اسی آستانہ پر سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا جہاں ابھی کچھ عرصہ ہوا شجاع الدولہ کی دعوت پر سودا نے یوں حسنِ معذرت کی تھی۔

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک ... آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہوئے!　　　　بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک؟

سودا اور میر دلی سے لکھنؤ گئے گویا آنے والی جماعتوں کو یہ درس دیا کہ جہاں حالات موافق ہوں وہاں کا رخ کرو تھا سے دن کٹ جائیں گے۔ چنانچہ سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستانوں کے ساتھ انشا و جرأت سے کر و مصحفی اور ناسخ و آتش تک بیشتر شعرا انھیں خدائے سخن کی بہرحال پیروی کرتے رہے۔

البتہ یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ اس ابتدائی دور میں ایک زمانہ تک سیاسی کشمکش کا اثر شاعری سے زیادہ شاعر کی ہستی پر نمایاں طور پر پڑتا رہا۔ شعرا نے سیاسی حالات کا اثر خود تو قبول کیا لیکن اپنی شاعری کے آبگینے کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ اس ابتدائی دور میں سودا کا شہر آشوب باوجود ہجو ہونے کے اپنے مضمون کے اعتبار سے زمانہ کی رسمی شاعری سے کسی قدر الگ ہے۔ ہر چند جن وجوہ سے یہ مخمس ظہور میں آیا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا ہے نقادوں کا یہ قول غلط نہیں کہ یہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو ہے لیکن بقول آزاد غور سے دیکھو تو ملک کی دل سوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے سودا ملک کے انتشار سے آگاہ ضرور تھے۔ شاہ عالم کے ہاتھوں اپنی توہین برداشت نہ کر سکے اپنے دل کے پھپھولے شہر آشوب میں پھوڑنے بیٹھے۔ بادشاہ کی ہجو کہنے بیٹھے تھے وطن کی حالت پر آنسو نکل آئے۔ غرض اس ابتدائی دور کے انتشار اور اندرونی بے چینی پر جو کچھ روشنی پڑتی ہے وہ اسی شہر آشوب سے اور بس۔

ہاں اگر بالواسطہ طور پر اس زمانے کے رجحانات پر سیاسی جمود کی تصویریں دیکھنا ہوں تو بادشاہوں کی عیش پرستیوں اور نوابوں کی فردوس نگاہیوں میں قوم و ملک کی تصویریں دیکھو ادب میں کہیں اگر محفل عشرت کی عطر بیزیاں ہوں گی تو اکثر بے نمش کے دو بیکنے جو دل و دماغ کو اس سے متنفر کر دیں لیکن قصیدوں کی مدح سرائیاں یا غزل کی دل آویزیاں ایک زوال پذیر تمدن کی شبیہیں ہیں نہ کہ سیاسی اثرات کی تصویریں۔

حامد بلگرامی

افواہیں

کہا جاتا ہے کہ آج کل کی لڑائیوں میں پروپاگنڈا منجملہ اور ہتھیاروں کے ایک بڑا ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا کہ لڑائی میں ہار جیت میدان جنگ میں نہیں بلکہ لڑائی سے میدان سے بہت دور خبر رساں ایجنسیوں کے دفتروں میں ہوتی ہے لیکن جب تک پروپاگنڈا اصلیت کے لباس میں ہو اور حقیقت سے منسوب ہو اس وقت تک تو یہ ایک جائز اور معقول ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن جب یہ اصلیت سے بے بہرہ ہو اور بدگمانی اور گمراہی کا فتنہ ساز ہو تو یہ وہ شکل اختیار کرتا ہے جس سے کہ تکلیف اور نقصان کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ جنگ میں سب سے پہلے سچائی کا خون ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں پروپاگنڈا افواہوں اور بے بنیاد خبروں کا سہارا لے کر ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے لوگوں میں گھبراہٹ، بے چینی اور مایوسی پھیل جاتی ہے۔ اور اخلاقی اعتماد جاتا رہتا ہے جب پروپاگنڈا اتنا تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے تو افواہ جو زیادہ مہمل اور لغو چیز ہے اس سے کہیں زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ افواہ کچھ تو قصداً پھیلائی جاتی ہے اور کچھ اپنے آپ وقت کی نزاکت سے ابھرتی ہے۔ افواہوں کا اثر روزمرہ کی اخلاقی زندگی پر بہت خراب پڑتا ہے کیونکہ افواہ محض ایک بے بنیاد خبر ہی نہیں بلکہ یہ لوگوں کے ان فطری جذبات کو حرکت دیتی ہے جن کی وجہ سے معاشرتی زندگی قائم ہے لیکن پیشتر اس کے کہ ہم افواہوں کے دبانے اور ان کے دفع کرنے کے طریقہ پر غور کریں ہم کو جاننا چاہیے کہ افواہ نفسیاتی نظر سے کیا ہے۔ افواہ کے کم از کم تین ضروری اجزا ہیں۔

۱۔ کسی بیان کا جاری کرنا اور اُسے پھیلانا۔

۲۔ بیان کا بالکل غلط یا ادھورا ہونا۔

۳۔ بیان اُن باتوں کا ہو جن کا تعلق لوگوں کی جذباتی زندگی سے ضرور ہو یا روایات یا عوام کے مذہب سے وابستہ ہوں۔

افواہ کی یوں تو بے شمار قسمیں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی چار یا پانچ ایسی شکلیں ہیں جو کہ عام طور پر ظاہر ہوتی ہیں

۱- لڑائی میں ظالمانہ اور وحشیانہ کارروائیوں کی افواہ۔

۲- شرمناک اور رسوا کرنے والے واقعات کا بیان۔

۳- افواہ جو خواہشات پر مبنی ہو نہ کہ واقعات پر۔

افواہ جو شدت جذبات کی وجہ سے پیدا ہو۔

افواہ جو بدلہ لینے کی خواہش پر مبنی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افواہیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ افواہیں اس وقت اڑتی ہیں جبکہ جمعیت کی زندگی میں کوئی نازک موقع آجاتا ہے اس وقت معمولی آدمی کی ذہنیت یا عقل جذبات کے جوش اور شدت کی وجہ سے ابتر ہو کر اپنا کام نہیں کرتی اور وہم بڑھ جاتا ہے اور انسان کو بھونڈی سی بھونڈی بات پر یقین آنے لگتا ہے سراسر لغو باتیں بھی اعتبار کے قابل معلوم ہوتی ہیں۔ ان کو تصدیق کرنے اور جانچنے کا خیال بھی نہیں آتا اور نہ کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان پر یقین تو پہلے ہی سے ہوتا ہے۔ اور اگر کسی خاص صورت میں یقین نہ بھی ہو تو بھی افواہ پھیلانے کی لذت اس قدر پرلطف ہوتی ہے کہ ایک معمولی آدمی اس کا مزا اٹھائے بغیر نہیں رہنا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض افواہیں جو بظاہر خود بخود ہوتی ہیں اور جن پر شاید ہی کوئی فرد یقین کرتا ہو پھر بھی وہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ افواہ کا جاری ہونا اور پھیلنا دونوں ایک جمعیت کی جذباتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس قسم کی جمعیت ہوگی اور جیسا اس کا تمدن اور معاشرتی رویہ ہوگا ویسی ہی افواہیں اڑیں گی اور پھیلیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف جمعیتوں میں مختلف افواہیں پائی جاتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ایک طبقہ کا انسان دوسرے طبقہ کی افواہوں پر یقین نہ کرے جبکہ جذباتی زندگی ایک حد تک عقل کو برہم کر دیتی ہے تو اس وقت افواہ خواہ کسی قسم کی ہو یقین کرلی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افواہ کی اپج اور اس کا نشو و نما پانا جذبات کی زیادتی اور ان کے زور پر منحصر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی نازک وقت مثلاً لڑائی کے زمانے میں جذباتی زندگی پر زبردست اثر پڑتا ہے۔ یہ زمانہ عوام کے لیے ایک کشمکش کا زمانہ تو ہوتا ہی ہے لیکن لڑنے والے سپاہیوں اور ان تمام لوگوں کے لیے جو لڑائی کے کام میں لگے ہوئے ہیں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دشمن کی طرف سے ہر طرح کی کوشش

کی جاتی ہے اور ایسی خبریں اڑائی جاتی ہیں جن سے لڑنے والوں کو اپنے ہتھیاروں اور خود اپنے آپ پر اعتبار رہے یا کم ہو جائے اور ان کی ہمت پست ہو جائے اور اُن پر فتح حاصل کرنے میں آسانی ہو لڑائی کے خطروں کو بے حد بڑھا چڑھا کر بتایا اور ان کی ایسی ہیبت ناک تصویر کھینچنا کہ لڑنے والا کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو اس کا دل دہل اُٹھے اور بجائے ہمت اور دلیری کے اس کے دل پر خوف طاری ہو جائے یہ افواہوں کا خاص منشا ہوتا ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ ہوا بعض طبقوں میں یہ افواہ اُڑی کہ جرمنوں کے پاس ایک ایسی روشنی ہے جس کی کرن پھینکتے ہی مخالف فوج گھبرا کر ہتھیار ڈال دیتی ہے کیونکہ اس کرن کے اثر سے ہاتھ پیر سُن اور بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں گویا فالج گرا ہوا اور بڑی بڑی فوجیں خود بخود ہتھیار ڈال کر گرفتار ہو جاتی ہیں۔ اس افواہ پر یقین کرنے والے میدان جنگ میں نہیں بلکہ ایسے لوگ تھے جو جنگ سے ہزاروں میل دور گھر میں آرام سے بیٹھے ہوئے اپنے خود فرضی شبہات کے ذریعہ سن کر بحث کرتے ہیں اور ایسی بے بنیاد بات کے لیے سائنس کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ ایک دوسری افواہ جس بنیاد ذی علمی مذہبی روایات سے ہو سکتا ہے یہ تھی کہ چند ستاروں کی چال اور گردش انھیں اب ایسی جگہ لے آئی ہے جس سے ان کا اثر دنیا پر اتنا خراب پڑے گا کہ تمام قومیں لڑ بھڑ کر برباد ہوں گی اور اس طرح ساری دنیا ختم ہو جائے گی۔ تیسری قسم کی افواہیں یہ کہ ہٹلر نا قابل تسخیر ہے اور اس پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا یا یہ کہ جاپانی سپاہیوں کے پاس ایک ایسی گولی ہے جس کے کھانے کے بعد ایک مہینہ تک بھوک نہیں لگتی یا ایسی وردی ہے جس کے پہننے کے بعد تلوار، بندوق اثر نہیں کرتی وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام افواہوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں ڈر اور پریشانی پھیلے اور ہاتھ پیر ڈھیلے ہو جائیں۔ ایسی صورت میں افواہوں کا دفع کرنا ہر شخص کا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے لیکن ان کے دبانے کے طریقے ٹھیک اور مناسب ہونے چاہئیں ورنہ بجائے فائدہ کے نقصان ہو سکتا ہے۔ اول تو افواہ کو اسی وقت دفع کرنا چاہیے جبکہ وہ پیدا ہو یعنی اس کو دہرانا یا پھیلانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ کسی خاص شخص یا معاملہ کے بارے میں ہو تو اس کی فوراً تصدیق کرنی چاہیے اگر کسی ایسے واقعہ کا ذکر ہے جو کہ بہت دور ہوا ہو اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھتا ہو تو اس کی بھی جانچ کی کوشش بذریعہ اور آدمیوں کے یا اعتبار کے قابل اخباروں اور کتابوں کے مطالعہ سے کرنا چاہیے جب تک تصدیق نہ ہو جائے اس کا ذکر نہ کرنا چاہیے اور نہ اس پر استماد ہونا چاہیے۔ یہ امر

نسل ضرور ہو کیونکہ افواہ کا خاص جزو یہ ہو کہ وہ جذبات کو اُبھار کر عقل پر حاوی ہو جاتی ہو اور اس حالت میں انسان لوٹ کر بچپن کی نفسی زندگی اختیار کرتا ہو جبکہ تخیل کا دور ہوتا ہو اس لیے بچوں کی ذہنیت اور ان کی سیرت کے مطابق آدمی مہمل باتوں پر نہ صرف اعتبار کرتا ہو بلکہ ان کو خوشی سے پھیلاتا ہو کیونکہ اس سے اس کی اہمیت بڑھتی ہو اور جمعیت کی نظر میں وہ اونچا ہوتا ہو اس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ افواہ بچپن کے مذاق اور ذہنیت کی پابند ہو اور یہ ایک عام نفسیاتی مسئلہ ہو کہ جمعیت کی مجموعی ذہنیت دس یا بارہ سال [illegible] زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے افواہوں کے دبانے کے طریقے اسی لحاظ سے تجویز ہونے چاہئیں۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہو کہ عوام کی تعلیم کا معیار محض ذہنی ترقی نہیں بلکہ جذباتی زندگی کی تربیت اور اس کا سدھار ہونا چاہیے لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ ہو جس کا تعلق تعلیم کے بنیادی اصولوں سے ہو اور اس وجہ سے ہم [illegible] کو یہاں نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ کہنا ضروری ہو کہ اگر عوام کے جذبات کی طرف توجہ نہ دی گئی تو افواہوں اور وہمی خیالوں کے لیے ایک ایسی زرخیز زمین ملتی ہو جس میں وہ بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کرتے ہیں اور پھر اُن کا روکنا غیر ممکن ہو جاتا ہو۔

۲۔ اگرچہ ایک جمعیت کی تعلیم کی پالیسی کو تبدیل کرنا آسان نہیں لیکن مناسب پروپاگنڈا پر چار ضرور کیا جا سکتا ہو۔ اگر خبریں ٹھیک اور مناسب وقت اور جگہ پر دی جائیں تو افواہ کے پیدا ہونے کی گنجایش کم ہوتی ہو۔ یہ جنگ کے زمانے میں بہت ضروری ہو۔ اکثر جبکہ خبر دینے والے ذمہ دار حلقے خبر دینے میں دیر کرتے ہیں یا [illegible] طریقے سے گہرے رنگ چڑھا کر خبروں کو بھیجتے ہیں اس وقت لوگوں کو افواہ جاری کرنے اور پھیلانے کا خاص موقع ملتا ہو اور ایک مرتبہ اگر لوگوں کا اعتبار جاتا رہتا ہو تو پھر اطمینان اور تسلی بخش حالت پیدا کرنا دقت [illegible] ہو جاتا ہو اس لیے صحیح اور مناسب پروپاگنڈا افواہ کے دبانے کا سب سے اچھا طریقہ ہو۔

۳۔ افواہوں کو دبانے میں اکثر قانونی سختی کی ضرورت پڑتی ہو لیکن یہ ایسی حالت میں استعمال میں لائی جانی چاہیے جبکہ دوسرے تمام ذرائع بیکار ثابت ہوں نفسیاتی نظر سے جبر اور دباؤ ڈالنے سے اور خواہشات کی طرح افواہ کی لذت اٹھانے کی خواہش بھی دفع نہیں ہوتی بلکہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہو مثلاً حسب کر لوگ اس بات کا آپس میں ذکر کرتے ہیں جبکہ اس کی ممانعت ہو۔ اس لیے جب تک جبر اور دباؤ ڈالنے سے کوئی

فایدہ نہیں اول تو جیسا اوپر بتایا گیا افواہ اڑنے ہی نہ دینی چاہیے اور اگر اڑے بھی تو اس کے روک تھام کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو کوئی اہمیت نہ دی جائے بلکہ اس کی لغویت اور بے ہودگی کو صاف صاف کہہ کر رکھ تاکہ اس کی جذباتی دلچسپی جاتی رہے اور اسے تفریح اور مذاق کا باعث بنایا جائے کیونکہ جب ڈر اور گھبراہٹ کا اصلی مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ ہمارا روزمرہ کا تجربہ صاف بتاتا ہے کہ بہت سی باتیں جو اگر سنجیدگی سے کہی اور مان لی جائیں تو زندگی دشوار ہو جائے لیکن چونکہ ان کے کہنے میں ایک لطف ہے اس لیے ان کو مزاح کی صورت میں لا کر کہا جاتا ہے جس سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ یہی خطرناک باتیں فرحت بخش ہو جاتی ہیں۔ افواہوں کا بھی یہی علاج ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

کالی پرشاد ایم اے

یمن کا قدیم تمدن

تین ہزار سال پرانی تہذیب

کسی قوم یا ملک کی ترقی اور شوکت و عظمت کا معیار تاریخ میں قوم کے ارادوں کی مضبوطی، سخت جفاکشی، کیرکٹر کی پختگی، جنگجویانہ قوت، تعاون کی انصاف پروری اور اقتصادی توازن کے قیام پر کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاق ہیں جن پر کسی قوم کے تمدن و تہذیب کی تعمیر ہوتی ہے چند صدیوں تک تو قوم میں یہ تمام جوہر بدرجۂ اتم موجود رہتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ تدریجی طور پر ان اعلیٰ خصائل کے برخلاف رذائل کا نشوونما شروع ہوتا ہے تیقظ و تندہی اور جفاکشی کی جگہ سستی اور کاہلی لے لیتی ہے جو بنیاد ہے تمام رذائل کی۔ کچھ عرصہ بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم میں نہ اعلیٰ اخلاق رہتے ہیں نہ ارادوں کی پختگی و استقامت اور انصاف پروری کے بجائے ظلم و جور جگہ لے لیتے ہیں عسکری نظام میں گو افراد و اسلحہ کی کثرت ہوتی ہے مگر روح مفقود ہو جاتی ہے قوت و شوکت کی یہ عمارت اس وقت تک کھڑی رہتی ہے تاآنکہ انقلاب کی ہوا سے محفوظ رہے۔ جوں ہی حوادث روزگار کا کوئی تھپیڑا لگا دھڑام سے یہ پوری عمارت زمین پر آ رہی۔ علامہ اقبالؒ نے قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کو ان معنی خیز الفاظ میں تبلایا ہے فرماتے ہیں:۔

آ! تجھ کو میں بتلاؤں تاریخ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

(قیصر)

دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں جنوبی عرب کی تہذیب جس کا پایۂ تخت یمن کا مشہور شہر مارب تھا۔ اپنی گوناگوں تاریخی خصوصیات کی بنا پر نمایاں حیثیت رکھتی ہے اس تہذیب کا بانی عرب کا مشہور فاتح سبا بن یشجب بن قحطان تھا جس کا اصل نام عمر یا عبد شمس ہے لیکن تاریخ میں وہ سبا کے لقب سے مشہور ہے سبا کی تاریخ سنہ ۱۲۰۰ ق م سے شروع ہوتی ہے اور یہی زمانہ اس کے دارالسلطنت مارب کی تعمیر کا ہے۔ مارب یمن کے شرقی جانب پہاڑ پر واقع تھا اس میں بہت عجان باغ تھے جن میں گوناگوں قسم کے عمدہ عمدہ پھل اور میوے بکثرت ہوتے تھے۔ دار حسینہ

جیسے خوشبودار درختوں کے گھنے باغات تھے جن کی خوشبو سے تمام شہر مہکا رہتا تھا یہاں تک کہ آس پاس کے گزرنے والے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے آب وہوا نہایت فرحت بیز اور معتدل تھی [illegible] جس کی وجہ سے مکھی، مچھر اور کھٹمل جیسے کثیف جانور اور اسی طرح سانپ بچھو جیسے موذی حشرات الارض کا مارب کے گرد و نواح میں وجود نہ تھا اور یہی نہیں کہ اس قسم کے موذی جانور وہاں ہوتے ہی نہیں تھے بلکہ اگر کوئی مسافر ادھر آنکلتا اور اس کے کپڑوں میں جوں ہوتی تو وہ بھی مرجاتی تھی۔[1] ان کی اس عشرت بیز زندگی پر عرب کا ایک شاعر مسلم بن قرط کہتا ہے[2]

"جب قبیلے مارب میں ہوکر گزرتے ہیں تو اس کی حالت پر رشک کرتے ہیں"

قوم سبا تجارت کرتی تھی ان کی تجارت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تھی دنیا کے ہر گوشہ میں ان کا مال پہنچتا تھا سونا، چاندی، جواہرات اور خوشبودار چیزیں ان کی تجارت کا مخصوص سامان تھا۔ سونا، چاندی، جواہرات عرب کی مابہ الامتیاز معدنیات تھیں۔ ان کی وہاں کثرت سے کانیں تھیں عصر حاضر میں بھی ماہرین طبقات الارض نے اس پر مفصل رپورٹیں شایع کی ہیں۔ اس زمانہ میں بت پرستی عام ہونے کی وجہ سے معابد میں رات دن خوشبوئیں استعمال ہوتی تھیں اس لیے تمام دنیا مذہباً ان کے خریدنے پر مجبور تھی اور اس پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا بہترین عبادت خیال کیا جاتا تھا۔ قوم سبا کی یہ تجارت شام اور مصر کی راہ سے ہوتی تھی اور پھر یہاں سے یہ مال تقریباً تمام دنیا میں منقسم ہو جاتا تھا۔

اگرچہ قومی پیشہ تجارت تھا لیکن کچھ لوگ کاشت بھی کرتے تھے۔ ان کے یہاں آب رسانی کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ برسات میں پہاڑوں سے جو پانی بہہ کر میدان میں آتا تھا وہ ریگستان میں پھیل کر ضایع ہو جاتا تھا دریا بھی گرمی کے موسم میں خشک ہو جاتے تھے پانی کی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اہل مارب نے بند باندھنے شروع کیے جن سے پانی اس طرح ضایع ہونے سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ ان بندھوں میں سب سے زیادہ مہتم بالشان بند "سد مارب" کے نام سے مشہور ہے جو اس موضوع کا مخصوص عنوان ہے۔

فن تعمیر میں قوم سبا کو اعلیٰ درجہ کی مہارت حاصل تھی۔ ان کے مکانات نہایت عمدہ، فراخ اور خوش منظر ہوتے تھے۔ ان کو اس فن میں کمال حاصل تھا اور کاریگری کے عجیب عجیب نمونے پیش کرتے تھے ہر مکان

[1] معالم التنزیل ج ۴ صفحہ ۱۵۰ ۔ [2] معجم البلدان ج ۷ صفحہ ۳۸

کے قریب ایک چھوٹا سا باغ ہوتا تھا ستونوں پر سونے چاندی کے نقش و نگار بناتے تھے محرابوں پر عجیب عجیب قسم کی پچکاریاں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر ہم ان کے قصر شاہی سلحین کا تذکرہ کرتے ہیں جس سے ان کی اعلیٰ درجہ کی صناعی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ شاہی محل نہایت مستحکم اور موقع کے لحاظ سے بہت اچھی جگہ واقع تھا چاروں طرف پہاڑ تھے جو اس کی قدرتی طور پر حفاظت کرتے تھے جس سے ان کی کمال دانشمندی اور تدبر کا پتہ چلتا ہے قصر کی عمارت بہت بلند اور مستحکم تھی۔ اس پر سونے چاندی اور جواہرات سے نقش و نگار بنائے گئے تھے جن کے دیکھنے سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ یہ قصر بہت وسیع تھا جس میں شرقی جانب ۳۶۰ دروازے تھے اور اتنی ہی مقدار میں غرب رویہ تھے یہ دروازے از روئے پیمائش اس طرح بنائے گئے تھے کہ سال بھر تک روزانہ سورج ایک ایک دروازے سے طلوع کرتا تھا اور بوقت غروب ایک ایک دروازے سے غروب ہوتا تھا۔ یہ مساحت کا بہت بڑا کمال تھا کہ دروازے اس طرح قایم کیے گئے تھے کہ ہر روز سورج کے مطلع کے مقابلہ میں ایک دروازہ ہوتا تھا ادھر آفتاب نے طلوع کیا اور ادھر کرنیں محراب میں داخل ہونی شروع ہوئیں اسی طرح غربی جانب بھی یہی کمال دکھلایا گیا تھا کہ سورج غروب ہوتا تھا تو ایک نہ ایک دروازہ اس کے مقابل ہوتا تھا اور جب تک ایک کرن بھی غروب سے باقی رہتی تو وہ اس دروازے میں ضرور ہوتی تھی۔ یہ ان کے ایک قصر کا مختصر بیان ہے جس سے ان کی کمال صنعت گیری کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی پر ان کی اور عمارتوں کو قیاس کرنا چاہیے جن میں انھوں نے تعمیر کے عجیب غریب عجائبات پیش کیے تھے تاریخوں میں ان کے تفصیلی حالات ملتے ہیں لیکن ایک مختصر مضمون ان کے بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عرب میں پانی کم ہونے کی وجہ سے زراعت میں بڑی مشکلات پیش آتی تھیں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے انھیں مشکلات کو دور کرنے کے لیے اہل عرب نے بہت سے بند باندھے تھے ان میں سب سے مضبوط اور قابل ذکر تاریخی بند سد مارب کے نام سے مشہور ہے۔

مارب چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ پہاڑوں اور بارش کا پانی روکنے کے لیے ایک بہت بڑا

۱؎ تفسیر کشاف ج ۲۔ ۲؎ تفسیر ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۲۱۱

بند باندھا گیا تھا یہ بند تین[1] پہاڑوں کے درمیان واقع تھا اور اتنی بڑی بڑی چٹانوں سے اس کی تعمیر کی گئی تھی جن کو سو سو آدمی مل کر بمشکل ہلا سکتے تھے بند میں اوپر نیچے تین[2] دہانے تھے ہر دہانہ میں دس دس[3] کھڑکیاں بنائی گئی تھیں بند کے سامنے ایک بہت بڑا حوض تھا جس میں بارہ دہانے تھے ان سے بارہ ہی نہریں نکلتی تھیں اسی وجہ سے ملک کی زمین کو بارہ مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا. نہروں کی سطح آلات کے ذریعہ نہایت ہوشیاری سے درست کی گئی[4] تھی. نہروں سے بڑے بڑے رجبے اور ان سے گولیں اور گولوں سے نالیاں نکالی گئی تھیں. آبپاشی کے وقت بند کی کھڑکیاں بتدریج کھولدی جاتی تھیں اور پانی حوض میں جمع ہوتا رہتا تھا پھر حوض سے نہروں میں آتا تھا. نہروں میں اس حساب سے پانی پہنچایا جاتا تھا کہ اس میں سے جتنے رجبے نکلتے تھے سب میں پانی مساوی طور پر پہنچتا تھا اور اسی طرح گولوں سے جو پانی نالیوں میں آتا تھا وہ بھی ہر کھیت کی ضرورت کے مطابق ہوتا تھا. پانی کی اس عجیب وغریب تقسیم سے پورا ملک بیک وقت سیراب ہوجاتا تھا. اس بند نے ان کے لیے زراعت کی تمام مصیبتیں یکسر ختم کر دی تھیں. زراعت کثرت سے ہوتی تھی قسم قسم کے باغات لگائے جاتے تھے جن میں طرح طرح کے پھل پھول اور میوے بکثرت ہوتے تھے. زمین زرخیز ہوجانے کی وجہ سے سال میں تین[5] فصلیں ہونے لگی تھیں اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو کے بونے اور کاٹنے میں صرف دو مہینے کافی ہوتے تھے. ان کی زندگی عجیب قسم کے عیش وتنعم میں گزرنے لگی. رات دن باغوں میں پڑے رہتے تھے. ملک اس قدر سرسبز و شاداب ہوگیا تھا جس پر دوسرے ممالک رشک کرتے تھے مولانا رومؒ مثنوی میں فرماتے ہیں[6]۔

داد حق اہل سبا را بس فراغ صد ہزاراں قصر و ایوانہا و باغ
بسکہ می افتاد از پی می شمار تنگ می شد معبر و بر راہ گذار

مورخین "سد مارب" کی بنا وتعمیر میں مختلف نام بیان کرتے ہیں لیکن تاریخ کی معتبر روایات کی بنا پر ان میں ملکہ بلقیس کے نام کو ترجیح حاصل[7] ہے جس کا زمانہ تقریباً سنہ ۹۵۰ ق م ہے لیکن وہ اس کی تعمیر کو پورا نہ کر سکی اور اس کے

---

۱ معجم البلدان ج ۷، صـ۳۵۵۔ ۲ بغوی ج ۴ صـ۱۸۹۔ ۳ البدایہ والنہایہ ج ۲ صـ۱۵۹۔ ۴ تفسیر طبری ج ۲۲ صـ۴۸۔
۵ یاقوت ج ۷، صـ۳۵۵۔ ۶ مراۃ المثنوی دفتر سوم صـ۱۲۶۔ ۷ مشہور جغرافیہ داں یاقوت حموی نے معجم البلدان ج ۷،
صـ۲۵۴ اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ ج ۲ صـ۱۵۹ میں اس سد کا بانی سبا بن یشجب کو قرار دیا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بعد اس کے جانشینوں نے اس کو پورا کیا۔ سد مارب قوم سبا کی انجینیری کا بے مثل کمال ہے جس کی بدولت عرب اعیار ریگستانی ملک لالہ زار بن گیا اور ملک کو قحط آب کی مصیبتوں سے نجات ملی۔

ایک متمدن سلطنت کے لیے پارلیمنٹ کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ سبا کی پارلیمنٹ میں ۳۱۲ ممبر تھے جن سے اہم امور میں مشورہ کیا جاتا تھا۔ رائے زنی ہوتی تھی اور بادشاہ ان میں سے کسی رائے کو اختیار کرلیتا تھا یا خود کوئی رائے پیش کرتا تھا جس پر تمام پارلیمنٹ رضامند ہوجاتی تھی۔ اس پارلیمنٹ کے ایک اجلاس کا بیان قرآن نے بھی کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دعوت نامہ ملکہ بلقیس کو ملا تو اس نے مجلس شوریٰ طلب کی، اور دعوت نامہ پڑھ کر سنایا۔ ممبران نے مقابلہ اور جنگ کی رائے پیش کی لیکن ملکہ نے اس کے برخلاف قبول دعوت کی تجویز پیش کی اور اسی پر عملدرآمد ہوا۔ اس سے ان کے نظام حکومت کا پتہ چلتا ہے کہ نہ تو بالکل جمہوریت تھی جس میں صدر جمہوریہ کی حیثیت صرف ایک ممبر جیسی ہوتی ہے اور نہ بالکل مطلق العنان ملوکیت تھی جس میں بادشاہ مختار مطلق ہوتا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان تھی جو اعتدال کی راہ ہے۔

حکومت کی طاقت و قوت اور شوکت و عظمت کا مدار دراصل فوج و پولیس کی عمدگی پر ہوتا ہے سبا کے یہاں بھی یہ چیزیں موجود تھیں۔ ان کو قوت و شجاعت ورثہ میں ملی تھی ان کا مورث اعلیٰ سبا بن یشجب ایک بہت بڑا فاتح تھا جس نے معین کی سلطنت کا خاتمہ کرکے خود اپنی حکومت قائم کی تھی۔ وہ بہت دلیر اور شجاع تھا۔ سلطنتوں کا تہ و بالا کرنا اس کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ ہزیمت خوردہ فوج کو غلام بنالیتا تھا جس کی بدولت وہ سبا، کے گھناؤنے نام سے مشہور ہوا۔ یہی جوہر جو سبا بن یشجب کو فاتحین کی صف اول میں لاکھڑا کرتا ہے اس کے بعد اس کی اولاد میں بھی باقی رہا چنانچہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کی ملکہ بلقیس سے اطاعت طلب کی تو حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے لاؤ لشکر والے بادشاہ کے جواب میں شوریٰ نے جو فیصلہ کیا وہ یہی تھا کہ ہم کسی کی اطاعت نہیں کرسکتے اور جس پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن خود حافظ ابن کثیر نے اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے نیز درایت سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کیونکہ سبا کا زمانہ ۱۰۰۰ ق م ہے اور جدید اکتشافات کے مطابق اس کے بنانے والوں کا زمانہ ۸۰۰ ق م تک ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ چار صدی کی طویل مدت اس کی تعمیر میں صرف ہوئی ہو کیونکہ یہ کوئی بہت بڑی دیوار نہیں تھی بلکہ اس کا طول ۱۵۰ فیٹ اور عرض ۵۰ فیٹ تھا اس لیے اس کی اول بانی ملکہ بلقیس (۹۵۰ ق م) کو قرار دینا چاہیے اور ۸۰۰ ق م اس کے اتمام کا زمانہ قرار دیا جائے تو اب یہ تعمیہ ڈیڑھ صدی میں پوری ہوجاتی ہے (قیمہ) ۱؎ تفسیر ابن جریر ج ۱۹ ص ۱۱۔

بادشاہ کو غلام بنانے کا جنون سوار ہوا وہ سمجھ لے کہ اس کے وجود سے دنیا بہت جلد پاک ہونے والی ہے ہم بہادر ہیں کسی کے غلام نہیں بن سکتے ؛ ہمارے پاس ایسے اسلحہ ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ؛ ان کے پاس فوج اور سامان حرب کثیر مقدار میں موجود تھا بعض حضرات ان کو عافیت کوش اور جنگ سے نا آشنا خیال کرتے ہیں لیکن صحیح نہیں مندکرہ بالا امور اس کی تردید کے لیے کافی ہیں نیز قرآن سے مختلف شہادتیں ملتی ہیں ان میں سب سے زیادہ صریح "نحن اولو قوۃ واولو باس شدید" ہے جس کی تفسیر میں مفسرین شجاعت، قوت جنگی سامان وغیرہ کا تذکرہ کرتے ہیں[1]۔

سبا کے مذہب کا تعین بہت دشوار ہے بعض لوگ ان کو مشرک کہتے ہیں اور بعض موحد و خدا پرست؛ لیکن آخر صحیح کیا ہے؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے تاہم ذیل میں اسی کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سبا کے مذہبی حیثیت سے چار دور ہیں پہلا دور سبا بن یشجب سے شروع ہوتا ہے یہ موحد تھا اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے زمانہ سے پہلے ہی توراۃ کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ایمان لا چکا تھا۔ ان اشعار کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جن سے اس کے اسلام کا اندازہ ہو سکتا ہے[2]۔

"ہمارے بعد ملک ایک بڑے بادشاہ (حضرت سلیمان علیہ السلام) کے قبضہ میں ہوگا جو نبی ہوں گے اور برے کاموں سے باز رکھیں گے اس کے بعد طوائف الملوکی ہوگی۔ پھر بنو قحطان کے بعد ایک عظیم الشان نبی (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس ملک پر سلطنت کریں گے جس کا نام (مبارک) احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا۔ کاش! میں ان کا زمانہ پاتا اور مصیبتوں میں ان کی امداد کرتا لیکن بھائی: ہماری اتنی عمر کہاں! اگر تم ان کا زمانہ پاؤ تو ان پر ایمان لانا اور میرا سلام پہنچا دینا"

ان سے اس کے اسلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک زمانہ تک سبا پر یہی دور رہا۔ وہ اسلام پر ثابت قدم رہے اور پھلتے پھولتے رہے اس کے بعد وہ اسلام سے ہٹنے لگے اور ستارہ پرستی کا رنگ ان پر غالب آنے لگا بالآخر اس کا اثر بادشاہ تک پہنچا، شاہی مذہب ستارہ پرستی قرار پایا اور بلا روک ٹوک ملک میں ستاروں کی پرستش ہونے لگی ان کے لیے عمارتیں بنائی گئیں جن میں ان ستاروں کی تصویریں رکھی گئیں۔ ان پر قربانیاں چڑھائی جاتی

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۱۹ ص ۸۷ و تفسیر ابی السعود ج ۴ ص ۱۳۰۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۱۔

تھیں اور آمدنی کا ایک مخصوص حصہ ان کی نذر کیا جاتا تھا۔ سبا میں خاص طور سے سورج کی پرستش کی جاتی تھی لیکن چاند اور زہرہ کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ ان کے اس دور کو "یسجدون للشمس" سے تعبیر کیا ہے۔ آخر یہ [illegible] بھی ختم ہوا اور ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت قبول کی۔ اب پھر سلطنت سبا میں وحدانیت کا دور دورہ ہوگیا۔ رعایا، حکومت سب خدا پرست اور موحد بن گئے جس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے: "واسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین"۔ ایک مدت تک ان کا یہی حال رہا بلکہ یک حالات نے پلٹا کھایا اور انھوں نے پھر سرکشی و نافرمانی شروع کردی جس کو قرآن نے "فاعرضوا" سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ تباہ و برباد کردیے گئے۔

[illegible] کے چار مستقل دور ہیں جن کو قرآن نے بالتصریح بیان کیا ہے۔

[illegible] عظیم الشان سلطنت تھی اس کا تمدن بہت اونچا تھا بادشاہ تاج پہنتا تھا جو جواہرات سے تیار کیا جاتا تھا۔ بادشاہ قدیم دستور کے مطابق سونے کے زیورات بھی استعمال کرتا تھا۔

[illegible] سبا کا ترفہ انتہائی ترفہ تھا وہ معمولی لکڑیوں کے بجائے عمدہ خوشبودار لکڑی جلاتے تھے۔

[illegible] سونے، چاندی اور جواہرات کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ ان میں عجیب عجیب قسم کے بیل بوٹے بنائے جاتے تھے یہ برتن بہت نازک اور دیکھنے میں بے انتہا خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

ان کے سکوں میں بادشاہ کی تصویر وغیرہ نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے بجائے پایہ تخت اور قصر ہی کا نام ہوتا تھا۔

[illegible] حکومت کا استحقاق صرف شاہی خاندان کو حاصل تھا۔ بادشاہ کا بڑا لڑکا پیدائشی طور سے حکومت کا حقدار سمجھا جاتا تھا اور اس کو یہ ملک اپنے باپ سے وراثت میں ملتا تھا۔

قوم سبا پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرح بے انتہا احسانات کیے تھے ان کو ہر قسم کی راحتیں حاصل تھیں [illegible] کے گھر پیدا ہوتا تھا میوؤں کے جنگل ان کے لیے وقف ہوتے تھے شہر کی آب و ہوا معتدل تھی ان کو کسی موذی جانور کا خوف نہ تھا وہ اگر تجارت کرتے تھے تو شام تک بے خوف و خطر سفر کرتے تھے راستہ میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت آسان منزلیں مقرر کردی تھیں صبح کو چل کر دوپہر کو کسی آبادی میں قیام کرتے اور پھر دوپہر

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹

کے بعد شام کو کسی بستی میں منزل کرتے تھے۔ ان کو زاد راہ کی مشقت نہ تھی۔ سد مارب کی وجہ سے ان کی زمینیں جس قدر سرسبز و شاداب تھیں عرب میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں نہ اس سے پہلے کبھی عرب کو یہ شادابی نصیب ہوئی اور نہ بعد۔ لیکن انھوں نے ان نعمتوں کی کوئی قدر نہ کی۔ ان کو اپنی محنت و سعی کا نتیجہ خیال کیا، خدا کو بھول گئے اور اس کی نعمتوں کو برباد کرنا شروع کیا ان کو اپنی ملک سمجھ کر اس میں آزادانہ تصرف کرنے لگے معصیت کاری، شراب نوشی رات دن کا مشغلہ بن گیا تھا جس نے انھیں سست اور کاہل بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعہ ان کو تنبیہ کی کفر و شرک کی برائیاں بتلائیں لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا تیرہ پیغمبران کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے[1] وہ ان کو برابر چوکاتے رہے لیکن وہ عیش کے نشہ میں بدمست ہوتے جا رہے تھے پیغمبر خدا کے احسانات ان کو یاد دلاتے تھے لیکن وہ ان نعمتوں کو اپنی محنت و کوشش کا ثمرہ سمجھتے تھے پیغمبران کو خدا کے سامنے جھکانا چاہتے تھے لیکن وہ چاند اور سورج کے سوا کہیں جھکنا نہیں چاہتے تھے پیغمبر اپنا فرض ادا کر رہے تھے وہ ان کی تکذیب کرتے اور بدنصیب قوموں کی طرح پیغمبروں سے ان کی صداقت کے لیے عذاب طلب کرتے تھے۔

جب قوم کی معصیت اور سرکشی انتہا کو پہنچ گئی اور انھوں نے اپنے اوپر ہدایت کے تمام راستے بند کر لیے تو قانون خداوندی کے مطابق ان پر تباہی و بربادی مسلط ہونے لگی سنہ ۱۱۵ ق م میں سد مارب پر بڑے بڑے چوہے سوراخ کرتے ہوئے پائے گئے چوہے سد کے پتھروں کو کھوکھلا کر دیتے تھے یہاں تک کہ اس میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے۔ برسات میں جب سیلاب آیا تو سد میں سوراخ ہونے کی وجہ سے پانی نہ رک سکا دیوار تباہ ہو گئی اور ہر طرف پانی پھیل گیا جس سے ان کی کھیتیاں تباہ و برباد ہو گئیں۔ زمین قابل کاشت نہ رہی اور سارے خطہ میں ریت ہی ریت نظر آنے لگی میوے خراب ہو گئے اور باغ اجڑ گئے اور اس طرح خانماں برباد ہوئے کہ جس نے بالآخر ترک وطن پر مجبور کر دیا سبا کی یہ بربادی عرب میں ضرب المثل بن گئی ہے عرب جب کسی کی تباہی و بربادی بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں "تفرقوا ایادی سبا" یعنی خاندان سبا کی طرح تباہ و برباد ہوا چنانچہ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

ایادی سبا یا عزہ ماکنت بعدکم ‌ ‌ ‌ ‌ فلم یحل بالعینین بعدک منظر

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۹

غرض جب تک تجھ سے دور رہتا ہوں دل خاندان سبا کی طرح پریشان رہتا ہے اور کوئی چیز اچھی معلوم نہیں ہوتی۔

مارب کی بربادی پر ایک دوسرا عرب شاعر اعشیٰ بن قیس اس طرح نوحہ کرتا ہے[1]

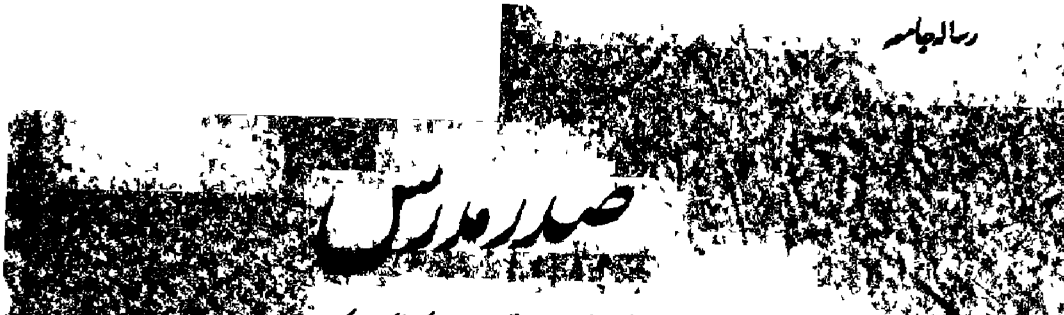
"ملوک حمیر نے مکانات اور باغ بنائے، پانی کا بہت اچھا انتظام کیا جس سے کھیت کیاریوں میں پانی پہنچتا تھا لیکن آہ! سیلاب نے ان کو برباد کردیا اور وہ ایسے محتاج ہوئے کہ پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترسنے لگے۔ سمجھدار کے لیے اس میں عبرت ہے۔"

سبا کی یہ بربادی نتیجہ ہے ان کی معصیت کاری اور غفلت کوشیوں کا۔ انھوں نے انعامات خداوندی کی قدر کرنے کے بجائے کفران نعمت اختیار کیا اور بنی اسرائیل کی طرح عیش و تنعم میں پڑ کر خدا کو بھول گئے۔ جہاں تک تاریخ عالم سے تعلق ہے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قوم نے بھی خالق حقیقی سے سرکشی کی اور لذات نفس میں مبتلا ہوئی تو قانون قدرت نے اس کو نظارۂ عبرت بنا کر رکھ دیا۔

فاعتبروا یا اولی الالباب!

سید زاہد الرضوی قیصر فاضل دیوبند

[1] ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۵



صدر مدرس

قدیم زمانے میں صدر مدرس کے متعلق یہ تصور قائم کیا گیا تھا کہ وہ ایک نہایت تند اور ایک صحت مزاج کا آدمی ہوتا ہے۔ جو کمال سنجیدگی سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر ہر خطا وار لڑکے کو سخت سے سخت سزا دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تصویر کی بنیاد بڑی حد تک ڈکنس ([illegible]) کی ڈیوڈ کاپر فیلڈ نامی ناول میں اس کے تعلیمی پہلو کے مطالعہ کے اثرات پر رکھی گئی تھی۔ لیکن بہت جلد اس بھیانک تصور کے ارتسامات مٹتے مٹتے دماغوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ اور صدر مدرس کے متعلق یہ تصور قائم ہوا کہ وہ ایک نہایت مہربان اور نہ صرف مدرسہ کی حد تک بلکہ ساری دنیا میں ایک قابل وقار ہستی ہے۔ موجودہ صدی اسی تصور کی حامل ہے۔

یوں تو تربیت سے بھی ایک فرد کامیاب صدر مدرس ہو سکتا ہے مگر اس کی اصل کامیابی کے لئے اس کی ذاتی خصوصیات کو بڑا دخل ہے۔ وہ خصوصیات جو ایک مدرس کے لئے ضروری ہیں۔ صدر مدرس میں بدرجہ اتم پائی جانی چاہئیں مثلاً قابلیت۔ ایمان داری اور جفاکشی۔

صدر مدرس کے فرائض کے سلسلے میں مصنف برسے یوں رقمطراز ہے (۱) انتظام (۲) تدریس (۳) نگرانی (۴) امتحان۔ یعنی ضبط اور تعلیمی عام نگرانی صدر مدرس کے فرائض کے جزو لاینفک ہیں۔ رَیَن لکھتا ہے کہ صدر مدرس ناظم یعنی اسکیمیں بنانے والا اور منتظم یعنی ان اسکیموں کو روبہ عمل لانے والا ہونا چاہیئے۔ جب یہ دونوں خصوصیات صدر مدرس میں پائی جائیں تو توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک کامیاب حکمران بھی ہو سکے گا۔

حکام بالادست کی گشتیوں میں ایک عام نقطہ نظر مضمر رہتا ہے اور مقامی حالات ان سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ صدر مدرس میں یہ اہلیت ہونی چاہیئے کہ ان گشتیات اور مقامی حالات میں ایسا تطابق پیدا کرے کہ ایک طرف مقامی حالات غیر معمولی طور پر متاثر نہ ہو سکیں اور دوسری طرف

کتیات کا منشا بھی فوت ہو جائے۔ صدر مدرس ایک مصلح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو رسم ورواج کی بیجا پابندیوں سے چھٹکارا دلانے کے لئے بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ اور حقیقی معنوں میں قوم کی ترقی میں گرانقدر اور قابل لحاظ اضافہ کرنے کا جتنا موقع اس کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں ہے۔

صدر مدرس کو طلبا، اساتذہ اور والدین کی توجہات کا مرکز ہونا چاہیئے۔ اور اس میں علمی قابلیت سے زیادہ انتظامی قابلیت ہونی چاہیئے یعنی ⅓ علمی قابلیت ہو تو ⅔ انتظامی قابلیت۔ صدر مدرس میں معائنہ کرنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی صورت میں طلبا۔ کی تعلیمی حالت کا اور غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی صورت میں اساتذہ کے طریقہ تعلیم کا۔ لیکن مناسب ہے کہ ہر دو صورتوں میں دونوں کا معائنہ کیا جائے۔ تاکہ طریقہ تعلیم اور اس کے اثرات کے نتائج سے واقفیت ہوتی رہے۔ معائنہ دو اقسام کا ہو سکتا ہے

۱۔ انتصابی:۔ صدر مدرس ایک دن یہ ارادہ کرکے آئے کہ آج صرف جغرافیہ کے ہی مضمون کا معائنہ کروں گا۔ پس اس کو چاہیئے کہ جماعت دوم سے دہم تک جغرافیہ کی تدریس کا معائنہ کرے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ ہر جماعت میں جغرافیہ کا معیار اور دیگر تفصیلات کا علم ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ افقی:۔ ایک جماعت کے چند مضامین کا معائنہ کرے اس کے بعد دوسری جماعت کے چند مضامین کا۔ زیادہ مناسب ہے کہ صدر مدرس پہلی قسم کو ہمیشہ ترجیح دے۔ صدر مدرس کا معائنہ شخصی اور غیر شخصی ہو سکتا ہے۔ شخصی میں خود اور غیر شخصی میں امتحان کے ذریعہ معائنہ کرے۔ صدر مدرس کے لئے شخصی معائنہ ضروری ہے۔

طلباء کا کام دیکھتے وقت مندرجہ ذیل امور بطور خاص ملحوظ رکھے جائیں۔

۱۔ عام حالت۔ زائد نصاب مصروفیات سے زیادہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۲۔ معیار تدریسی:۔ ذہنی کیفیت اور طریقہ نشست۔

۳۔ گھر کے حالات جو تعلیمی امور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

۴- جسمانی حالت

۵- شوق-

۶- [illegible]ان کی حالات

۷- خاص دلچسپی کا مشغلہ

مدرس کے کام کا معائنہ کرتے وقت حسب ذیل امور ملحوظ ہونے چاہئیں:-

۱- مدرس اپنی زندگی میں کسی ناساعد حالات سے تو دوچار نہیں ہوا ہے۔ اگر ہوا ہے تو اس کا اس پر کیا اثر پڑا ہے۔

۲- مدرس کی قابلیت بلحاظ استاد۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھا جائے کہ کہاں کہاں علم حاصل کیا ہے۔

۳- جسمانی حالت۔ یہ بہت اہم اور ضروری ہے۔

۴- سماجی کردار۔ مدرس کن لوگوں سے ملتا ہے۔ اور سماج میں اس کا کیا مرتبہ ہے۔

۵- وجاہت۔ کپڑے وغیرہ کس طرح اور کیسے پہنتا ہے۔

صدر مدرس کو تنقید کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مگر طلباء کی موجودگی میں اگر تنقید نہ کی جائے بلکہ علیحدہ طور پر یا اساتذہ کی مجلس میں کی جائے تو اس کا اچھا اثر ہوگا۔ تنقید دل آزار یا محض غلطی بتلانے کے لئے نہ ہو بلکہ تعمیری ہو، اور جس سے مدرس کو رہبری حاصل ہوتی ہے۔ ایک کامیاب صدر مدرس اپنے ماتحتین کی غلطیاں اپنے ذمے لیتا ہے اور ان پر مثل خیمے کے سایہ فگن رہتا ہے۔ امریکہ اور جاپان کے صدر مدرسین اس کے بہت عادی ہوتے ہیں۔ صدر مدرسی کے عہدہ پر فائض ہونے کے بعد اسے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی مدرسی کے مشکل سمندر کو عبور کر کے امن اور چین کے کنارے پہنچ گیا ہے۔

محمد مختار احمد بی ایس سی۔ ڈپ یڈ۔ اردو فاضل

مددگار مدرسہ فوقانیہ ضلع کریم نگر (حیدرآباد دکن)

(شئے کہنہ)

اسیر لکھنوی

مدبر الدولہ، مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر اسیرؔ تلمیذ مصحفی اپنے وقت کے اچھے صاحب علم و فضل بزرگ اور شاعری میں استادِ کامل مانے جاتے تھے۔ انھوں نے فارسی کی تحصیل سید مہدی علی مرحوم سے کی اور کتب عربیہ، صرف و نحو، منطق و فلسفہ، حکمت، حساب، معانی و بیان علمائے فرنگی محل سے۔

اودھ کے تین بادشاہوں کے عہد میں وہ معزز عہدوں پر رہے یعنی آٹھ سال [illegible] ساڑھے چار سال [illegible] امجد علی بادشاہ اور چار سال واجد علی شاہ کے مصاحب رہے۔ ان کا [illegible] بہت وسیع تھا جن میں اکثر اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے خود ان کا ذاتی کمال پرگوئی تک محدود ہے۔ ان کا زیر نظر دیوان ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا ۔۔۔ صفحات کے دیوان میں اشعار ذیل قابل قدر ہیں۔

حیرت ہوئی یار کے نظارے سے خلق کو — عالم تمام عالم تصویر ہو گیا

ہو اشکست سے ہم میکشوں کو کیا نقصان — سبو جو ٹوٹ گیا ساغر شراب ہوا

[illegible] نقاب وہ رخ آفتاب محشر ہو — کھلے جو یار کا بند نقاب کیا ہو گا

اب کیوں خلش ہو نشتر مژگان یار کو — کیا آنسوؤں کے ساتھ لہو کم نکل گیا

جب تک جیے جہاں میں مر مر کے ہم جیے — جس خوبرو پہ آنکھ پڑی دم نکل گیا

برنگ آئینہ روشن ہو میری یک رنگی — اسی کی شکل بنا جس سے میں دوچار ہوا

تفاوت کون نیک و بد میں ہے — خدا ہے ایک رند و پارسا کا

میں اس چمن میں طائر نکہت ہوں اے صبا — جو گل ہوا شگفتہ مرا آشیاں ہوا

دنیا سے اٹھ اس دل ہو کب کا — [illegible] دیرے منتظر طلب کا

کس کو کرتی نہیں یہ گردش ایام جدا — [illegible] سے مہر جدا صبح سے ہو شام جدا

تو خورشید ہے تو میں شبنم — میں کہاں جب ترا ظہور ہوا

بدلے کا غیض و غم میں مرا حال زار کیا — افسردہ خاطروں کو خزاں کیا بہار کیا

مثل حباب آب ہے دم بھر کی زندگی — ہم کیا ہماری ہستی ناپائیدار کیا

تن خاکی میں ہے یوں روح پابند — حباب آب میں جیسے ہوا بند

رہا کر روح کو قالب سے یارب — ہے زنداں میں یوسف تا کجا بند

زمانہ کی ہے یہ طاقت اکہ کوئی دم ٹھہرے — پھرا رہی ہے یہ تیری نگاہ کی گردش

خاموش رہے جو گئے دیر و حرم میں — دونوں نظر آئے نہ مناجات کے قابل

تو حمد کے قابل ہے ذرا شک نہیں اس میں — لیکن ہے کہاں حمد تری ذات کے قابل

زمانہ کی خبر سے ہم کو کیا کام — اسیر اپنی نہیں رکھتے خبر ہم

دکھائیے مجھے دیدار ہو چکا انکار — جو آپ برق تجلی ہیں تو کلیم ہوں میں

یارب یہ کس کے سجدہ در کا ہے اشتیاق — مانند آفتاب سراپا جبیں ہوں میں

ہستی تو ہے مگر کہیں میرا نشاں نہیں — بے جسم روح ہوں مجھے قید مکاں نہیں

جب تک کہ ہم جہاں میں ہیں قائم ہے سب جہاں — جب ہم نہیں جہاں میں گویا جہاں نہیں

فصل گل آتے ہی ساقی! باغ میخانہ بنا — جام ہے ہر ایک گل، ہر سرو! مینا ان دنوں

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو — حسن بے پردہ ہے پر تاب تماشا کس کو

پہنچ کے سامنے اس کے یہ حال ہوتا ہے — کہ ہم کو آپ میں آنا محال ہوتا ہے

کب آتے ہیں وہ جھوٹ یہ آنے کی خبر ہے — ناداں میں نہیں مجھ کو زمانہ کی خبر ہے

بیہوش میں آیا تھا گیا دہر سے بیہوش — آنے کی خبر مجھ کو نہ جانے کی خبر ہے

منزل دہر میں ہم گرم سفر بیٹھے ہیں — کوچ میں دیر نہیں صبح چلے شام چلے

دور آخر تو نہ ہم عیش سے محروم رہیں — ساقیا! عمر چلی، جام چلے، جام چلے

مرسلہ: حبیب کیفوی

ثمرات

[illegible]ن الیا یہ زلف کو برہم کئے ہوئے
[illegible]امانِ انتشارِ دو عالم کئے ہوئے

[illegible]یوجہ تو نہیں ہے جبیں پہ سرِ خم
[illegible]ہے اعتراف عظمت آدم کئے ہوئے

دیکھا ہے کس کا روئے نگاریں کہ بر نظر
ہے لاکھ جنتوں کو فراہم کئے ہوئے

[illegible]ل اپنے نقد بہت دل کا عیار سنج
دل کو حوالۂ ہوسِ غم کئے ہوئے

[illegible]تے ہیں اُس نگہ فتنہ زا کے رنگ
یعنی ہوں سیر گردش عالم کئے ہوئے

[illegible]اتی کرم کی کاسۂ درویش پر نظر
مدت ہوئی ہے پیروی جم کئے ہوئے

[illegible]ل ہو فروغ جلوہ جاناں سے کامیاب
ہر مہر پاس خاطر شبنم کئے ہوئے

[illegible]اتی ایاغِ بادۂ رنگیں کہ زہد خشک
ہے عیش رندگی کو جہنم کئے ہوئے

[illegible]تی نہیں چھپانے سے الفت کی داستاں
کیا تم ہے یہ دیدۂ پُرنم کئے ہوئے

[illegible]ل ہم ہیں بادہ خوار مگر کیسے بادہ خوار
اسرارِ کائنات سے محرم کئے ہوئے

[illegible]ہے تجھے بھی یاد ہوں اے خوگرِ جفا
تھے وعدہائے لطف جو پیہم کئے ہوئے

[illegible]ت پذیر اور ہوائے چرخ چنبری
اندازۂ بلندیِ آدم کئے ہوئے

آئی سحر جہاں کے ہر اک کوہ و دشت کو
ہے جلوہ زار نیّرِ اعظم کئے ہوئے

چونکو طلسم خواب سے اے ساکنانِ شرق
اُٹھو بلند عزم کا پرچم کئے ہوئے

[illegible] تمہاری بارگہ پُرشکوہ میں
تھے مہر و ماہ اپنی جبیں خم کئے ہوئے

یا آج وہ شکوہ، وہ اقبال تو کجا
بیٹھے ہو سازِ مجلسِ ماتم کئے ہوئے

تفسیر زندگی جسے کہتے ہیں اے نہالؔ
ہے زندگی کو اور بھی مبہم کئے ہوئے

نہالؔ سیوہاروی

...ھے کھیل

... ہے، آخر منھ کی کھائے ...ر کی خاطر خون بہائے لیکن خاک نہ پائے!
...ب کی جھولی بھرنے والا، اور دامن پھیلائے ۔ ہرے بھرے کھیتوں کا خالق اور فاقوں مر جائے!

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے!

...وی کوہساروں کی، یہ البیلی چرواہی ۔ جس کی ایک نظر پڑتے ہی رستہ بھولیں راہی
بجلی بن کر ٹوٹ پڑے جس کی مخمور نگاہی ۔ اور اک دولت والا آ کر اس کا مول چکائے!

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے!

گاؤں کے یہ گبرو کڑیل، مستانے، متوالے ۔ دہقانی ماؤں کے پالے، سادے بھولے بھالے
جن کے ساتھی ٹھنڈے جھونکے اور بارش کے جھالے ۔ ان کو اک منحوس مہاجن ہتھکڑیاں پہنائے!

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے!

مٹی کے معصوم گھروندے حسن کی جلوہ گاہیں ۔ کھیتوں میں ہل پر بل کھاتی پتلی پتلی راہیں
یہ جنگل، پاتے ہیں جن میں مست طیور پناہیں ۔ ان کی جگہ منعم، مرمر کی محل سرا بنوائے!

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے!

آزادی کا رسیا، کھا جائے لوگوں کا چندہ! ۔ ایک خدا کو ماننے والا اور شاہوں کا بندہ!
...ت پر کٹ مرنے والا، اور پیسے کا دھند... ۔ شاعر اور بھانڈوں کی طرح نوابوں کے گن گائے!

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے!

احمد ندیم قاسمی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

بچوں کے کچھ مسائل:- سائز کتابی حجم ۳۰۰ صفحات، چھپائی صاف ستھری، شکل و صورت متین، کاغذ عمدہ، زبان ہندی، قیمت ۲ روپے ملنے کا پتہ ودیا بھون، اودے پور (راجپوتانہ)

زیر نظر کتاب کالولال صاحب شریالی ایم۔ اے بی۔ ٹی کی تصنیف ہے۔ شریالی صاحب ودیا بھون ہائی اسکول کے پرنسپل کی حیثیت سے گزشتہ دس سال سے تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں آپ عام علمی دلچسپی کے علاوہ عملی نفسیات میں خاص نظر رکھتے ہیں آپ کے شوق کی بار پر ہی ودیا بھون میں ایک نفسیاتی معمل بھی نظر آتا ہے۔ لہذا شریالی صاحب کی یہ تصنیف نفسیاتی نظریات اور خشک علمی بحثوں کا کوئی مجموعہ نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ کی حامل ہے۔ شریالی صاحب عام دلچسپی کے تعلیمی موضوعات پر انگریزی میں کافی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ہندی میں یہ کتاب ان کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب عوام کے لیے کس قدر دلچسپ اور مفید ہوسکتی ہے اس کا اندازہ اس کے عنوانات سے لگا لیجیے۔ (۱) بچوں کی دنیا (۲) بچوں کے کھیل اور کھلونے۔ (۳) بچوں میں خوف (۴) چڑچڑا بچہ (۵) چڑھانے والا بچہ (۶) بچھڑنے والا بچہ (۷) مائل بہ جرم بچہ (۸) خاندان میں بچے کی تعلیم (۹) بچے کا دودھ چھڑانا (۱۰) عادت (۱۱) جوانی (۱۲) جنسیت (۱۳) بچہ اور دولت (۱۴) اسکول میں بچہ کی تعلیم (۱۵) مخلوط تعلیم (۱۶) ضبط و تادیب (۱۷) تعلیم اور سماج۔ اس کتاب کے سترہ باب میں مفید اور دلچسپ معلومات کے علاوہ شریالی صاحب کا انداز تحریر بھی بہت اچھوتا ہے یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں زبان زیادہ سخت ہوگئی ہے۔

سلاطین دہلی کا نظام حکومت (بزبان انگریزی) از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی۔ ناشر محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور، تعداد صفحات ۲۸۸، سائز ۲۲×۱۸۔ قیمت آٹھ روپے۔ کاغذ و طباعت اعلیٰ قسم۔

دہلی میں بہ استثنائے مغول جن خاندانوں نے حکومت کی یعنی خلجی، غلامان، تغلق، لودی وغیرہ ان سب کے

طرزِ حکومت پر یہ کتاب ایک مفید اور کارآمد تالیف ہے اور بڑی کاوش اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے۔ ابتدا میں ایک تحقیقی مقدمہ کے بعد خلافت، حکومت پر بحث کرتے ہوئے شعبہ جات ڈیوڑھی، قاضی، وزارت، مالیات فوج، عدل، پولیس، امور مذہبی، تعلیم، حکومت کی پالیسی وغیرہ مسائل پر مغز بحث کی گئی ہے اور جگہ جگہ مستند شہادتیں پیش کرتے گئے ہیں۔ کتاب بہر صورت مفید اور مکمل ہے اور تاریخ کے طلبا کے لیے خصوصاً اہم ہے اگر اس کا اردو میں بھی ترجمہ شایع کر دیا جائے تو اس کی افادیت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ (ص۔ ع)

کلامِ حرماں :- از حرماں خیرآبادی ملنے کا پتہ دفتر مجلس اردو نمبر ۲۹ شرجی بلاک، ماڈل ٹاؤن لاہور، تعداد صفحات ۲۸۸، سائز ۲۲×۲۹/۱۶، قیمت دو روپے، کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

حرماں صاحب پرانے کہنے والے ہیں لیکن آلام روزگار نے فرصت نہ دی کہ جگر لخت لخت کو جمع کرتے بارے اب ان کا کلام پہلی دفعہ کتابی صورت میں آگیا ہے۔ رسائل میں برابر آپ کی غزلیں نظر آتی رہتی ہیں طبیعت کو غزل سے زیادہ مناسبت ہے لیکن نظم بھی بے تکلف کہتے ہیں۔ طرز کلام میں شوکت ہے اور معانی میں بلندی اور نزاکت مضامین کی کوشش جہاں کہیں کامیاب ہو جاتی ہے تو آپ کے اشعار لطف دیتے ہیں چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

بنا رسجدہ ہوں سجدہ کی ابتدا ہوں میں — جو خود نما ہیں وہ دیکھیں خدا نما ہوں میں
سجدہ گاہ اہل دل بعد فنا ہو جایئے — صفحۂ ہستی پہ اک نقش وفا ہو جایئے
کہو کس طرح ہوں قائل سکون قلب مضطر کے — ذرا جنبش ہوئی پیدا ہوئے آثار محشر کے
میرا سجود منحصر آستاں نہیں — اے صاحب مکاں تجھے قید مکاں نہیں
اک انداز وارفتگی ہے نہ پوچھو — کسے دیکھتا ہوں، کہاں دیکھتا ہوں

(م۔ ع)

عرب اور حبشی تعلقات اور نو دستیاب شدہ مکتوب نبوی } از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ، ملنے کا پتہ مکتبہ مجلہ نظامیہ حسینی علم حیدرآباد دکن صفحات ۴۴، سائز ۲۲×۱۸، قیمت ۸ر کتابت و طباعت اچھی

زیر نظر کتابچہ بہ اعتبار موضوع بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سے قبل اسلام اور ابتدائے اسلام میں حبش اور عرب کے تعلقات پر کافی روشنی پڑتی ہے مزید یہ کہ اس مقالہ میں ایک نئے مکتوب نبوی کی تلاش کی ہے اور اس مکتوب کے اصلی ہونے پر وضاحت سے بحث کی ہے مکتوب کا عکس بھی دیدیا گیا ہے مقالہ تحقیقی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

(م۔ ع)

جہانگیر کا روز نامچہ (حصہ اوّل):- مرتبہ خواجہ حسن نظامی۔ ملنے کا پتہ خواجہ اولاد کمپنی، اردو بازار دہلی۔ صفحات ۲۱۲ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ قیمت بلا جلد عہ مجلد ہمر۔ کاغذ، کتابت، طباعت معمولی۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے اخبار "منادی" میں یہ ترجمہ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اب اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ایک بہت ضروری اور اہم کام انجام دیا ہے۔ تزک کی فارسی آسان ہونے کے باوجود عوام کے لئے بیکار تھی۔ بڑی خوبی اس کی یہ ہے کہ تزک ایک افسانہ کی طرح دلچسپ بھی ہے اور ایک جلیل القدر شہنشاہ کا روز نامچہ ہے اس لئے اہم بھی۔ قابل مطالعہ چیز ہے۔ ترجمہ سلیس اور آسان ہے۔ اس حصہ میں خسرو کی بغاوت تک کے حالات ہیں۔

ملت ابراہیم:- مرتبہ عرشی امرتسری۔ ملنے کا پتہ دفتر امت مسلمہ امرتسر۔ تعداد صفحات ۸۰، قیمت پانچ آنے۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ اس مختصر کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حیات اور دین حنیف کی تشریح قرآن کی آیتوں سے کی گئی ہے۔ نہیں معلوم اس کتاب کا طرز مجادلانہ کیوں رکھا گیا ہے اور اس میں سلبی پہلو کیوں داخل کیا گیا۔ واقعات سیدھے طور پر بیان ہوتے تو بھی مرتب کا مقصد اور محنت بروئے کار رہتی۔

قرآن اور سیرت سازی:- از ڈاکٹر میر ولی الدین استاد فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ صفحات ۲۵۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت اچھی۔ مصنف سے آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کا یہ وہ مقالہ ہے جو انھوں نے مجلۂ علمیہ حیدرآباد اکاڈمی میں چھاپا تھا۔ مقالہ میں موصوف نے علم و یقین اور مجاہدہ پر خاصی بحث کی ہے اور دکھلایا ہے کہ توحید فی المعبودیت اور فی الربوبیت پر ایمان کی بنیاد قائم رکھنے سے خودی میں پختگی پیدا ہوگی اور اس سے عمل و مجاہدہ میں آسانی ہوگی۔

عہد نبوی کا نظام تعلیم:- از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ مجلہ نظامیہ حسینی علم حیدرآباد دکن۔ صفحات ۲۰، سائز ۲۰×۲۶/۱۶، قیمت ۸/ر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

زیر نظر مقالہ وہ مضمون ہے جو معارف، اسلامک کلچر اور مجلہ نظامیہ میں شائع ہو چکا ہے۔ آج کل جبکہ ہر قوم اپنے تعلیمی نظاموں کے احیاء میں مشغول ہے اور خود مسلمانوں کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی اسی غایت سے بنائی گئی ہے ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم پر بھی نظر ڈالی جائے۔ یہ مقالہ ایک بڑی کمی کو پورا کرتا ہے اس میں اسلامی نظام کے قدیم نصب العین کا احاطہ کیا گیا ہے، اور عہد نبوی کے تعلیمی طریق کو تاریخی شواہد و استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مضمون قابل مطالعہ ہے۔

دل کی آواز:- از قیسی رامپوری صاحب، پبلشرز کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۶۲۱۳ بمبئی نمبر ۴۔ صفحات ۲۰۷

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت عہ، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

آخری فیصلہ:- از قیسی رامپوری صاحب، پبلشرز کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶۴۳، بمبئی نمبر ۳ صفحات ۱۸۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت عہ، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

قیسی رامپوری صاحب کی تصنیف کردہ یہ دو رومانی ناولیں ہیں جن میں یہ گُر کامیابی سے برتا گیا ہے کہ دلچسپی آخر نتیجہ تک قائم رہے۔ اس لیے تمام زور پلاٹ پر صرف کر دیا گیا ہے۔ پلاٹ دلکش ہیں۔ زبان اچھی پاکیزہ اور ستھری ہے۔

چراغ لالہ:- از صائب عاصمی۔ ملنے کا پتہ میسرز عطر چند کپور میکلوڈ روڈ لاہور، صفحات ۱۵۸، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عہ، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

ایک نوخیز شاعر کی غزلیات، نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں آپ بیتی بھی لکھی ہے۔ ابھی ابتدا ہے اگر مشق جاری رہی تو امید ہے کہ اپنے لیے کوئی جگہ دنیائے شاعری میں نکال لیں۔ ابتدا ہی سے اگر انتخاب کلام شائع کیا جایا کرے تو خود شاعر کے لیے بھی بہت مفید ہو۔

راج نیتی:- مرتبہ رگھوبنس چوپڑہ، اردو بک اسٹال، ہال بازار امرتسر، تعداد صفحات ۱۰۸، سائز ۲۰×۳۰، قیمت عہ، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

زیر نظر کتاب میں مختلف مروجہ سیاسی مصطلحات کی مختصراً تشریح کی ہے تاکہ عوام الناس ان کو سمجھ سکیں مثلاً انارکزم، نازی ازم، کمیونزم، امپیریلزم، میکاڈو ازم، گاندھی ازم، سرمایہ داری، لینن ازم، سٹالن ازم، وغیرہ عام دلچسپی کے لیے یہ کتابچہ برا نہیں ہے۔

رسالہ ہندوستان (سالنامہ):- زیر ادارت مولوی حبیب احمد صاحب ندوی، صفحات ۱۱۸، قیمت سالنامہ ۱۰ر، سائز ۲۰×۲۶/۴، ملنے کا پتہ دفتر ہندوستان ہفتہ وار بمبئی نمبر ۳۔

مولوی حبیب احمد صاحب عرصہ سے اس رسالہ کو بمبئی جیسے شہر میں کامیابی کے ساتھ نکال رہے ہیں۔ سالنامے میں کثرت سے تصویریں اور ہر قسم کے دلچسپ تفریحی مضامین اور نظمیں ہیں۔ شائقین حضرات کے لیے قابل دید ہے۔

(م۔ ع)

دولت آصفیہ کی نایاب عربی مطبوعات

مطبوعہ

دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن

۱۔ تاریخ کبیر :۔ رجال حدیث میں شیخ الاسلام امام بخاری رحمۃ اللہ کی سب سے قدیم اور مستند کتاب ہے مصنف نے اس کتاب کو روضۃ النبی علیہ الصلاۃ والسلام کے سامنے چاندنی راتوں میں مدون فرمایا ہے نادر نسخوں کے مقابلہ کے بعد چوتھی جلد کے دو حصے طبع کئے گئے ہیں۔ قیمت جلد اول (ے) روپیہ کلدار (ے) عثمانیہ۔ جلد دوم (للعہ) کلدار (للعہ) عثمانیہ۔

۲۔ کتاب الجرح والتعدیل :۔ امام حافظ ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ کی تصنیف ہے اس کتاب کو ائمہ فن نے مستند قرار دیا ہے اور اس میں رواۃ کے حالات کو قطعیت کیساتھ بیان کیا گیا ہے تیسری جلد کے دو حصے شائع ہوتے ہیں ان ہر دو جلدوں کی قیمت (ے) کلدار اور (ے) عثمانیہ ہے۔

۳۔ کتاب الافعال۔ علامہ ابن القطاع المتوفی ۵۱۵ھ کی لغت میں ایک اہم اور مبسوط تصنیف ہے جس میں کتاب الافعال ابن القوطیہ پر اضافہ کیا گیا ہے لسانیات کے موضوع پر سب سے مبسوط کتاب ہے۔ قیمت جلد اول (عہ) کلدار اور (ے) عثمانیہ جلد دوم (ے) کلدار (للعہ) عثمانیہ جلد سوم زیر طبع ہے۔

۴۔ الاشباہ والنظائر :۔ فن نحو پر علامہ سیوطی کی مبسوط ترین تصنیف ہے جو بعد مقابلہ وتصحیح اعلیٰ معیار طباعت کیساتھ دوبارہ شائع کیگئی ہے۔ قیمت جلد اول (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد دوم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد سوم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ جلد چہارم (عہ) کلدار (عہ) عثمانیہ

رسائل علامہ شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ المتوفی ۶۳۸ھ

۱۔ کتاب الفناء فی المشاہدۃ، حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ حقیقت الٰہیہ بلند تر ہے اس امر سے کہ اس کا ان آنکھوں سے مشاہدہ کیا جائے۔ البتہ کائنات پر جو نظر مشاہد کی پڑتی ہے اس کا ایک اثر مرتب ہوتا ہے

۲۔ کتاب الجلال والجمال۔ اس رسالہ میں اللہ تعالیٰ کے جلال وجمال سے بحث ہے

۳۔ کتاب الالف وھو کتاب الاحدیۃ :۔ اس رسالہ میں اللہ تعالیٰ کی احدیت اور اسکے اسرار سے بحث ہے

۴۔ کتاب الجلالۃ۔ اس رسالہ میں کلمہ جلالہ (اللہ) کے اسرار واشارات سے بحث ہے۔

ایک تا چار کی قیمت (۱۰) کلدار (۱۲) عثمانیہ

ناظم و مددگار معتمد مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس (۳/۱۲)، قیمت سو گولیاں بڑا بکس دس روپے (۱۰/-)
"اوکاسا" ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک مینشن دہلی گیٹ دہلی

ایجنسی کی کتابیں

زرّیں حکایات:- مرزا عصمت اللہ صاحب بیگ نے مثنوی مولوی معنوی سے بچوں کے فائدے کے لئے ان کہانیوں کو جو انھیں مطلب کی نظر آئیں اردو جامہ پہنا کر یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ قیمت مجلد عمر

ترجمہ سفر نامہ حکیم ناصر خسرو:- زاد المسافرین کا اردو ترجمہ۔ اس میں اسلامی ممالک کی عمارتوں کا بیان بالتفصیل ہے یعنی اس کی پیمائش اور ایک دوسرے سے فاصلہ تک دئے گئے ہیں۔ قیمت مر

افسانہ نگاری:- از جناب وقار عظیم صاحب ایم اے بی ٹی۔ اس کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری کے فن پر ہر پہلو سے بحث کی ہے اور پھر ان ہی اصولوں پر اردو کے متعدد افسانہ نگاروں کو جانچا ہے۔ قیمت عہ

ہمارے افسانے:- یہ افسانہ نگاری کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں اردو کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایسے ستائیس (۲۷) افسانے ہیں۔ قیمت عہ

مقامات مولانا روم:- اس میں مولانا روم کے دادا سے لے کر مولانا کی اولاد تک کے حالات [illegible] تک لکھے ہیں اور سلسلہ بیعت کو بھی بیان کیا گیا ہے مصنف مولانا کی خدمت میں رہ چکا ہے۔ قیمت سہ

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک معلم کی زندگی

اس کتاب کو جناب عبدالغفار صاحب مدھولی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر دلعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ ہے نیز یہ جامعہ کے اکیس سالہ تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ سائز ۲۰×۳۰ ضخامت ایک ہزار صفحات قیمت ہر دو حصے ۶ؔ

رگبی کی زندگی

طامس ہیوز کی شہرۂ آفاق کتاب "طام براؤنس اسکول ڈیز" کا ترجمہ۔ مصنف نے افسانے کے پیرائے میں اپنے مایۂ ناز استاد ڈاکٹر طامس آرنلڈ ماہر تعلیمات کے ان تمام بنیادی اصولوں کی تشریح کی ہے جن پر انھوں نے اپنے رگبی کے مدرسہ ثانوی کے نظام کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ اردو کے تعلیمی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ قیمت عمر مجلد عالہ

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی نمبر۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن محبوب المطابع برقی پریس دہلی

یہ کتاب اس تاریخ کو جو سب سے آخر میں ثبت ہے کتب خانہ سے مستعار لی گئی تھی اگر اس کتاب کو معیاد مقررہ پر واپس نہیں کیا گیا تو دو پیسے روز کے حساب سے ہرجانہ وصول کیا جائیگا۔
